حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۷۷۷۷۶۲۰، ۷۷۷۰۰۹۴

قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو اٰیۃ

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

الھُدیٰ وَالمغفِرَہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ۱

ایم اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ المسمی بہ

الہدیٰ والمغفرۃ

الاشتات	السامعون	من ضبط	ممن ای	ماذا	لم	کیف	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد	کس نے ضبط کیا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کیا مضمون تھا	کیوں ہوا	کیسے ہوا	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
وعظ کے بعد پھر حضرت مولانا راندھیری کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں بہت وعظ ہوئے مگر ضبط نہیں ہوئے۔	۵۰۰ تقریباً	احقر ظفر احمد تھانوی عفی اللہ عنہ	سب مسلمانوں کو عموماً	علم کی فضیلت اور اس کی حقیقت اور عمل کی ترغیب و ترہیب	مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا جس میں حضرت مولانا کا بیان ہونا قرار پایا تھا	کرسی پر بیٹھ کر	ختم ۲ بجے کل ۳ گھنٹہ ۴ منٹ	۱۶ جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ بروز شنبہ شروع ہوکر ۵۵ منٹ	سروٹ ضلع مظفر نگر مدرسہ [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلےٰ الہ واصحابہ

وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ؁ (یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور مغفرت کو چھوڑ کر عذاب سو دوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں۔)

یہ ایک آیت ہے سورہ بقرہ جس میں حق تعالےٰ جل شانہ وعم نوالہ نے اہل کتاب کے متعلق دو وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں کیونکہ اوپر سے اہل کتاب کا ذکر چلا آرہا ہے چنانچہ اس آیت سے پہلے یہ آیت ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کا اخفا کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں متاع قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور اللہ تعالےٰ نہ تو قیامت میں کلام کریں گے اور نہ ان کی صفائی کریں گے اور ان کو سزائے دردناک ہوگی)

اس میں اہل کتاب کی دین فروشی اور کتمان حق کا ذکر ہے اور اس پر سخت عذاب کی دھمکی ہے اس کے بعد یہ آیت ہے جو میں نے تلاوت کی اس میں ان اعمال سابقہ کا منشا بتلایا گیا ہے کہ اہل کتاب جو دین فروشی اور کتمان حق پر دلیر ہیں اس کا منشا دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ ان لوگوں نے (دنیا میں) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے (آخرت کی چیزوں میں سے) اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کیا اس کے بعد ان دونوں پر سخت وعید ارشاد فرماتے ہیں فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (دوزخ کے لئے کس قدر باہمت ہیں) یہ ایسا ہے جیسا ہمارے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ شاباش ہے اس کی ہمت کو آگ میں کودنے کیلئے کیسا باہمت ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو دوزخ میں جانے کیلئے

کیسے با ہمت ہیں خلاصہ یہ کہ آیت میں ترکِ ہدایت اور اختیار ضلالت پر اور ترک اسباب مغفرت واختیار اسباب عذاب پر وعید ہے اور میں نے اسباب کا لفظ ترجمہ میں اس لئے بڑھا دیا کہ عذاب کو بلا واسطہ کوئی اختیار نہیں کرسکتا۔ جس سے بھی پوچھا جائے ہر شخص عذاب سے نفرت وکراہت اور خوف ہی ظاہر کرے گا اور کوئی یہ نہ کہے گا کہ مجھے عذاب لینا منظور ہے مگر حق تعالیٰ نے اسباب کے لفظ کو اس لئے حذف کر دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسباب کو اختیار کرنا مسبّب کو اختیار کرنا ہے۔ دیکھئے جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ بغاوت وقتل کی سزا پھانسی ہے وہ اگر قتل و بغاوت پر اقدام کرے تو عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ کمبخت پھانسی پر لٹکنا چاہتا ہے حالانکہ وہ پھانسی پر لٹکنا ہرگز نہیں چاہتا مگر اس کے اسباب کو جان بوجھ کر اختیار کرنا عقلاء کے نزدیک پھانسی ہی کو اختیار کرنا ہے۔ ایسے ہی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب اُن لوگوں نے اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کرلیا تو یوں کہنا چاہیئے کہ گویا مغفرت کو چھوڑ کر خود عذاب ہی کو اختیار کیا ہے۔ یہ تو وجہ ہوئی جانب عذاب میں اسباب کو مقدر کرنے کی کہ عذاب کو بلا واسطہ کوئی اختیار نہیں کرسکتا۔
اور جانب مغفرت میں لفظ اسباب کے مقدر کرنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ مغفرت ہر شخص کو مطلوب ہے اس کو بھی بلا واسطہ کوئی ترک نہیں کرتا جس سے بھی پوچھو گے وہ طالب مغفرت ہی ہوگا۔ پس ترک مغفرت کے بھی یہی معنی ہیں کہ اس کے اسباب کو ترک کردیا اور ایک علت مشترکہ مقدر کرنے کی یہ بھی ہے کہ ترک و اختیار کا تعلق ان اشیاء سے ہوا کرتا ہے جو بندہ کی قدرت میں داخل ہوں اور عذاب ومغفرت انسان کی قدرت سے خارج ہیں اس لئے بلا واسطہ ہمارے ترک و اختیار کا تعلق ان کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ البتہ دونوں کے اسباب ہمارے قدرت کے تحت میں ہیں ان کے ساتھ ہمارا ترک و اختیار متعلق ہوسکتا ہے اور اسباب کے واسطے سے عذاب ومغفرت کے ساتھ بھی ان کا تعلق ہوتا ہے۔
یہ تو ترجمہ تھا آیت کا جس سے معلوم ہوگیا کہ ترک ہدایت و اختیار ضلالت

اور ترک اسباب مغفرت واختیار اسباب عذاب بڑا سنگین جرم ہے جس کے مرتکب کی بابت حق تعالےٰ یوں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جہنم میں جاتے پر بڑے ہی دلیر ہیں اور اس جرأت کو تعجب کے صیغہ سے بیان فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو یہ جہنم میں جانے کے لئے کیسے دلیر اور بے پاک ہیں اور غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہی افعال منشا رہیں تمام جرائم کا جن میں سے دین فروشی اور کتمان حق کا ذکر خصوصیت سے اوپر آ بھی چکا ہے کہ ان کا منشا یہی ترک ہدایت واختیار ضلالت وغیرہ ہوا ہے اور اس سے بطور مفہوم کے بھی معلوم ہوا کہ جس طرح ترک ہدایت وترک مغفرت صدور معاصی ودخول جہنم کا سبب ہے اسی طرح اختیار ہدایت وطلب مغفرت صدور طاعات ودخول جنت کا سبب ہے۔ پس حاصل یہ ہوا کہ جہل اور عذاب سے بے خوفی معاصی کا سبب ہے اور علم اور رغبت مغفرت طاعات کا سبب ہے اس طرح یہ آیت ترغیب وترہیب دونوں کو جامع ہو گئی اس وقت اس کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حاضرین کو معلوم ہے کہ اس وقت ہم ایک دینی مدرسہ کے جلسہ میں مدعو ہیں جس کی غرض یہ ہے کہ حاضرین کے ذہن میں علم کی ضرورت اور اس کی ضد یعنی جہل کی خرابیاں واضح کی جائیں اس لئے میں نے اسی کے مناسب مضمون اختیار کیا چنانچہ میں اس وقت علم وجہل اور عمل وبدعملی کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں صرف ضرورت علم ومذمت جہل پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ اس کے ساتھ عمل اور بدعملی سے بھی بحث کروں گا اور مضمون آیت کو اس غرض سے بہت زیادہ مناسبت ہے جو ترجمہ میں ذرا غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت اختیار کرنا اس کا حاصل یہی ہے کہ علم کو چھوڑ کر جہل کو اختیار کرنا اور چونکہ علم سے مقصود عمل ہے۔ اگر عمل نہ ہوا تو گویا علم ہی نہ ہوا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے اَلشَّئُ اِذَا خَلَا عَنْ فَائِدَتِہٖ لَغَا۔ (شئے جب فائدہ سے خالی ہو بیکار ہوتی ہے) اس طرح ہدیٰ اور ضلالت میں عمل وبدعملی بھی داخل ہے اور آیت کا جزو اول ہی مقصود کے دونوں اجزاء

پر دلالت کرنے کے لئے کافی ہوگیا اس کے بعد وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَۃِ (اور عذاب کو مغفرت کے عوض) میں تو علم اور بدعملی کے تصریح ہوگئی کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں عذاب سے اسباب عذاب اور مغفرت سے اسباب مغفرت مراد ہیں اور مغفرت وعذاب کا ترتب اعمال ہی پر ہوتا ہے جن میں علم وجہل بھی داخل ہیں گو بعضوں نے عمل کو افعال جوارح سے مخصوص کیا ہے مگر درحقیقت عمل عام ہے افعال جوارح وافعال قلب دونوں کو کیونکہ عمل کہتے ہیں صرف اختیار کو۔ اور افعال قلب میں بھی صرف اختیار ہوتا ہے تو وہ بھی اعمال میں داخل ہیں اس طرح علم وجہل بھی اسباب مغفرت و اسباب عذاب میں داخل ہوگئے اور اعمال صالحہ و اعمال سیئہ تو ان میں داخل ہیں ہی پس مغفرت کا حاصل عمل طاعت ہے کیونکہ مغفرت کا ترتب طاعات ہی پر ہوتا ہے اور عذاب کا حاصل بدعملی ہے کیونکہ اعمال بد ہی پر عذاب کا ترتب ہوتا ہے غرض آیت کے دونوں اجزاء الگ الگ بھی مقصود کے دونوں اجزاء کو مشتمل ہیں اور مجموعۃً بھی کیونکہ میں اوپر بتلا چکا ہوں کہ ہدیٰ میں علم وعمل دونوں داخل ہیں اس لئے کہ علم سے عمل ہی مقصود ہوتا ہے۔ پھر اس کے مقابل ضلالت میں بھی جہل و بدعملی دونوں مراد ہوں گے اور یہ بھی میں نے بتلا دیا کہ مغفرت سے بواسطہ تقدیر اسباب کے عمل طاعت مراد ہے اور علم بھی عمل میں داخل ہے تو عذاب میں بھی جہل اور بدعملی دونوں داخل ہوں گے۔ اور یہ بات ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتی ہے اور یہی مقصود دقت تھا اس لئے اس آیت کو اختیار کیا گیا رہا یہ کہ ہدیٰ سے مراد علم کیسے ہوا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت کے معنی ہیں راہ نمودن اور یہ علم پر موقوف ہے۔ کیونکہ بدون جانے راستہ بتلانا مشکل ہے یہ تو اصلی معنی ہیں اور یہاں چونکہ ہدیٰ کا مقابلہ اضلال سے نہیں بلکہ ضلالت سے ہے اور ضلالت کے معنی گمراہ ہونے کے ہیں اس تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہدیٰ کے معنے راہ جاننے کے ہیں پس ہدیٰ کا حاصل علم اور ضلالت کا حاصل جہل صاف معلوم ہوا صاحب ہدیٰ وہی ہے جو راستہ جانتا ہو اور راستہ پر چلتا ہو۔ اور گمراہ

ے راستہ بتلانا۔

وہی ہے جو راستہ نہ جانتا ہو یا جان کر اس پر چلتا نہ ہو۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ ہماری حالت کس میں داخل ہے کیونکہ قرآن مجید ہمارے لئے اصلاح کی ایک کتاب ہے ہمیں اس کے مضامین سے اپنی حالت کی اصلاح کرنی چاہیئے یہ تو اجمالاً معلوم ہو گیا کہ قرآن شریف عموماً بھی اور بلواسطہ اس آیت کے خصوصاً یہی علم و عمل کی تعلیم دے رہا ہے اور بدعملی وجہل پر وعید بتلا رہا ہے تو اب ہم کو اپنی حالت میں غور کرنا چاہیئے مریض کو چاہیئے کہ اول طبیب کی تقریر میں غور کرے پھر اپنی حالت میں غور کر کے اس کو اپنے حال پر منطبق کرے کہ میرے اندر یہ امراض ہیں یا نہیں اگر امراض موجود ہیں تو ان کے خطرات پر مطلع ہو کر جلد اصلاح کی کوشش کرے ایسے مسلمان تو کم ہیں جن کو مضامین قرآن کی صحت میں شک ہو یہ تو سب کو مسلّم ہے کہ قرآن کے مضامین سب صحیح ہیں مگر غفلت اس سے ہے کہ اپنی حالت میں غور نہیں کرتے اور مضامین قرآن کو اپنے اوپر منطبق نہیں کرتے اہل علم تو بھلا اہل علم ہیں وہ تو اپنے علم پر قناعت کئے ہوئے ہیں ہی گو ان کو بھی اپنی خاص خاص حالت کے اعتبار سے غور و تامل کی ضرورت ہے مگر عموماً غیر اہل علم بھی تو اپنی حالت موجودہ پر قناعت کئے ہوئے ہیں کسی کو اصلاح کی فکر نہیں حیرت ہے کہ اگر کسی مکان میں ذرا سا نقص رہ جائے مثلاً دالان اور سہ دری تیار ہو مگر اسباب رکھنے کے لئے کوٹھری نہ ہو تو اس کو فکر ہوتی ہے کہ اگلے سال ایک کمرہ بنائیں گے اگر زیادہ وسعت بھی نہ ہوئی تو ایک دو کڑیاں تو ضرور بنا ہی دیں گے۔ مگر قصر دین کی تکمیل کا کسی کو بھی خیال نہیں ہے۔ جس تنگ کوٹھری میں ہم بسے ہوئے ہیں اسی پر قناعت ہے اس سے زیادہ ترقی کی ہوس ہی نہیں۔

پھر افسوس یہ ہے کہ خود اس کی درستی کی بھی فکر نہیں۔ اگر وہ کوٹھری کہیں سے گری ہوئی ہے یا اس کی چھت میں دو تین کڑیاں ٹوٹی ہوئی ہیں تو اس کی کچھ پروا نہیں صاحب اگر زیادہ بھی نہ ہو تو کم از کم بقدر ضرورت تو دین کی عمارت درست کر لینی چاہیئے تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک نقص فرائض و واجبات کا ہے اور ایک نقص سنن و مستحبات کا ہے اگر سنن و مستحبات کی تکمیل نہ ہو سکے تو کم از کم فرائض و

واجبات کے نقص کو تو رفع کرلیا جائے گو مسلمان ہونے کا تو مقتضیٰ یہ تھا کہ سنن و مستحبات کی بھی تکمیل کی جاتی کیونکہ مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ دین دنیا سے مقدم ہے تو جب ہم کو قصر دنیا کا نقص گوارا نہیں تو قصر دین کا نقص کیونکر گوارا ہے۔ لیکن افسوس تو اس کا ہے کہ ہم کو فرائض و واجبات کی تکمیل کا بھی اہتمام نہیں شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم معتدلہ میں ہر حالت کے اعتبار سے حکم موجود ہے ؎

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد (ہر مرتبہ وجود سے ایک حکم رکھتا ہے)

شریعت نے عقائد و عبادات کے علاوہ معاملات و معاشرات وغیرہ میں اعتدال کی رعایت کی ہے اور اسی لئے اس امت کا لقب امت عادلہ ہے۔ لیکن ہمارے تمام کام اعتدال سے گذرے ہوئے ہیں۔ کوئی کام بھی افراط و تفریط سے خالی نہیں اگر ہم اپنی حالت میں غور کریں تو معلوم ہو کہ ہماری عبادات بھی ناقص ہیں اور معاملات بھی اور معاشرت تو بالکل ہی گندی ہے۔ پھر وہ نقص سنن میں بھی ہے اور مستحبات میں بھی۔ واجبات میں بھی ہے اور فرائض میں بھی۔ اور اگر کسی کے فرائض و واجبات میں ظاہری نقص نہیں تو باطنی نقص تو ضرور موجود ہے۔ کیونکہ نقصان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جلی، ایک دقیق۔ اگر کوئی نقص جلی سے محفوظ ہے تو نقص خفی سے وہ بھی بچا ہوا نہیں۔ غرض ہمارا وہ حال ہے ؎

تن ہمہ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔ (ہمارا جسم داغوں سے بھرا ہوا ہے پھویہ کہاں کہاں رکھیں)

سر سے پیر تک ہمارا دین زخمی ہے مگر کسی کو بھی علاج کی فکر نہیں۔ بعض لوگوں کو اس سے دھوکہ ہو گیا ہے کہ وہ کاملین کو بھی اپنے نقص کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس سے وہ یوں سمجھ گئے کہ جب ایسے ایسے بزرگ بھی ناقص ہیں تو ہم ہی سے کیا تکمیل ہوگی۔ بس وہ بھی ناقص ہیں۔ اور ہم بھی ناقص۔ تو سب برابر ہیں۔ پھر تکمیل کس سے کرائیں۔ صاحبو! اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ایک شخص کے تو ہاتھ پیر موجود ہوں مگر ان میں درد ہو رہا ہو اور ایک شخص کے ہاتھ پیر ہی نہ ہوں تو یہ دونوں برابر ہو جائیں گے۔ کیا

اس کو کوئی عاقل تسلیم کرے گا ہرگز نہیں۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے بس یہی فرق ہے آپ کے نقص میں اور کاملین کے نقص میں اُن کے تو سب اعضاء صحیح سالم ہیں۔ مگر کسی عضو میں درد ہو رہا ہے اس لئے وہ اپنے کو ناقص کہتے ہیں اور آپ کے دین کے تو اعضاء بھی تدارد ہیں تو کیا اس حالت میں آپ کو ان کی احتیاج نہیں۔ کیا اپاہج آدمی کو اس شخص کی احتیاج نہیں ہوتی جس کے ہاتھ پیر سالم ہیں چلتا پھرتا ہے گو کسی جگہ اس کے درد بھی ہو مجھے سخت تعجب ہوا ایک شخص کی حالت پر جس نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خط میں دیکھا تھا کہ مولانا قسم کھا کر لکھتے ہیں کہ واللہ میں کچھ نہیں تو اس سے وہ کہنے لگا کہ ہم مولانا کو سچا سمجھتے ہیں اور وہ لکھتے ہیں کہ میں کچھ نہیں تو ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں اور حیرت یہ کہ مولانا کے ایک معتقد بھی شبہ میں پڑے ہوئے تھے کہ حضرت نے یہ جھوٹی قسم کیوں کھائی اس میں کیا تاویل کی جائے۔ میں نے کہا بندۂ خدا ترقی تو انبیاء علیہ السلام کو بھی ہوتی رہتی ہے اور وہ بھی ترقی کے محتاج ہیں چنانچہ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم فرماتے ہیں وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ٥ (اور کہئے میرے پروردگار زیادہ دیجئے مجھ کو علم) اسی طرح اولیاء کو بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ اور وہ انبیاء سے زیادہ ترقی کے محتاج ہیں۔ پس مولانا کی یہ قسم کمالات حقیقیہ انتہائیہ کے اعتبار سے ہے کیونکہ مولانا کی نظر طلب ترقی کی وجہ سے کمالات مستقبلہ پر ہے۔ ان پر نظر کر کے مولانا فرماتے ہیں کہ واللہ میں کچھ نہیں اور ہمارا اعتقاد مولانا کے ساتھ کمالات موجودہ کے اعتبار سے ہے اُن پر نظر کر کے مولانا سب کچھ ہیں اور عارفین کی نظر کبھی اپنے کمالات موجودہ پر نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ ہر دم اس سے آگے پر نظر رہتی ہے۔ اس لئے وہ قسم کھا کر کہہ دیتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں ہیں۔ پس ان کی قسم بھی سچی اور ہمارا اعتقاد بھی سچا دونوں میں تعارض کچھ نہیں کیونکہ تناقض کے لئے وحدت موضوع بھی شرط ہے اور یہاں موضوع مختلف ہے ۱۲)

بلکہ اگر ان کو تمام کمالات ممکنۃ الحصول حالیہ و استقبالیہ بھی حاصل ہو جائیں جس سے ترقی بھی ممکن نہ ہو تب بھی چونکہ اُن کی نظر کمالات حق پر ہوتی ہے ان کے

اعتبار سے پھر بھی وہ قسم کھا کر یہی کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں[۱]۔

اس تقریر سے ان کا شبہ جاتا رہا اور بہت خوش ہوئے معتقد کا شبہ تو ذرا سے اشارے میں رفع ہوجاتا ہے۔ مگر افسوس اُس مخالف کی بدحالی پر ہے جو سمجھانے سے بھی نہ سمجھا اور یہی کہتا رہا کہ آپ کی معتقدانہ تاویلات ہیں ہم تو مولانا کو سچا سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات اس نے بھولے پن سے کہی ہوتی تو زیادہ افسوس نہ ہوتا جیسے ریاست رامپور میں جو پٹھانوں کی بستی ہے۔ ایک بزرگ تشریف لے گئے لوگوں میں اُن کی بزرگی کی شہرت ہوئی تو ایک خاں صاحب ملنے آئے اور کہنے لگے کہ میں نے حضور کی

[۱] اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً ایک تحصیلدار یا کلکٹر یا کمشنر اپنے اجلاس میں مسند حکومت پر بیٹھا ہوا ہو کہ دفعۃً وائسرائے وہاں پہنچ جائے انصاف سے دل میں خود کرلیا جائے کہ اس وقت تحصیلدار اور کلکٹر و کمشنر کی کیا حالت ہوگی۔ اس وقت وہ مسند پر ہرگز نہ بیٹھ سکے گا اور نہ حکومت کر سکے گا۔ اور اگر اس وقت کوئی شخص ان کے پاس اپنی حاجت لائے اور وائسرائے کے سامنے ان کی تعظیم و تکریم و مدح و ثنا کرنے لگے کہ حضور ایسے ہیں اور سرکار ویسے ہیں تو یقیناً یہ پانی پانی ہوجائیں گے اور قسم کھا کر کہیں گے کہ واللہ ہم کچھ نہیں ہیں اس تعظیم و تکریم وغیرہ کے مستحق حضور وائسرائے بہادر ہیں۔ وہی سب کچھ کر سکتے ہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے تو کیا کوئی عاقل اس قسم کی قسم کو جھوٹی کہہ سکتا ہے یا اس بات کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ کلکٹر و کمشنر واقع میں کچھ نہیں ہیں اور ان کو کوئی عہدہ یا اختیار حاصل نہیں ہے کوئی عاقل اس کا یہ مطلب نہیں سمجھ سکتا بلکہ سب یہی کہیں گے کہ کلکٹر و کمشنر بجائے خود بڑا عہدہ اور اختیار رکھتے ہیں مگر وائسرائے کے منصب حکومت و عظمت و جلال کے سامنے اپنے کمالات کو لاشی بتلا رہے ہیں یہی حال کاملین کا ہے کہ وہ بجائے خود صدہا کمالات سے متصف ہوتے ہیں مگر ان کی نظر ہر وقت کمالات حق پر رہتی ہے اور جب ایک ادنیٰ بادشاہ یا وائسرائے کو دیکھ کر حاکم ضلع اپنے کو لاشی محض سمجھنے لگتا ہے تو عارف کمالات حق پر نظر کر کے کیونکر اپنے کمالات کو لاشئ محض نہ سمجھے اللہ جس کی نظر حق تعالیٰ پر ہوگی وہ کبھی اپنے اوپر نظر نہیں کر سکتا وہ تو ایک قسم کیا ہزار قسمیں کھا کر یہی کہے گا کہ میں کچھ نہیں لاشی محض ہوں مجھ میں کچھ کمال نہیں سراپا عیب ہوں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واقع میں بھی کچھ نہ ہو اور زید و عمر و بکر کے اعتبار سے بھی لاشئے محض ہو خوب سمجھ لو۔ ۱۲ جامع۔

بہت تعریف سنی تھی اس لئے زیارت کا اشتیاق ہوا۔ بزرگ نے فرمایا کہ یہ لوگوں کا حسنِ ظن ہے میں تو کچھ بھی نہیں ایک نالائق بندہ ہوں تو وہ خانصاحب کہنے لگے کہ جب آپ نالائق ہیں تو میں جاتا ہوں، میں خوامخواہ زیارت کو آیا نالائقوں کی زیارت سے کیا فائدہ؟ یہ کہہ کر چلتے ہوئے۔

راستہ میں ایک دوست ملے ان سے پوچھا کہاں جاتے ہو، کہا فلاں بزرگ صاحب تشریف لائے ہیں اُن کی زیارت کو جاتا ہوں اُنھوں نے کہا کہ وہ تو نالائق آدمی ہیں ان سے مل کر کیا لو گے؟ دوست نے کہا توبہ کرو توبہ! وہ تو بڑے بزرگ ہیں، کہا میاں وہ تو اپنی زبان سے خود اپنے کو نالائق کہتے ہیں۔ دوست نے کہا کہ بزرگ اپنے کو یوں ہی کہا کرتے ہیں۔ کہا اچھا یہ بات ہے تو چلو ہم بھی چلیں گے وہ خانصاحب پھر آئے اور کہا حضور مجھ سے غلطی ہوئی میری خطا معاف کیجئے، مجھے معلوم نہ تھا کہ بزرگ جھوٹ بھی بولا کرتے ہیں۔ خوامخواہ اپنے کو نالائق کہہ دیتے ہیں اور واقع میں نالائق نہیں ہوتے میں نے تو یہ سُنا تھا کہ بزرگ سچ بولا کرتے ہیں تو جب آپ نے یہ کہا کہ میں تو نالائق بندہ ہوں میں نے اس کو بھی سچ سمجھا اس لئے اُٹھ کر چلا گیا۔ اس پر دوسرے صاحب نے بزرگ سے کہا کہ حضرت یہ بھولے سیدھے پٹھانوں کی بستی ہے۔ یہاں ایسی باتیں نہ کہئے یہ تواضع اور فنا کو کچھ نہیں جانتے۔ تو اس پٹھان نے تو بھولے پن سے یہ بات کہی تھی اس لئے اس پر افسوس نہیں مگر اس مخالف نے تو جان بوجھ کر حقیقت سمجھ کر محض عناد سے وہ بات کہی تھی اس کی حالت زیادہ افسوس ناک ہے۔ غرض بزرگوں کے ایسے کلمات سے دھوکا نہ کھانا چاہئے اگر وہ اپنے کو ناقص کہیں تو تم ان کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے ز ابدالِ حق آگاہ شد

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

(تمام جہان اس سبب سے گمراہ ہوا کہ کوئی شخص ابدالِ حق سے آگاہ نہیں ہوا اور کہا ہم بھی بشر ہیں یہ بھی بشر ہیں ہم اور یہ خواب وخورد ونوش میں مقید ہیں)

این ندانستند ایشاں از عمیٰ
درمیاں فرقے بود بے منتہا

(انھوں نے اندھاپن سے یہ جانا کہ ہمارے اوران کے درمیان بے انتہا فرق ہے)
ان کا نقصان ہمارے کمال سے بھی افضل ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(بزرگوں کے افعال اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ دونوں کے فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیرؔ اور شیر یکساں ہیں)

اور فرماتے ہیں ؎

گر خطا گوید ورا خاطی مگو
در شود پر خوں شہید آں را مشو

خون شہیداں را ز آب اولیٰ ترست
ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

(اگر خطا کہے اس کو خطا کرنے والا مت کہو اگر شہید خون میں لتھڑا ہوا ہو اس کو غسل مت دو شہید کا خون پانی سے بہتر ہے یہ خطا سو صواب سے بہتر ہے)

ان سے اگر واقع میں بھی خطا ہو تب بھی وہ ہمارے صواب سے بہتر ہے کیونکہ ان میں ایسی استعداد موجود ہے جس سے ان کی خطا بھی نورانی ہوتی ہے اور ہمارے اندر ایسی ظلمت ہے جس سے ہمارا صواب بھی ظلمانی ہوتا ہے ان کی استعداد کی یہ حالت ہے۔ یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط (اس کا تیل اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا نور علی نور ہے) ان کے زیت میں اگر آگ لگے گی تو نورٌ علیٰ نور ہوگا جس کی شان ہوگی۔ وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ (اور ہم نے اس کو ایسا نور دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے) اور ہمارا زیت ایسا چکنا ہوا ہے جس میں اول تو آگ لگنے کی امید ہی نہیں اور اگر لگے گی بھی تو محض ایک ضعیف نور ہوگا جو ظلمت کے ساتھ آمیختہ ہوگا۔ پس بزرگوں کو اپنے نقص کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھ کر ناقص سمجھنا اور اپنے برابر خیال کرنا سخت غلطی ہے۔ صاحبو! وزارت بھی بادشاہت کے اعتبار سے کم درجہ پر ہے مگر کانسٹبلی سے تو افضل ہے

مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود   لیک بس عالی ست پیش خاک تود

(اس کا تیل اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا نور علیٰ نور ہے)

بزرگوں کا نقص ایسا ہے جیسے آسمان عرش کے سامنے کم ہے مگر یقیناً آسمان زمین وغیرہ سے تو بڑا ہی ہے۔ ہمارے کمالات کمالات ارضیہ ہیں اور ان کے کمالات سماویہ ہیں جو کمالات الٰہیہ عالیہ متعالیہ سے ضرور کم ہیں مگر ہمارے کمالات سے بدرجہا افضل واکمل ہیں۔ اس لئے ہم کو ان سے استغنا نہیں ہوسکتا کیونکہ جس کو زمین سے عرش پر جانا مقصود ہو اسے آسمان کو ضرور طے کرنا پڑے گا۔ صاحب اہل اللہ اپنے کو ناقص کیوں نہ کہیں وہ تو خدا کے راستہ کو طے کر رہے ہیں جس کی حالت یہ ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہر چہ بروئے مے رسی بروئے مایست

(بھائی بے نہایت دربار ہے جس مقام پر پہونچی اس مقام پر نہ ٹھہرو باطنی حالت میں ترقی کرو۔)

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ علوم دنیا میں بھی جو لوگ صاحب کمال ہیں وہ بھی اپنے کو ناقص ہی کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک محدود کمال ہے جو ممکن الحصول ہے۔ مگر اس کا بھی حقیقی درجہ بہت عالی ہے۔ اس پر نظر کر کے ہر کامل اپنے کو ناقص ہی کہتا ہے۔ دیکھئے حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم محمود خاں اپنے فن میں کیسے کامل تھے کہ واقعی ان کو طب کا امام کہنا چاہیئے مگر کوئی ان سے پوچھتا تو وہ یہی کہتے کہ ہم کو کیا کمال حاصل ہے کچھ بھی نہیں۔ تو کیا ان کے اس کہنے سے آپ یہ سمجھ لیں گے کہ وہ بھی ایسے ہی ناقص ہیں جیسے ہم ناقص ہیں اور دونوں برابر ہوگئے اور کیا یہ سمجھ کر آپ ان سے علاج کرانا چھوڑ دیں گے ہرگز نہیں بلکہ آپ ان کی اس بات کا یہی مطلب سمجھیں گے یہ اپنے کو طب کے حقیقی کمال پر نظر کر کے جو انکے نزدیک جالینوس وبقراط وغیرہ کو حاصل تھا گو یہ لوگ بھی اپنے کو حقیقی کمال سے قاصر ہی

سمجھتے تھے (۱) ناقص کہہ رہے ہیں مگر اس زمانہ میں تو یہ اس فن کے امام اور سب سے زیادہ ہی کامل ہیں۔ افسوس دنیا کے کاموں میں تو لوگوں کو بہت جلدی عقل آجاتی ہے۔ اور کاملین دنیا اپنے کو ناقص کہیں تو اس سے کسی کو دھوکہ نہیں ہوتا نہ ان سے کوئی اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے مگر دین کے باب میں نہ معلوم لوگوں کی عقل کہاں جاتی رہتی ہے اور یہاں ان کو یہ دھوکہ کیوں پیش آتا ہے۔ یاد رکھو جو صاحب کمال ہوگا وہ کبھی اپنے کو صاحب کمال نہ کہے گا ہمیشہ اپنے کو ناقص ہی کہیگا کیونکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں وہ اُس اپنے علم کی وسعت ولاتناہی اور گہرائی سے آگاہ ہے اس پر نظر کر کے وہ اپنے کمال کو کبھی کمال نہیں کہہ سکتا اور جن کو آپ مدعی کمال دیکھتے ہیں ان کو کمال کی ہوا بھی نہیں لگی دعویٰ کمال اکثر ناقصین ہی کیا کرتے ہیں' اہل اللہ کبھی دعویٰ نہیں کر سکتے نہ اپنے کو صاحب کمال کہہ سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کبھی تحدث بالنعمۃ کے طور پر خدا کی نعمتوں کا بیان کر دیں مگر اس وقت بھی ان میں دعویٰ کی شان ہرگز نہیں ہوتی بلکہ عبدیت اور عجز و فنا کی شان غالب ہوتی ہے۔ چونکہ بعض لوگوں کو کاملین کے اعتراف نقص سے دھوکا ہو جاتا ہے اس لئے میں نے تفصیل کے ساتھ اس شبہ کو دفع کر دیا کیونکہ اس چودھویں صدی کے بہت لوگ ذہین ہونے لگے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ جیسے چودھویں رات کا چاند کامل ہوتا ہے۔ ایسے ہی چودھویں صدی کے لوگ بھی کامل ہیں، واقعی کامل تو ہیں مگر اس میں کلام ہے کہ کامل کاہے میں ہیں دنیا کی ذہانت میں تو واقعی کامل ہیں مگر دین کی ذہانت میں کامل نہیں ہیں۔ آج کل کے آدمیوں کی عقل دنیا کے کاموں میں خوب چلتی ہے مگر دین میں کچھ نہیں چلتی (بس یوں کہنا چاہیئے کہ آجکل مادیت کی ترقی اور روحانیت کا تنزل ہے (۲ جامع) یہی وجہ ہے کہ اس وقت عام طور پر دین سے غفلت ہے اور تکمیل دین کا کسی کو اہتمام نہیں اسی لئے مسائل دین پر بھی توجہ نہیں۔ کیونکہ مسائل دین کی ضرورت تو اس کو ہو جسے اپنا دین کامل کرنا ہو جیسے مسائل طب کی ضرورت اس کو ہے جسے تکمیل صحت مطلوب ہو مگر آجکل صحت جسم تو لوگوں کو مطلوب ہے صحت قلب مقصود نہیں تو پھر ان کو مسائل دین پر توجہ کیوں ہو۔

دیہاتیوں کو تو کیا کہا جائے وہ تو اپنے ہل یا تھوں میں ایسے مشغول ہیں کہ مسائل دین کے جاننے کی بھی ان کو فرصت نہیں عمل تو کیا ہی کرتے مگر جو لوگ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں جو تقریریں کرتے اور لکچر دیتے پھرتے ہیں۔ جن کو کتب بینی اور سیاست دانی بلکہ ہمہ دانی کا بھی دعویٰ ہے مسائل دین سے وہ بھی بالکل ناواقف ہیں۔ چنانچہ ایک جنٹلمین میرے ساتھ تھے وہ تھانہ بھون میں جو ان کا اصلی وطن تھا فرض رباعی کی جماعت میں دو رکعت کے بعد بیٹھ گئے امام نے تو تیسری رکعت کا قیام کیا اور انھوں نے نماز ختم کر دی لوگوں نے بعد میں اس حرکت کی وجہ پوچھی تو کہا میں مسافر ہوں اس لئے میں نے قصر کیا ہے۔ سبحان اللہ اول تو وطن اصلی میں پہنچکر سفر کیسا پھر وہ بھی امام مقیم کے پیچھے۔ اسی طرح ایک صاحب ہمیشہ حضر میں قصر کیا کرتے تھے اور وجہ یہ بتلاتے کہ حدیث میں ہے كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ (دنیا میں مسافر یا رہگذر کی طرح رہ) اور ہم اس کے موافق عمل کرتے ہیں تو ہم ہر وقت مسافر ہی رہتے ہیں۔ گو وطن کے اندر ہی کیوں نہ ہوں ایسے لوگ اپنے کو اہل حدیث کہتے ہیں اور ان کو استدلالات سوجھا کرتے ہیں۔ مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی ایسوں کے نسبت فرماتے تھے کہ یہ لوگ اہل حدیث تو ہیں مگر حدیث سے مراد حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ حدیث النفس ہے یہ لوگ حدیث النفس کا اتباع کرتے ہیں واقعی اکثر تو ایسے ہی ہیں۔ میں سب کو نہیں کہتا بھلا ان حضرت سے کوئی یہ پوچھے کہ تم نے اس حدیث پر عمل کر کے نماز میں تو قصر کیا۔ دنیا کے کاموں میں بھی تو قصر کیا ہوتا مسافر کے ساتھ سفر میں نہ پلنگ ہوتا ہے نہ تخت نہ میز ہے نہ کرسی نہ کپڑوں کے دس بیس جوڑے ہوتے ہیں نہ زمین جائداد ساتھ ہوتی ہے نہ مکان ذاتی ہوتا ہے تو تم نے ان چیزوں میں بھی تو قصر کیا ہوتا مگر ان میں کوئی اختصار نہیں کیا جاتا پس تمہارا یہ دعوےٰ غلط ہے کہ ہم حدیث كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ (دنیا میں مسافر یا رہ گذر کی طرح رہو) پر عمل کرتے ہیں اور اگر کوئی دنیا کے کاموں میں بھی اختصار کر دے تب بھی اسے اس حدیث سے قصر صلوٰۃ فی الحضر (حضر میں قصر) پر استدلال

کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ کُنْ فِی الدُّنْیَا (دنیا میں رہ) کی قید صراحۃً موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے کاموں میں مسافر کی طرح رہنے کا امر فرما رہے ہیں نہ کہ دین کے کاموں میں، دوسرے آپ نے یہ تو نہیں فرمایا کُنْ فِی الدُّنْیَا مُسَافِرًا (دنیا میں مسافر رہ) بلکہ کَاَنَّکَ مُسَافِرٌ (گویا تو مسافر ہے) فرمایا ہے اور قصر کی اجازت مسافر حقیقی کو ہے نہ کہ مماثل مسافر کو خوب سمجھ لو (جامع)

ایک صاحب کی حکایت سنی ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے جنگل میں جاتے کھیت پر جاتے تو قصر کیا کرتے اور کہتے کہ قرآن میں اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ (اور جب تم زمین میں سفر کرو سو تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا کہ تم نماز کو کم کردو) مطلق آیا ہے اس میں مطلقاً زمین میں چلنے پر قصر کی اجازت دی گئی ہے تین دن یا چار دن کی مسافت کا کچھ ذکر نہیں۔ یہ بھی کوئی اہل حدیث ہی میں سے تھے۔ مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری نے فرمایا تھا کہ پھر جنگل اور کھیت ہی میں جاکر قصر کیوں کرتے ہو بلکہ گھر سے محلہ کی مسجد میں آکر قصر کیا کرو کیونکہ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ (اور جب تم زمین میں سفر کرو) تو اس پر صادق ہے۔ یہ فہم اور دین رہ گیا ہے۔ کچھ نہیں بس یہ لوگ ضُرِبْتُمْ (تم کو پیٹا جائے) بصیغہ مجہول کے مستحق ہیں۔ بڑا غضب یہ کہ اس فہم پر یہ لوگ اپنے کو تعلیمیافتہ سمجھتے ہیں پس جس نے ایک دو کتابیں ادب تاریخ کی دیکھ لیں وہ بھی اپنے کو عالم سمجھتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جنٹلمینوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم میں شمار کرلیا ہے اور جتنے فضائل احادیث میں علم کے لئے وارد ہیں انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ (ترجمہ، علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں ہو ۱۲) وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چین سے بھی طلب علم کی ترغیب دی ہے حالانکہ اُس وقت چین میں دین کا علم بالکل نہ تھا بلکہ محض دنیوی علم تھا معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا پس انگریزی بھی علم ہے

اور اس حدیث کے تحت میں داخل ہے ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیے۔ ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں قُلْتُ ذَکَرَہٗ فِی الْمَقَاصِدِ طَرِیْقَیْنِ وَقَالَ ابْنُ حِبَّانٍ اِنَّہٗ بَاطِلٌ لَا اَصْلَ لَہٗ وَاَخْرَجَہٗ ابْنُ الْجَوْزِیِّ فِی الْمَوْضُوْعَاتِ ۱ھ ص ۳۰ = قَالَ وَاَخْرَجَہُ الْبَیْہَقِیُّ فِی الشُّعَبِ قُلْتُ وَقَدِ الْتَزَمَ اَنْ لَا یُخْرِجَ مَوْضُوْعًا فَالْاَشْبَہُ الْحُکْمُ عَلَیْہِ بِالضُّعْفِ وَالضَّعِیْفُ لَا یُحْتَجُّ بِہٖ فِی الْاَحْکَامِ ۱۲ جامع (مقاصد میں دو طریق سے اس کو بیان کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث دو وجہ سے ضعیف ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ باطل بے اصل ہے۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ یہ ضعیف احکام اس کو حجت میں پیش نہیں کیا جا سکتا)

اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی ان لوگوں کا مدعا حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انھوں نے لفظ ولو پر نظر نہیں کی۔ یہ لفظ فرض کے لئے آتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنا چاہیئے اور فرض اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم یا مستبعد ہو موجود کو فرض نہیں کیا جاتا اور دنیوی علم کا چین میں اس وقت موجود ہونا آپ کو مسلم ہے تو اس کو لفظ ولو سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس حدیث میں وہی علم ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا اس لئے بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور وہ علم دین ہی ہے ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو جائیں تو پھر ایک بھنگی اور چمار کو بھی عالم کہنا چاہیئے کیونکہ اس کو بھی دنیا کا ایک علم حاصل ہے۔ جو کام وہ کرتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کر لیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کر لیں گے اور خیر جانے دیجئے ہم لفظ ولو سے بھی استدلال نہیں کرتے مگر ہم کہتے ہیں کہ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں ہو) میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کونسا علم مراد ہے اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جاوے۔ بس علم شرعی وہ ہے جس کو شریعت علم کہتی ہے

جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی بھی ہیں وہ فرماتے ہیں۔

علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است

(جو علم حق کا راستہ نہ دکھائے وہ جہل ہے۔)

اور حدیث میں ہے اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَمَا فِیْھَا مَلْعُوْنٌ اِلَّا ذِکْرُ اللہِ وَمَا وَالَاہُ حدیث (دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ملعون بجز ذکر اللہ کے اور وہ چیز جو ذکر کو قریب کرے) معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے وہ دنیائے ملعونہ ہے اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں۔ اب میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے خدا کی طرف قرب ہوتا ہے؟ وصل ہوتا ہے یا فصل قرب ہوتا ہے یا بعد۔ مشاہدہ ہے کہ ان سے بُعد ہی بڑھتا ہے گو چاہیئے تو یہ تھا کہ سائنس سے اور خدا کی طرف قرب بڑھتا۔ کیونکہ اس سے قدرت صانع کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں اس لئے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوتے زمانہ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں جو اکثر پورے ہو جاتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں اور ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی مگر یہ لوگ باوجود مشاہدۂ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر کہتے ہیں وجہ یہ کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہو گئی اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کر لی۔ ڈلے پتھر ایجاد کر لی۔ اگر ایجاد تمہارے اختیار میں تھی تو پہلے ہی دن کیوں نہ ایجاد کر لی۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو، باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریق آ جانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے مگر عادت الٰہیہ یہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور و فکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتے ہیں اور بعض دفعہ اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لئے ہزار غور و فکر کے

بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے چنانچہ اب تک کسی کو یہ بات نہیں معلوم ہوئی کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور ایسی نظائر بکثرت موجود ہیں اگر غور و فکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کا انکشاف کیوں کر لیا غرض تجربہ سے یہ بات مشاہد ہے کہ کچھ عوارض کہ بمنزلہ لوازم کے ہیں ایسے جمع ہو رہے ہیں کہ سائنس اور جغرافیہ سے قرب خداوندی نہیں بڑھتا بلکہ بُعد ہی ہوتا ہے تو یہ علم شرعی میں داخل نہیں ہوسکتے اور نہ ان کے جاننے سے دین کا علم حاصل ہوسکتا ہے ہاں ایسے لوگوں کو ایسے علم دین ضرور حاصل ہوجاتا ہے جیسے ایک لیڈر کا قصہ ہے جو آج کل مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں کہ کسی جگہ نماز کا وقت آگیا اور پانی نہ تھا تیمم کی ضرورت ہوئی تو لیڈر صاحب نے اس طرح تیمم کیا کہ اول تو مٹی کو ہاتھوں پر بہایا جیسے پانی کو بہایا کرتے ہیں، پھر کلی کرنے کے واسطے منہ میں مٹی دی شاید اس کے بعد وہ دو ہتڑ بھر کر منہ پر بھی ڈالتے اور مسح کے لئے سر پر بھی ڈالتے اور پیروں پر بھی مٹی بہاتے مگر منہ میں مٹی دیتے ہوئے بعض لوگ ہنس پڑے اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے بس انگریزی پڑھ کر ایسا علم آتا ہے کہ عقل خاک میں مل جاتی ہے بھلا اگر وہ کسی سے پوچھ ہی لیتے کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے تو اس میں کچھ ہرج تھا مگر پوچھتے کس طرح لیڈر ہو کر اپنی جہل کو کیوں کر ظاہر کریں گو مٹی سے کلی کر کے اُس سے زیادہ جہل ظاہر کر دیا اور مزا یہ کہ ظہور جہل کے بعد بھی وہ قوم کے لیڈر رہی رہے یہ حالت قوم کی ہے کہ اس جہل پر بھی ان کو مقتدا ہی بنائے رکھا ان ہی حضرت کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک دفعہ موٹر میں سوار تھے نماز کا وقت آگیا موٹر ٹھہرایا گیا اور اسی میں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لی حالانکہ سامنے سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے تھے مگر انھوں نے موٹر کے اندر ہی بیٹھ کر پڑھی۔ بھلا موٹر میں ترک قیام کس طرح جائز ہوگیا۔ جب کہ موٹر کھڑا ہوا تھا۔ چلتی ریل میں تو اگر گرنے کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر نماز کی گنجائش بھی ہے مگر موٹر میں تو چلتے ہوئے بھی ترک قیام کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کا ٹھہرالینا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے اور ریل کا ٹھہرانا ہمارے اختیار میں نہیں اور اگر موٹر کھڑا ہوا ہو تب تو کسی طرح

ترک قیام کی گنجائش ہی نہیں مگر ان لوگوں نے تو محض لیڈر بننے کے لئے نماز شروع کی ہے اس لئے نماز بھی لیڈری ہوتی ہے۔ شرعی نماز کی ان کو کیا ضرورت ہے۔ گو ایسی غلطیاں دیہاتیوں سے بھی ہوتی ہیں اوران کو بھی مسائل کا علم نہیں مگر وہ اپنے کو تعلیمیافتہ تو نہیں کہتے نہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ بیچارے اپنے جہل کا اقرار کرتے ہیں تو گو ان سے بھی علم دین سے غفلت کرنے پر کچھ مواخذہ ہو مگر شاید ان کے عجز و نیاز کی وجہ سے ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ ہو جائے چاہے تھوڑی سی سزا کے بعد ہی سہی حق تعالےٰ کو عاجز پر بہت رحم آتا ہے اس لئے بعض دفعہ گنہگاروں کو ان کی عاجزی پر بخش دیا جاتا ہے اور دعوے کے ساتھ سارا علم اور تصوف اور تقویٰ بھی دھرا رہ جاتا ہے چنانچہ ایک شخص نے جن کا نام گلاب خان تھا نیک اور صاحب علم تھے مجھ سے ایک طویل خواب دیکھنا بیان کیا جز و مقصود اس کا بیان کرتا ہوں یہ دیکھا کہ میدان قیامت قائم ہے اور حق تعالےٰ ایک ایک کا حساب لے رہے ہیں اور یہ حساب مختلف کتابوں کے امتحان کے رنگ میں ہے اور عرش پر حق تعالےٰ کی تجلی ہے اور عرش کے ایک گوشہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہیں۔ میں بہت ڈر رہا ہوں کہ میرا ابھی حساب ہوگا اتنے میں کسی شخص کا امتحان ہوا اور اس پر بہت خفگی ہوئی اور ایسی غضب ناک آواز میں خفگی محسوس ہوئی کہ رعد کی کوئی حقیقت نہیں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ کچھ مدد فرمایئے ارشاد ہوا خفگی کے وقت میں کیا کروں جب میں نے دوبارہ عرض کیا تو ارشاد فرمایا تم یوں کہہ دینا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں چنانچہ مجھ کو پکارا گیا کہ جلالین میں (غالباً) امتحان دو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں اس پر تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا کہ اچھا ایک دن کی قید (جو اوروں کی سزا سے بہت خفیف تھی) اور اس سزا کے بعد بھی بہت جلد نجات بھی دیکھی۔ یہ تو عاجز کے ساتھ معاملہ تھا اب دعوی کا حال سنئے حضرت بایزید بسطامیؒ کا قصہ ہے کہ ان کو کسی نے بعد وفات کے خواب میں دیکھا پوچھا آپ کے ساتھ کیا کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا مجھ سے سوال ہوا تھا کہ ہمارے واسطے کیا لائے۔ میں نے سوچا کہ

اور اعمال تو میرے ناقص ہیں ان کا تو کیا نام لوں، البتہ میں مسلمان ہوں اور بحمد اللہ توحید میری کامل ہے اس کو پیش کردوں۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ توحید لایا ہوں ارشاد ہوا اماتذکر لیلۃ اللبن وہ دودھ والی رات بھی یاد نہیں رہی۔ یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک رات حضرت بایزیدؒ نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ میں درد ہوگیا تو آپ کے منہ سے نکل گیا کہ دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہوگیا اس پر مواخذہ ہوا کہ تم نے درد کو دودھ کی طرف منسوب کیا یہی توحید ہے دودھ کی کیا ہستی ہے کہ کچھ تاثیر کرسکے۔ اسباب میں فی نفسہ کچھ تاثیر نہیں یہ تو محض علامات و امارات ہیں۔ موثر حقیقت میں حق تعالےٰ ہیں اور گو آثار کی نسبت اسباب کی طرف کردینا شرعاً جائز ہے مگر کاملین سے بعض مباحات پر بھی مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ پھر وہ اسناد مجازی کا استعمال کس لئے کرتے ہیں ان کو ہمیشہ اسناد حقیقی کا لحاظ کرنا چاہیئے اور اسباب کی طرف مسببات کی اسناد حقیقی نہیں ہوسکتی ان کی تو حالت مشاہدہ کی یہ ہے ؎

نیارد ہوا تا نگوئی بیار
زمین نا در دتا نگوئی بیار

(جب آپ ہوا سے یہ نہ کہیں کہ برس اس وقت تک ہوا نہیں برساتی)
اسباب بدون حکم کے کچھ نہیں کرسکتے عارف کا تو مذاق یہ ہوتا ہے ؎

گر گزندت رسد زخلق مرنج　　　　که نه راحت رسد زخلق نه رنج
از خدا داں خلاف دشمن دوست　　　　که دل ہر دو در تصرف اوست

(اگر مخلوق سے تجھ کو کوئی تکلیف پہونچے تو رنجیدہ نہ ہو اس لئے کہ مخلوق سے نہ راحت پہونچ سکتی ہے نہ رنج۔ دوست اور دشمن کے خلاف کو خدا کی طرف سے جان کیونکہ دونوں کا دل اللہ تعالےٰ کے تصرف میں ہیں۔)

جس کا یہ مذاق ہو اور جس پر یہ حقیقت منکشف ہوچکی ہو اس کی زبان سے یہ بات کیونکر نکل سکتی ہے کہ دودھ سے پیٹ میں درد ہوگیا۔ مولانا اسی باب میں فرماتے

ہیں ۔ ؎

اَنْتَ کَالرِّیْحِ وَنَحْنُ کَالْغُبَارِ   یَخْفِی الرِّیْحُ وَغُبْرًا ھَاجِھَارٍ

ما ہمہ شیران ولے شیر علم   جملہ شان از باد باشد دمبدم

حملہ شان پیدا و ناپیداست باد   آن کہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(اے از دل ما ۱۲) یعنی حق تعالیٰ کے سامنے اسباب کی ایسی مثال ہے جیسے ہوا کے سامنے غبار ہوتا ہے۔ ظاہر میں غبار اڑتا ہوا نظر نہیں آتا ہے ہوا نظر نہیں آتی مگر ظاہر ہے کہ غبار کی حرکت جو کچھ ہے وہ ہوا ہی کی وجہ سے ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ ہم بھی ظاہر میں شیر کی طرح حملہ کرتے ہیں مگر ایسے شیر ہیں جیسے جھنڈے پر شیر کی تصویر بنی ہوئی ہے کہ جب ہوا چلتی ہے تو وہ حملہ آور معلوم ہوتا ہے مگر حملہ تو ظاہر ہے اور ہوا جس سے ان کی حرکت اور حملہ کا وجود ہوا ہے مخفی ہے اسی طرح ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کا منشا حق تعالیٰ کی مشیّت ہے مگر ارادۂ حق مخفی ہے اور ہمارے اعمال ظاہر ہیں اس لئے لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ اسباب کو فاعل کہدیتے ہیں۔ مولانا چونکہ ادب سے بھرے ہوئے ہیں اس لئے آگے ان تشبیہات وتمثیلات سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے لئے کوئی تشبیہہ حقیقی نہیں ہوسکتی سب ناقص مثالیں ہیں اس لئے فرماتے ہیں ؎

اے بروں از وہم و قال وقیل من
خاک بر فرق من تمثیل من

سبحان اللہ مولانا کو کیسے عمدہ الفاظ ملتے ہیں۔ مثنوی میں معنوی خوبی تو ہے ہی ظاہری بلاغت وفصاحت بھی بہت اعلیٰ پایہ کی ہے۔ آگے ان تشبیہوں کا عذر بیان کرتے ہیں کہ جب یہ مثالیں ناقص ہیں تو پھر ان کو بیان ہی کیوں کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ بتلاتے ہیں ؎

بندہ نہ شکیبد نہ تصویر خوشت
ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

یعنی بندہ کو آپ کی خوشنما تصویریں بیان کرنے سے صبر نہیں آتا کیونکہ آپ کو دیکھ تو سکتے نہیں تو پھر کیا آپ کے کمالات کو بھی نہ سمجھیں اور آپ کی صفات سے بھی مزے نہ لیں اور اس کے لئے تمثیل وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس گو یہ ناقص مثالیں ہیں مگر ان سے صفات کمال الہیہ تک کسی قدر ذہن پہنچ جاتا ہے علمار ظاہر بعض دفعہ عارفین کو بے ادب کہدیتے ہیں کیونکہ ان کے کلام میں تمثیلات بہ کثرت ہوتی ہیں کہیں حق تعالیٰ کو ہوا سے تشبیہہ دیتے ہیں کہیں دریا سے، کہیں آفتاب سے مگر حقیقت میں عارفین سے زیادہ مؤدب کوئی نہیں اور ان تمثیلات کا عذر مولانا نے بیان کر دیا ہے کہ عاشق کو محبوب کی تصویر سے صبر نہیں آتا اُسے تصویر بھی پیاری ہوتی ہے حالانکہ ذات کے آگے تصویر ہے کیا چیز محض چند نقوش کا مجموعہ ہے مگر جو عشق سے آشنا ہے وہ جانتا ہے کہ کاغذ کی تصویر بھی اُسے کس قدر عزیز ہوتی ہے جب محبوب سامنے نہ ہو تو اس کی تصویر ہی سے دل کو کس قدر تسلی ہو جاتی ہے۔ یہی حال عارفین کی تمثیلات کا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کے تصویر کے واسطے ناقص مثالوں کو ذریعہ بنا لیتے ہیں، گو یا ظاہر میں یہ بے ادبی معلوم ہو مگر ان کا باطن عشق کی وجہ سے سراپا ادب ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

بے ادب تر نیست زوکس درجہاں

اور۔ با ادب تر نیست زوکس درنہاں

(بے ادب تر ان سے دنیا میں کوئی شخص نہیں اور با ادب بھی زیادہ کوئی نہیں)

غرض مولانا نے اس مقام پر یہ ظاہر فرما دیا ہے کہ موثر حقیقی حق تعالےٰ ہیں کوئی چیز مؤثر نہیں۔ اس مسئلہ کو مولانا نے تمثیلات سے بخوبی واضح کر دیا ہے۔ اور بات یہ ہے کہ یہ مثالیں گو ناقص ہوں مگر ان سے مضمون کی توضیح خوب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین کے کلام سے مخاطب کی تسلی ہو جاتی ہے اور علمار ظاہر کے کلام سے تسلی نہیں ہوتی کیونکہ ان کو ایسی مثالیں نہیں ملتیں جن سے معقول کو محسوس بنا دیں۔ عارفین کو نہ معلوم یہ مثالیں کہاں سے مل جاتی ہیں وہ دقیق سے دقیق مضمون کو

مثالوں سے ایسا واضح کردیتے ہیں کہ بات دل میں گھس جاتی ہے۔ عارفین نے اس طرز میں عادۃ اللہ اور عادۃ الانبیاء کا اتباع کیا ہے۔ حق تعالیٰ کے کلام میں بھی مثالیں بہت ہوتی ہیں چنانچہ زبور کا زیادہ حصہ امثال ہی ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور حکماء کے اقوال میں بھی امثال بکثرت ہیں جب کمال توحید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کی طرف کسی فعل کی اسناد نہ کی جائے نہ حقیقی نہ مجازی بلکہ ہر فعل کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف کی جائے تو عارف کے نزدیک یہ بات توحید کے خلاف کیوں نہ ہوتی کہ دودھ سے درد ہوگیا چونکہ حضرت بایزیدؒ عارف کامل تھے اس لئے ان سے ان کے درجہ کے موافق مؤاخذہ ہوا کہ یہ ہی توحید ہے جس کو تم ہمارے واسطے لائے ہو کہ دودھ کی طرف درد کی نسبت کرتے ہو۔ حضرت بایزیدؒ یہ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا الٰہی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں، ارشاد ہوا کہ راہ پر آگئے تو جاؤ اب ہم تم کو ایسے عمل سے بخشتے ہیں جس پر تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ اس سے بخشش ہوجائے گی، وہ یہ کہ تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو سردی میں اکڑتے ہوئے دیکھا تھا تم کو اس پر رحم آیا اور اپنے لحاف میں لاکر سلا لیا۔ اس بچے نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو بھی ایسی ہی راحت دیجئے جیسے اس نے مجھے راحت دی، جاؤ آج ہم تم کو اس بلی کے بچے کی دعا سے بخشتے ہیں۔ سارا تصوف گاؤ خورد ہوگیا سارے مراقبے اور مجاہدے رکھے رہ گئے اور ایک بلی کے بچے کی سفارش سے بخشے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ ذرا سے دعوے میں حقیقت کھل گئی اور معلوم ہو گیا کہ ہماری توحید بھی ناقص ہے وہ بھی اس قابل نہیں کہ جو خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کی جاسکے حالانکہ حضرت بایزید بسطامیؒ واقع میں عارف کامل تھے ان میں تو محض ایک معنی کر اضافی نقص تھا جب ان سے ذرا سے دعویٰ پر مواخذہ ہوا تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ جہاں اضافی نقص کیا معنے حقیقی نقص موجود ہے بلکہ سر سے پیر تک نقص ہی نقص ہے اور اس پر دعوے ایسے لمبے چوڑے کہ اپنے کو تعلیمیافتہ اور عالم اور مقتدا اور مجتہد سب کچھ سمجھتے ہیں اور عمل کی یہ حالت ہے کہ رات دن گناہوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو دیندار بھی کہلاتے ہیں وہ کسی ایک کام کے اعتبار سے دیندار ہیں دوسرے کاموں میں وہ دینداری کی ذرا

پرواہ نہیں کرتے جیسے آجکل ڈاکٹر ہوتے ہیں کہ کوئی آنکھ کے علاج میں ماہر ہوجاتا ہے وہ یہی کام کرتا ہے اور اسی میں مشہور ہوجاتا ہے آنکھ کے سوا وہ کسی عضو کا علاج نہیں کرتا۔ دوسرا دانت کے علاج میں ماہر ہے وہ اسی کا کام کرتا ہے کوئی چیر پھاڑ کا مشاق ہے وہ زخموں ہی کا علاج کرتا ہے۔ اسی طرح ہم نے بھی دین کے شعبوں میں انتخاب کرلیا ہے جیسے گلستان بوستان کا انتخاب کیا گیا ہے حالانکہ اول تو طبیب کے لئے بھی یہ بات عیب کی ہے کہ وہ کسی خاص مرض ہی کا معالجہ کرتا ہے، کمال جامعیت ہی میں ہے۔ لیکن اگر وہ انتخاب کرے تو چنداں مضائقہ نہیں مگر مریض کو تو انتخاب نہ کرنا چاہیئے کہ اس کی آنکھ ناک اور ہاتھ پیر میں بیماری ہو تو ان میں سے صرف ایک کا علاج کرلے اور باقی اعضاء کا علاج نہ کرے مریض کو ایک عضو کا علاج کرکے کبھی صحت نہیں ہوسکتی اس کو تو سارے ہی جسم کا علاج ضروری ہے ورنہ بیکار ہوجائے گا۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ چند اعضاء میں نقص ہو تو ایک کا علاج پہلے کرے دوسرے کا پیچھے۔ مگر علاج تو سارے جسم کا ہی ضروری ہے اس میں یہ انتخاب کرلینا کہ ایک کا علاج ہو ایک کا نہ ہو سخت حماقت ہے۔ لیکن آج کل انتخاب کا بازار گرم ہے ہر چیز کا ست نکالا جاتا ہے، دین کا بھی ست نکال لیا گیا مگر اس کا نتیجہ وہی ہوگا کہ ایک شخص کی آنکھ اور ناک اور ہاتھ پیروں میں مرض تھا اور اس نے صرف آنکھ کا علاج کیا تو ظاہر ہے کہ وہ لنگڑا لنجا رہ جائیگا اس انتخاب پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

کسی مسلمان بادشاہ کے زمانہ میں ایک ملحد نے قرآن پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں مکرر آیات بھی موجود ہیں یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا بادشاہ نے اس کو گرفتار کرکے بلایا اور پوچھا کہ قرآن پر تجھکو کیا شبہ ہے بیان کر۔ اس نے یہی کہا کہ قرآن میں بعض جگہ مکررات موجود ہیں اس لئے یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا، خدا تعالےٰ کو مکررات لانے کی کیا ضرورت تھی۔ بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اس شخص کے اعضاء مکررہ میں سے ایک ایک کاٹ دو۔ ایک ہاتھ رہنے دو اور ایک پیر۔ ایک آنکھ رہنے دو

اور ایک کان کیونکہ یہ خدا کا بنایا ہوا نہیں معلوم ہوتا خدا تعالیٰ کو مکررات کی کیا ضرورت تھی، معلوم ہوتا ہے کسی نے اس میں اضافہ کیا ہے لہذا مکررات کو حذف کردو اور ایک ایک عضو رہنے دو۔ واقعی خوب سزا دی۔ اسی طرح آجکل ہمارے بھائیوں نے دین میں انتخاب کیا ہے کوئی نماز کو ضروری سمجھتا ہے اور نماز ہی کی پابندی کرتا ہے نہ زکوٰۃ دے نہ حج کرے نہ معاملات میں سود اور رشوت سے پرہیز کرے۔ کوئی روزہ کو ضروری سمجھتا ہے اور رمضان میں روزہ کا خوب اہتمام کرتا ہے اور بقیہ اعمال وطاعات کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ کوئی حج کو ضروری خیال کرتا ہے اور حج کر کے اپنے خیال میں جنت کا مالک ہو جاتا ہے۔ اب نہ ظلم سے بچنے کا اہتمام ہے نہ غصب سے نہ امانت میں خیانت سے نہ زنا وغیرہ سے۔ لوگ ایسے ہی حاجی کو پاجی کہتے ہیں غرض اتنا اختلاف ہے آزاد افراد میں کہ اس کو دیکھ کر یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نوع نہیں۔ کیونکہ نوع کے افراد میں اتنا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ جنس ہے اور اس کے افراد انواع ہیں جس میں ہر نوع منحصر فی فرد واحد ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کی یہ تقریر ہے واقعی قیمتی لطیفہ ہے انسان کے ہر ہر فرد کی طبیعت کو دوسرے سے اتنا اختلاف ہے کہ دونوں کو متحد کہنا بعید معلوم ہوتا ہے منطقین نے نطق رب کو متحد مانا ہے جس سے ادراک مراد ہے۔ ایک دیہاتی اور ایک عاقل فلسفی کے ادراک میں اتنا زمین آسمان کا فرق ہے کہ دونوں کو ایک ایک ادراک کے تحت میں داخل کرنا نہایت دشوار ہے۔ بس فلاسفہ ہی نے دونوں کو ایک نوع کے افراد سمجھا ہے ممکن ہے اُن کا ادراک ایسا ہی ہو جو تمام افراد انسان سے متحد ہو سکتا ہو ہم تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ امام ابو حنیفہ کا اور ایک کاشتکار ہل جوتنے والے کا ادراک ایک ہی حقیقت کے دو فرد ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی اصطلاح ہے کہ کوئی اس اختلاف کے بعد بھی انسان کو نوع کہے اور کوئی اس کو نوعیت کے منافی سمجھ کر انسان کو جنس کہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی رائے میں اس درجہ اختلاف ہے کہ شاید اجناس میں بھی اتنا اختلاف نہ ہو اسی وجہ سے دین کے اجزاء میں انتخاب کرنے والے بھی باہم مختلف ہیں جو نماز کو ضروری سمجھتا ہے

وہ نماز کے وقت تو دیندار معلوم ہوتا ہے بہت گڑگڑا کر منہ بنا کر دعائیں مانگتا ہے جیسے بالکل فرشتہ ہیں اور جہاں مسجد سے باہر نکلے پھر شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا ہے۔ بس یہ عالت ہے ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما   گہ خندہ زند دیو نہ ناپاکی ما

ایماں چو سلامت بلب گور بریم   احسنت بریں چستی و چالاکی ما

گر زندہ برم بگور ایمان خودم

(کبھی فرشتہ کو ہمارے پاکی پر رشک ہوتا ہے اور کبھی ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے۔ جب قبر کے کنارے ہم ایمان سلامت لے جائیں تو ہماری اس چالاکی اور چستی پر آفریں کہنا چاہیئے اگر گور میں اپنا ایمان زندہ لے جائیں۔)

بعض لوگ نماز روزہ حج زکوٰۃ سب کے پابند ہیں، ظاہری گناہوں سے بھی بچتے ہیں مگر ان کو اصلاح اخلاق کا اہتمام نہیں۔ تکبر، حسد، کینہ، ریا وغیرہ میں مبتلا ہیں اور عُجب سے تو شاید ہی کوئی بچا ہو۔ نماز پڑھ کر اپنی حالت کو دوسروں سے اچھا سمجھتے ہیں بے نمازیوں کو حقیر جانتے ہیں اہل علم اور ذاکرین بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ علماء کو اپنے علم پر ناز ہے وہ جہلاء کو جانور سمجھتے ہیں ذاکرین کو ذکر وشغل پر ناز ہے وہ غیر ذاکرین کو بیہودہ سمجھتے ہیں، یہاں ایک علمی شبہ ہوتا ہے میں اس کو رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اگر کوئی آدمی نماز پڑھے روزہ رکھے تو کیا وہ اپنے کو نمازی نہ سمجھے بے نمازی ہی سمجھے اور خدا نے ایمان کی دولت عطا کی ہے تو کیا وہ اپنے کو مومن نہ سمجھے اپنے کو کافر سمجھے اگر یہی تواضع ہے تو یہ تو ایسا واقعہ ہوا جیسے میں ایک دفعہ الہ آباد سے کانپور جارہا تھا ریل میں چند نوجوان جنٹلمین سوار تھے اور ایک منصف صاحب بھی سوار تھے وہ منصف صاحب پرانے آدمی سادی وضع کے تھے تو جنٹلمینوں نے ان کو بنانا شروع کیا کھانے کا دسترخوان بچھایا اور ایک نے منصف صاحب سے کہا کہ جناب آپ بھی گوہ موت کچھ کھا لیجئے دوسرے ساتھی نے کہا کہ کمبخت توبہ کر توبہ کھانے کو گوہ موت کہتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ اپنے کھانے کو کھانا کہنا یہ بھی تکبر ہے۔ اس حیثیت سے

کہ اپنا کھانا ہے گو وہ موت کہتا ہی تواضع ہے۔ اس قاعدہ سے تو واقعی اپنے ایمان کو ایمان کہنا تکبر ہے اور اسے کفر کہنا ہی تواضع ہے مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ ناشکری میں داخل ہے تو اگر نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی نہ کہے تب تو ناشکری اور اگر نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی سمجھیں اور نمازی کہیں تو یہ لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ (اپنے نفس کا تزکیہ نہ بیان کرو) کے خلاف ہے اور عجب میں داخل ہے تو اب حیرت ہوتی ہے کہ کیا کریں اور کیا سمجھیں اور کیا کہیں۔ اس حیرت میں بعض ناحقیقت شناس تو گھبرا کر کہہ اُٹھے ؂

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(تختہ سے باندھ کر قعر دریا میں ڈال دیا ہے پھر کہتے ہو ہشیار دامن نہ بھیگے)

(وقال شاعر من العرب ؂ (عرب کے شاعر نے کہا ہے)

القاہ فی الیم مکتوفاً وقال لہٗ ایاک ایاک لا تبتل بالماء

(دریا میں باندھ اس کو ڈالدیا ہے پھر کہتے ہیں خبردار پانی نہ بھیگ ۱۲ جامع)

مگر محققین نے اس حیرت کو رفع فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں کہ نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی ہی کہے اور نمازی سمجھے مگر ساتھ میں یہ بھی سمجھے کہ یہ میرا کمال نہیں بلکہ محض عطائے حق ہے اور یوں کہے ؂

وَاللّٰہِ لَوْلَا اللّٰہُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

اور یوں کہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ۔ (اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچا دیا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہونچاتے)

یعنی بخدا اگر خدا کا فضل نہ ہوتا تو نہ ہم سے صدقہ خیرات ہو سکتا نہ نماز پڑھ سکتے خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو ان کاموں کی توفیق دی اگر خدا تعالیٰ توفیق نہ دے تو ہم ہرگز یہ کام نہ کر سکتے۔

صاحبو! اگر کسی چمار کو بادشاہ ایک بیش قیمت موتی دیدے جو اس کی لیاقت سے

کہیں زیادہ ہے تو بتلائیے وہ کیا کہے کیا وہ اپنے کو موتی والا نہ کہے۔ نہیں موتی والا ضرور کہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہے کہ بادشاہ کی بڑی عنایت ہے کہ ایک چمار کو اتنی بڑی چیز دیدی۔ اسی طرح آپ نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی سمجھیں مگر ساتھ میں یہ بھی سمجھیں کہ ہم تو اصل میں نالائق تھے اس نعمت کے قابل نہ تھے یہ خدا کی عطا ہے کہ ہم جیسے نالائقوں کو اپنے دربار میں آنے کی اجازت دیدی دیکھئے اب شکر اور تواضع دونوں جمع ہوگئے اس طریق میں نہ عطائے حق کی ناشکری ہوئی نہ تکبر ہوا۔ نماز کو نماز بھی سمجھا اور اپنے کو نالائق بھی سمجھا اور نماز کو محض عطائے حق سمجھا اس صورت میں آپ نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر نہیں سمجھیں گے ہاں ان کے حال پر رحم کریں گے بلکہ اگر ضرورت ہو تو بے نمازوں کو دھمکاؤ بھی اور جن پر زور ہو ان کو مار دبھی مگر اس سزا کی شان یہ ہو کہ جیسے بادشاہ بھنگی کو حکم دے کہ کسی جرم میں شاہزادے کے سو تازیانے مارے تو وہ حکم شاہی کی وجہ سے مارے گا تو سہی مگر دل میں تھوڑا تھوڑا ہوتا جاوے گا اور اسے کبھی بھی شاہزادے سے افضل ہونے کا گمان نہیں ہو سکتا محض مجبور ہو کر حکم کی تعمیل کرے گا بس یہی حال ہمارا بھی ہونا چاہیئے کہ شریعت کے حکم سے اپنے نوکروں چاکروں کی اصلاح کریں اہل وعیال پر حکومت کریں بے نمازوں کو ماریں دھمکائیں مگر ان کو اپنے سے افضل سمجھیں مگر جزماً افضل نہ سمجھو تو کم از کم احتمالاً ہی سمجھو کہ شاید خدا تعالےٰ کے نزدیک کسی خاص صفت یا فعل کے سبب یہ ہم سے فی الحال افضل ہو یا فی المال اس کو افضل بنا دیں کیونکہ آپ کو محض خدا تعالیٰ کی توفیق سے نماز وغیرہ کی توفیق ہوئی ہے اور وہ توفیق کو سلب بھی کر سکتے ہیں وہ پکے نمازی کو بھی بے نمازی بنا سکتے ہیں اور ہماری اور آپ کی تو حقیقت ہی کیا ہے حق تعالےٰ تو اپنے حبیب (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کو یہ فرماتے ہیں۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ (ترجمہ) اور اگر ہم چاہیں تو اس وحی کو بالکل سلب کرلیں جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو کارساز نہ پائیں۔

آہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا خطاب دلیل ہے قرآن کے کلام اللہ ہونے کی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی ہمت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا خطاب کر سکے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا مضمون خود بنا سکتے تھے جس سے آپ کے کمالات کے زوال کا امکان ظاہر ہو پھر چونکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کانپ اٹھنے کا موقعہ تھا اس لئے آگے تسلی فرماتے ہیں ۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ یعنی صرف رحمت کارسازی کر سکتی ہے۔ پھر چونکہ رحمت مشیت کے تابع ہے اور مشیت ہر مقدور کے ساتھ متعلق ہو سکتی ہے تو یہ کیسے معلوم ہو کہ یہاں مشیت کا تعلق بصورت رحمت ہی ہوگا اس لئے آگے تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں اِنَّ فضله کان علیك کبیرا ٥ بیشک خدا تعالیٰ کا فضل آپ کے حال پر بہت کچھ ہے۔ اب پوری تسلی ہوگئی کہ گو حق تعالیٰ کو سلب وحی پر پوری قدرت ہے مگر بوجہ کمال فضل کے سلب کا وقوع کبھی نہ ہوگا پس وہ ممتنع بالذات نہیں تو ممتنع بالغیر ضرور ہے اور فضل و رحمت کے ساتھ سلب پر قدرت ہونا یہی علامت ہے غایت رحمت و فضل کی کہ ایک بات پر قدرت ہے مگر فضل و انعام کی وجہ سے قدرت کو ظاہر نہیں کرتے اور اگر سلب پر قدرت نہ ہوتی تو اضطرار ہوتا اور اضطرار کی صورت میں وحی کا سلب نہ ہونا دلیل رحمت و فضل نہ ہوتی غرض ایک دفعہ کو حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فرمادیا کہ ہم ایسے قادر ہیں کہ آپ جیسے کامل و اکمل کے کمالات بھی سلب کر سکتے ہیں گو کریں گے کبھی نہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ ارشاد ہے پھر ہم تو کیا چیز ہیں جو دعویٰ کر سکیں ۔ ہماری نماز کیا اور ہمارا علم کیا اگر حق تعالیٰ چاہیں تو دم بھر میں سب سلب کرلیں ۔

مولانا محمد رشید کانپوری رحمۃ اللہ علیہ کو فالج پڑا تھا تو سورۂ فاتحہ تک بھول گئے تھے حالانکہ وہ بہت بڑے عالم و فقیہہ تھے مگر فالج میں یہ حالت ہوئی کہ علم تو الگ رہا سورۂ فاتحہ تک بھی بھول گئے تھے جو مسلمانوں کے بچوں کو بھی یاد ہوتی ہے۔ جب فالج سے افاقہ ہونے کے بعد ہفتہ بھر میں ان کو الحمد یاد ہوئی تو کثیر مقدار میں شیرینی تقسیم ہوئی تھی جیسے بچوں کو بسم اللہ کے موقعہ پر مٹھائی بانٹا کرتے ہیں۔ واقعی

عبرت کا موقعہ ہے۔ ایک بار مجھے خود یہ واقعہ پیش آیا کہ عشا کے بعد ذرا سی دیر مدرسہ میں لیٹ کر جو میں گھر جانے لگا تو گھر کا راستہ بھول گیا۔ حالانکہ گھر مدرسہ سے کچھ بھی دور نہیں نہ راستہ پیچدار، سیدھا راستہ برسوں سے پیروں کو لگا ہوا مگر اس وقت بالکل بھول گیا۔ اور دوسروں کے گھر پر جا پہنچا۔ جب وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہ فلاں شخص کا گھر ہے۔ تو پھر بہت ہی مشکل سے سوچ ساچ کر اپنے گھر پہونچا۔ بس سمجھ لیجئے کہ ہمارا علم کیا ہے کچھ بھی نہیں سب خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور موٹی بات ہے کہ رات کو سوتے ہوئے روزانہ ہمارے سب علوم سلب ہو جاتے ہیں پھر یہ حق تعالیٰ کا فضل ہی تو ہے کہ صبح کو سب خزانہ واپس مل جاتا ہے اگر وہ چاہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ جیسے سوتے ہوئے علم سے معرّا ہو گئے تھے ایسے ہی صبح کو کورے کے کورے اٹھیں اس لئے ہم کو دعویٰ ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ دیکھئے حضرت بایزیدؒ کے منہ سے توحید کا دعویٰ نکل گیا تھا اسی لئے اسی وقت مواخذہ ہوا اور حقیقت کھل گئی جب دعوے کے بعد ایسے کاملین کی توحید بھی ناقص ثابت ہوئی تو ہمارا تو کیا منہ ہے جو دعویٰ کریں ہماری توحید ہی کیا ہے۔ بس ہماری توحید تو اتنی ہے کہ دل سے اعتقاد اور زبان سے تکلماً خدا تعالیٰ کو واحد کہتے ہیں گو اس کی حقیقت منکشف نہ ہو وہ حقیقت یہ ہے ؎

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

یعنی خدا تعالیٰ کے سوا کسی فاعل کا مشاہدہ ہی نہ کرے گا مگر اس جگہ یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ توحید کا یہ مرتبہ عارفین کے ساتھ مخصوص ہے عام لوگ اس کے مکلف نہیں ہیں کہ کسی سبب کی طرف بھی مسبب کو منسوب نہ کریں ان کو اس کی اجازت ہے۔ بس وہ تو اس کے مکلف ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی چیز کو موثر حقیقی نہ سمجھیں۔ اس کے بعد اگر وہ تاثیر مجازی کے درجہ میں کسی سبب کی طرف اثر کو مضاف کر دیں تو ان سے مواخذہ نہ ہوگا۔ البتہ کاملین سے اس پر بھی مواخذہ ہوتا ہے وہ اس کے بھی مکلف ہیں کہ تاثیر مجازی کے درجہ میں بھی کسی چیز کی طرف اسناد نہ کریں اور عوام کو اس کا

مکلف اس لئے نہیں کیا گیا کہ اگر وہ جملہ حوادث کی نسبت بلا واسطہ حق تعالیٰ کی طرف کرنے لگیں نافع کاموں کی بھی اور مضر کاموں کی بھی تو چونکہ ان کے قلوب میں حق تعالےٰ کی محبت وعظمت اس قدر نہیں اس لئے اندیشہ ہے کہ نعوذ باللہ ان کے قلب میں حق تعالےٰ کی طرف سے ناگواری پیدا نہ ہو جائے اور عارفین کو بوجہ غلبۂ محبت کے یہ ضرر نہیں ہوتا۔ یہاں سے اسباب کی حکمت معلوم ہو گئی کہ حق تعالیٰ نے ان کو بیچ میں واسطہ اس لئے بنا دیا ہے تاکہ عوام کو ضرر یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے ناگواری نہ ہو۔ اب یہاں میں آپ کو ایک بات بتلاتا ہوں جس سے حضرت حاجی صاحب کا امام فن ہونا معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت نے ضیاء القلوب میں مراقبہ توحید کو نقل کر کے تحریر فرمایا ہے۔ لیکن محققان حال ازیں مراقبہ منع فرمودہ اند۔ (لیکن محققین نے اس مراقبہ سے منع فرمایا ہے)

میں عرصہ تک اس شش و پنج میں رہا کہ محققین نے اس مراقبہ سے کیوں منع کیا اس میں کیا مفسدہ تھا بہت دنوں کے بعد حقیقت واضح ہوئی اس وقت حضرت کے اس جملہ کی قدر ہوئی۔ ضیاء القلوب عجیب متن ہے جب یہ کتاب لکھی گئی تو مولانا محمد قاسم صاحب نے حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا تھا کہ حضرت اس کی تو بہت بڑی شرح ہو سکتی ہے۔ حضرت نے بہت سادہ لہجہ سے فرمایا کہ بھائی میں نے متن لکھ دیا ہے تم شرح کر دو۔ بہرحال حضرت نے مراقبہ توحید سے ممانعت فرمائی ہے۔ اور میں نے حضرت کے سوا کسی محقق کے کلام میں اس کی ممانعت نہیں دیکھی۔ اب یا تو حضرت نے کسی کے کلام میں یہ بات دیکھی ہو یا کسی سے زبانی سنی ہو یا خود حضرت ہی کی رائے ہو جیسے ابہام کے ساتھ تحریر فرما دیا اور یہی ظاہر ہے اس میں راز وہی ہے جو مجملاً اوپر عرض کیا ہے یعنی اس زمانہ میں قلوب میں محبت الٰہی کم ہے اس حالت قلت محبت میں اگر توحید مذکور کا تحقق ہوا تو تمام افعال کو حق تعالےٰ کا فعل سمجھے گا۔ اولاد مر گئی یا کوئی مالی نقصان ہو گیا تو اس شخص کو حق تعالےٰ کا فعل بلا واسطہ منکشف ہو گا اور محبت ہے کم تو خدا تعالیٰ سے نعوذ باللہ عداوت و بغض ہو جاوے گا۔ اس لئے آجکل اس توحید کا انکشاف عام طور پر نافع نہیں ہوتا۔

اور اگر محبت کامل ہو تو پھر کچھ ضرر نہیں ہوتا۔ محب کا تو حال ہوگا اور قال یہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے قتل کریں آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں اس پر راضی ہوں۔)

اور وہ یوں کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ خنجر آزمائی کریں)

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آجکل ہم لوگوں نے دین میں انتخاب کر لیا ہے۔ کسی نے صرف نماز کو لے لیا کسی نے صرف روزہ کو کسی نے عبادات میں واجبات و فرائض کا اہتمام کیا تو اخلاق کو چھوڑ دیا۔ اس لئے اعمال بلا اخلاق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھ کر عجب اور تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، دعویٰ اور فخر کرنے لگتے ہیں، دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس حالت کی اصلاح کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے ایسے لوگوں نے دین کو نماز روزہ پر منحصر سمجھ لیا ہے اخلاق و معاملات کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ چنانچہ اخلاق کی کیفیت تو اوپر معلوم ہو چکی معاملات کی حالت یہ ہے کہ مسلمان معاملات عدالت کو وکلاء سے تو پوچھتے ہیں علماء سے کبھی نہیں پوچھتے کہ ہم یہ معاملہ کس طرح کریں یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کو معاملات سے کیا مطلب۔ چنانچہ بعض بدنصیب اس بات کو زبان سے بھی کہہ دیتے ہیں جو کہ ایک سخت کفریہ کلمہ ہے ایک شخص کی لڑکی بیوہ ہو گئی تھی لوگ اس کو عقد ثانی کی ترغیب دے رہے تھے کہ بیوہ کے نکاح کی شریعت میں بہت فضیلت ہے تم اپنی لڑکی کا دوسرا عقد کر دو۔ تو وہ کمبخت کہتا ہے

(نقل کفر کفر نہ باشد) کہ صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے روزہ نماز کے نبی ہیں شادی بیاہ کے نبی نہیں۔ اس میں ہم اپنی رائے سے جو چاہیں گے کریں گے (نعوذ باللہ و استغفر اللہ) ایک عورت کمبخت نے اسی باب میں جبکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض صاحبزادیوں کے عقد ثانی کا ذکر کیا گیا تو اس نے سن کر یہ کہا کہ (نعوذ باللہ) وہ لڑکیاں جن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد ثانی کیا ہے شریف بیوی کے پیٹ سے نہ تھیں (نعوذ باللہ) دیکھو حضرت فاطمہؓ کا نہیں ہوا۔ کمبخت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو کم ذات قرار دیا۔ بھلا کوئی اس احمق سے یہ پوچھے کہ تو نے جو حضرت فاطمہؓ کی مثال دی تو ان کے عقد ثانی کی ضرورت ہی کہاں اور کب ہوئی تھی وہ تو حضرت علیؓ کے سامنے ہی انتقال فرما گئی تھیں۔ پھر اس احمق کو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب بیٹیاں ایک ہی بیوی سے تھیں اور دوسری بیبیوں سے آپ کی اولاد ہوئی ہی نہیں اور ہوئی بھی تو وہ سب بھی حضرت فاطمہؓ زہرا جیسی شریف زادیاں ہوئیں کیونکہ آپ کی سب بیبیاں عالی خاندان اور اشرف نسب کی تھیں غرض معاملات میں اکثر لوگ اپنے کو خود مختار سمجھتے ہیں اور شریعت میں ان کو داخل ہی نہیں سمجھتے۔

اس انتخاب کی وجہ سے ہماری وہ حالت ہو رہی ہے کہ کسی کے ہاتھ ہے تو پیر نہیں سر ہے تو دھڑ نہیں۔ دھڑ ہے تو سر نہیں۔ مجموعہ ملکر تو ایک ایک فرد سالم نکل سکتا ہے مگر فرداً فرداً تو ہم سب ناقص ہی ہیں اور بقاعدہ منطق دیکھا جاوے تو مجموعہ بھی ناقص ہی ہے۔ کیونکہ ناقصین کا مجموعہ بھی منطقی قاعدہ سے ناقص ہی ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ اس نقص ہی پر کفایت کئے ہوئے ہیں مجموعہ کے کامل ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

آج کل ایک نئی تفسیر چھپی ہے جس کی تمہید میں لکھا ہے کہ اس تفسیر کی تصنیف میں بہت سے علماء جمع تھے تو سب کامل نہ تھے، ہر فرد ناقص تھا مگر مجموعہ مل کر تو ضرور کامل ہو گیا تھا۔ سو وہ ایسا مجموعہ تھا جیسے ایک بنئے نے دریا کے کنارے پہنچ کر گاڑی بان سے

کہا تھا کہ پانی کو کنارے اور درمیان سے دیکھ کر بتلاؤ اس نے بتلایا تو آپ نے سب کا اوسط نکال لیا اوسط کے حساب سے ہر حصہ میں پانی کمر تک نکلا آپ نے حکم دیا کہ گاڑی ڈالدو کیونکہ اوسط نکالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم ڈوبیں گے نہیں، اس نے گاڑی ڈالدی جب بیچ میں پہونچے تو لگے ڈوبنے۔ بنئے نے فوراً حساب کو پھر دیکھا تو اوسط حساب کا برابر تھا تو آپ فرماتے ہیں لکھا جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں۔ یہ برکت مجموعہ کے اعتبار سے کرنے کی ہوئی اسی طرح اس مفسر نے چند ناقصوں کو ملا کر ایک مجموعہ بنایا کہ ایک تو کامل ہوگیا۔ جی ہاں وہ ایسا کامل ہوا ہے کہ سب کو لے کر ڈوبے گا۔

صاحبو! کیا ایک محلہ کے بہت سے آدمی مل کر اپنے مکانوں کی ایسی تکمیل پر کفایت کرسکتے ہیں کہ فرداً فرداً تو ہر ایک کا مکان ناقص ہو اور مجموعہ ملا کر سب حاجات مجتمع ہوں کہ ایک گھر میں باورچی خانہ نہ ہو اور ایک کے گھر میں پاخانہ نہ ہو باورچی خانہ ہو۔ ایک کے یہاں دالان نہ ہو سہ دری ہو، دوسرے کے ہاں سہ دری نہ ہو دالان ہو۔ ایک کے مکان میں اوپر بھی کمرہ ہو دوسرے کے یہاں نہ ہو۔ کسی کے یہاں بیٹھک ہو کسی کے یہاں نہ ہو اور سب یہ کہکر خوش ہو رہے ہیں کہ بلا سے الگ الگ گو ہر ایک کا گھر ناقص ہے مگر تکمیل افراد کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ مجموعہ تو کامل ہے۔ بھلا ایسے کمال مجموعی سے نفع کیا۔ اگر کسی کو رات کے بارہ بجے پاخانہ لگا تو وہ اس کمال سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے کیا آدھی رات دوسرے کے گھر بھگنے جائے گا اور جس کے یہاں باورچی خانہ نہیں کیا وہ روزانہ دوسرے کے چولھے پر کھانا پکایا کرے گا۔ صاحب غور کر کے دیکھ لیجئے چار دن میں حقیقت نظر آجائے گی۔ دنیا کے معاملات میں سب جانتے ہیں کہ کمال مجموعی محض فضول ہے بلکہ کمال شخصی کی ضرورت ہے اسی لئے ہر شخص فرداً فرداً اپنے مکان کی تکمیل میں کوشش کرتا ہے اور دوسرے شخص کے مکان کے بھروسہ پر کبھی اپنے گھر کو ناقص نہیں رکھ سکتا مگر دین کے بارے میں عقل مسخ ہوجاتی ہے۔

اور سنئے اگر چند مریض اکٹھے ہو کر باہم یہ کہیں کہ میاں بعض اعضا تمہارے درست

ہیں اور بعض اعضا، میرے اور بعض فلاں کے بس مجموعہ کامل ہے۔ پھر حکیم صاحب کے پاس جانے اور علاج کرانے کی کیا ضرورت ہے بتلایئے کیا اس طرح وہ تندرست ہوسکتے ہیں ہرگز نہیں ان شاء اللہ سب ہی مریں گے۔ اسی طرح دین میں بھی اس سے کام نہیں چل سکتا کہ ایک نے نماز پڑھ لی، ایک نے روزہ رکھ لیا ایک نے زکوٰۃ دے لی، ایک نے حج کرلیا۔ بلکہ ہر ہر شخص کو اپنی ہر ہر حالت کی تکمیل پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، جس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول علم کی، پھر عمل کی کیونکہ عمل بدون علم کے نہیں ہوسکتا۔ کوئی کام بھی ہو پہلے اس کا طریقہ جاننا ضروری ہے پھر اگر علم کامل ہے تو عمل بھی کامل ہوگا اور علم ناقص ہے تو عمل بھی ناقص ہوگا دنیا کے کاموں ہی کو دیکھ لیجئے کہ جو شخص جس کام کو خوب جانتا ہے وہ اس کو عمدگی سے کرتا ہے اور جو پوری طرح نہیں جانتا وہ بہت غلطیاں کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ کام کو خراب کردیتا ہے۔ ایک شخص اصول تجارت سے واقف ہے وہ تجارت اچھی طرح سے کرے گا۔ تھوڑے سرمایہ سے بہت کچھ نفع کمالے گا، اور ایک شخص اصول تجارت سے ناواقف ہے اس کو نفع تو کیا ہوتا بعض دفعہ اصل سرمایہ بھی ڈبو دیتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص زراعت کا طریقہ جانتا ہے وہ تھوڑی سی محنت سے بہت فائدہ حاصل کرلیتا ہے اور جو اس کام کو نہیں جانتا وہ بیج کو بھی ضائع کردیتا ہے۔

میں کہاں تک مثالیں دوں خود سوچتے چلے جاؤ بس یہی حال دین کا ہے۔ لے اللہ آخر اس کی وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ دنیا کے کاموں کا قاعدہ تو سب جانتے ہیں اور اس میں سب کا یہی مشورہ ہوتا ہے کہ بھائی پہلے اس کام کو سیکھ لو پھر کرنا مگر دین کے بارے میں علم کی ضرورت کوئی نہیں سمجھتا۔ پس جو لوگ دین پر عمل ہی نہیں کرتے وہ بھی سن لیں اور جو عمل کر رہے ہیں وہ بھی سن لیں کہ علم کی ضرورت سب کو ہے کیونکہ جو لوگ دین پر عمل کر رہے ہیں اگر وہ علم سے کورے ہیں تو ان کا عمل ضرور ناقص ہوگا ان کو تکمیل عمل کے لئے علم کی ضرورت ہے اور جو عمل نہیں کرتے ان کو عمل کی بھی ضرورت۔ اور چونکہ وہ موقوف ہے علم پر اس لئے پھر علم کی ضرورت۔ غرض علم کی ضرورت سب کے

لئے ہوئی۔ رہا عمل تو خود علم کی غایت وہی ہے تو اس کی ضرورت میں کیا کلام ہو سکتا ہے مگر یہ ضرورت نہیں کہ پہلے ہی دن فاضل بھی بن جائیں اور کامل بھی بن جائیں۔ بلکہ ایک ایک دو دو بات سیکھ کر اس کے موافق عمل شروع کر دیں۔ پھر علم و عمل دونوں کی تکمیل میں لگے رہیں۔ ان شاء اللہ ایک دن دونوں میں کمال حاصل ہو جائے گا۔

افسوس تو اس کا ہے کہ ہم لوگوں نے نقصان پر قناعت کر رکھی ہے۔ تکمیل کا اہتمام ہی نہیں اس آیت میں جو میں نے تلاوت کی ہے ان ہی دو چیزوں کا ذکر ہے علم کا اور عمل کا اس میں حق تعالیٰ نے ہدیٰ و مغفرت کی ترغیب دی ہے (ہدیٰ سے مراد علم اور مغفرت سے مراد عمل طاقت ہے ۱۲) اور جہل و بدعملی پر وعید بیان فرمائی ہے شاید اس پر طلباء یہ شبہ کریں کہ یہ آیت تو اہل کتاب کے متعلق ہے تمہاری تقریر میں مسلمانوں کو اس کا مخاطب کیوں کیا گیا۔ سو خوب سمجھ لو کہ حکم عموم الفاظ پر ہوتا ہے نہ خصوص مورد پر یہی قاعدہ ہے جس کو فقہاء نے اصول میں مصرح فرما دیا ہے۔ دوسرے میں پوچھتا ہوں کہ قابل ملامت اہل کتاب کی ذات مِنْ حَيْثُ هِيَ ذَات (اس حیثیت سے کہ ذات) تھی یا ان کے اعمال قابل ملامت تھے۔ ظاہر ہے کہ ذات پر ملامت نہ تھی بلکہ ان کے اعمال ہی قابل ملامت ہیں۔ پس یہ اعمال جس جگہ بھی پائے جائیں گے قابلِ ملامت ہوں گے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس کا مخاطب کرنا اگر ان میں بھی ان اعمال کا وجود ہو صحیح بلکہ اگر یہ مخاطب نہ ہو لیکن ان میں یہ اعمال پائے جاتے ہوں جن پر اہل کتاب کو ملامت ہو رہی ہے تو اس صورت میں مسلمانوں کو اور زیادہ غیرت کرنی چاہیے کہ ان میں وہ اعمال پائے جاتے ہیں جو اہل کتاب کے مدار مذمت ہیں اور اس غیرت کا مقتضی ہے کہ بہت جلد جہل اور بدعملی کی اصلاح کریں اور علم و عمل کا اہتمام شروع کر دیں۔

بحمد اللہ آجکل علم کا سامان بہت کچھ میسر ہے، جا بجا دینی مدارس موجود ہیں سب مسلمانوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب عربی پڑھ کر عالم ہی بنیں بلکہ جن کو عربی پڑھنے کی فرصت نہ ہو وہ اردو رسائل ہی دینی مسائل کا علم

حاصل کریں۔ آج کل خدا کا شکر ہے کہ اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ کافی مقدار میں موجود ہے لیکن ان کا خود مطالعہ کرنا کافی نہیں بلکہ سبقاً سبقاً کسی عالم سے سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں مسائل کا ترجمہ ہو جانے سے صرف زبان سہل ہو جاتی ہے مضامین سہل نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ اردو میں اقلیدس اور طب کی کتابیں بھی ترجمہ ہو گئی ہیں تو کیا ان کے مطالعہ سے کوئی شخص ریاضی داں یا طبیب ہو سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہے پھر قرآن یا فقہ کا اردو ترجمہ آپ کو استاد سے کیونکر مستغنی کر سکتا ہے میں تجربہ کی بنا پر سچ کہتا ہوں کہ محض ترجمہ کے مطالعہ سے آپ قرآن مجید یا فقہ کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ یقیناً بہت جگہ ٹھوکریں کھائیں گے اور مطلب کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے اس لئے عربی میں نہ پڑھو تو اردو ہی میں پڑھو لیکن کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھو اپنے مطالعہ کو کافی نہ سمجھو۔

مجھے پہلے بھی معلوم ہوا تھا اور اب مدرسہ کی رپورٹ دیکھ کر بھی معلوم ہوا کہ اس مدرسہ کا زیادہ تر مقصود یہ ہے کہ دیہات کے جو لوگ پوری تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ان کو ضروریات دین یعنی قرآن اور نماز روزہ وغیرہ کے ضروری مسائل کی تعلیم دی جائے۔ سو یہ موقعہ بہت اچھا ہے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور یہ خوب سمجھ لو کہ پورا عالم بننا تو فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں۔ لیکن بقدر ضرورت دین کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے۔ اس لئے اگر فرض کفایہ کی ہمت نہ ہو تو فرض عین کی مقدار تو ضرور حاصل کر لینی چاہیئے۔ آج کل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ بس ہو تو پورا عالم ہو ورنہ جاہل ہی رہے یہ بڑی غلطی ہے۔ جن لوگوں کو عالم بننے کے لئے فراغت نہ ہو وہ بیچ ہی کے راستہ پر رہیں کہ نہ عالم ہوں نہ جاہل بلکہ ضروریات دین کو حاصل کر کے اپنے دنیوی کاروبار میں لگیں اور اس کے لئے ایک سال کی ضرورت ہے زیادہ نہیں۔ ایک سال میں قرآن مجید کا ایک دو پارہ پڑھ کر اردو میں مسائل کا علم بقدر ضرورت حاصل ہو سکتا ہے اور اتنی فرصت

تو دیہات والوں کو بھی مل سکتی ہے اس لئے کم از کم ایک سال تو اپنے بچوں کو دینی علم کی ضرور تعلیم دینی چاہیئے اور یہ مدت میں نے ان لوگوں کے لئے بیان کی ہے جو پورا قرآن پڑھانے کے لئے فراغت نہیں پاتے ورنہ ایک درجہ میں پورے قرآن کی بھی ضرورت ہے بلکہ حفظ کی بھی ضرورت ہے اگر سب کے سب دو تین ہی سپارے پڑھا کریں تو پھر قرآن کی حفاظت کیونکر ہوگی اور سب ناظرہ ہی پڑھنے لگیں حفظ نہ کریں تو قرآن مسلمانوں کے پاس کیونکر رہے گا کیونکہ اس صورت میں اگر کوئی دشمن قرآن کے سب نسخے مسلمانوں سے چھین کر ضائع کر دے تو مسلمان قرآن سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور اب کسی کی مجال نہیں کہ مسلمانوں سے قرآن چھین سکے اگر مصاحف کو بھی کوئی ضائع کر دے گا تو مسلمانوں کے ہزاروں بچے اور لاکھوں جوان اور بوڑھے حافظ موجود ہیں وہ اپنی یاد سے قرآن کو پھر لکھ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ خصوصیت جملہ اہل ادیان کے مقابلہ میں حفظ ہی کی برکت سے تو ہے۔

پس جن کو حق تعالے نے فراغت دی ہے وہ اپنے بچوں کو پورا قرآن پڑھائیں اور جن کے دو چار لڑکے ہوں وہ ان میں سے ایک کو حافظ بھی ضرور بنائے۔ حفظ قرآن کی بڑی فضیلت ہے قیامت میں حافظ کی شفاعت سے ایک بڑی جماعت کی بخشش ہوگی اور اس کے والدین کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سے آفتاب بھی ماند ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ کرلو کہ خود حافظ کی کیا کچھ قدر و منزلت ہوگی جب اس کے والدین کی یہ عزت ہوگی اس لئے اس دولت کو بھی ضرور حاصل کرنا چاہیئے مگر جن کو فراغت نہ ہو وہ سارا نہ پڑھیں مگر کچھ تو ضرور پڑھ لیں کتنے شرم کی بات ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کی کتاب سے بالکل ہی ناآشنا ہوں افسوس آجکل تعلیمیافتہ طبقہ قرآن پڑھانے کو بالکل بیکار اور فضول سمجھتا ہے چنانچہ رامپور میں ایک صاحب جنٹلمین نے اپنے دوست سے کہا کہ آپ بھی اپنے بچے کو انگریزی اسکول میں بھیجیں اُنھوں نے کہا کہ نصف قرآن اس کا رہا ہے وہ ہو جائے تو بھیجوں اُنھوں نے پوچھا نصف قرآن کتنے روز میں ہوا ہے وہ بولے دو سال میں

تو آپ کیا کہتے ہیں کہ تم نے اپنے بچے کے دو سال تو ضائع کئے دو سال اور کیوں ضائع کرتے ہو اس مدت میں یہ ایک دو درجہ تو تعلیم کا طے کرتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اس ظالم کو یہ خبر نہیں کہ اس قرآن پڑھنے والے لڑکے نے اس دو سال میں نہ معلوم جنت کے کتنے درجے طے کر لئے ہیں کیونکہ قیامت میں قرآن پڑھنے والے کو حکم ہوگا کہ قرآن پڑھتے جاؤ اور چڑھتے چلے جاؤ۔ جہاں تمہارا قرآن رُک جائے وہیں تم رک جاؤ بس وہی تمہارا درجہ ہے۔ مگر تعلیمیافتہ لوگوں کو تو اسکول کے درجوں کی ضرورت ہے۔ جنت کے درجوں کی کیا ضرورت ہے اس لئے قرآن پڑھانے کو بیکار سمجھتے ہیں مگر ذرا ٹھہریں ابھی چند دن میں مرنے کے بعد بلکہ مرتے وقت ہی معلوم ہو جائیگا کہ اسکول کے درجوں کی ضرورت تھی یا جنت کے درجوں کی۔

گوالیار کی حکایت سنی ہے کہ ایک صاحب نے اپنے لڑکے کو بچپن ہی سے انگریزی میں ڈال دیا تھا اور اس کی تعلیم پر بہت روپے خرچ کئے تھے لندن بھی پاس کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہاں سے آکر وہ بیمار ہوا اور مرنے لگا تو اباجان اس کے سرہانے بیٹھ کر رونے لگے کہ ہائے بیٹا میں نے تو تیری تعلیم پر بیس پچیس ہزار روپے خرچ کئے تھے۔ میں نے اپنی محنت کا پھل بھی نہ دیکھا۔ لڑکے نے آنکھیں کھول دیں اور کہا اباجان اب کیا روتے ہو جب مجکو آخرت میں جہنم میں جاتا ہوا دیکھو گے اس وقت روؤ گے کیونکہ آپ نے یہ بیس پچیس ہزار روپے خرچ کر کے مجھے جہنم میں پھینکنے کا انتظام کیا ہے تم نے اس رقم سے میرے واسطے دوزخ خریدی ہے کیونکہ تم نے مجھے دین کی تعلیم سے بالکل کورا رکھا اس وقت میں دیکھتا ہوں کہ میرا سارا لکھا پڑھا بیکار ہے۔ موت کے فرشتے آنیوالے ہیں تم نے اتنی بڑی رقم میرے اوپر خرچ کرکے میرے ساتھ دوستی نہیں کی بلکہ سراسر دشمنی کی ہے۔

صاحبو! اس لڑکے نے تو اپنی حسرت کو ظاہر کر دیا اور امید ہے خدا کے فضل سے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ اس حسرت کی بنا پر بخشدیا گیا ہوگا مگر جو لوگ حسرت بھی ظاہر نہیں کر سکتے وہ بھی مرنے کے وقت اور مرنے کے بعد اس پر ضرور نادم ہوں گے۔

کہ افسوس ہم نے ساری عمر اسکولوں کے درجے اور ڈگریاں حاصل کرنے میں گنوادی اور جنت کی ایک ڈگری بھی حاصل نہ کی ؎

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ	اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

(غبار جانے دو عنقریب دیکھ لوگے کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

ابھی ہوائے نفسانی کا غبار چڑھا ہوا ہے اس لئے آپ جتنا چاہیں دعویٰ کرلیں کہ ہم ترقی یافتہ ہیں ہم گھوڑے پر سوار ہیں ذرا غبار کو اترنے دو ابھی معلوم ہو جائیگا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا لنگڑے گدھے پر۔ میں کہتا ہوں کہ جنٹلمینوں کو اگر جنت کی طلب کے لئے تعلیم قرآن کی ضرورت نہیں تو کم از کم قومی حمیت کے ہی لحاظ سے اس کو ضروری سمجھا ہوتا۔ یہ لوگ قومی حمیت کا تو بڑے زور سے دعویٰ کرتے ہیں اور رات دن اسی کا سبق رٹتے ہیں وہ ذرا بتلائیں تو کہ قومیت اسلامی کی بنیاد کیا ہے۔ یقیناً اگر مسلمان ہیں تو یہی کہیں گے کہ قومیت اسلامی کی بنیاد قرآن مجید ہی ہے پھر حیرت ہے کہ جس چیز کے وہ حامی ہیں اسی کی جڑیں اکھاڑتے ہیں۔

صاحب اگر تعلیم قرآن بیکار ہے تو وہ قومی حمیت ہی کیا کار آمد ہے جس کا آپ دعوے کرتے رہتے ہیں۔ بس وہ حال ہے ان لوگوں کا ؎

یکے بر سر شاخ و بن می برید (ایک شخص شاخ کی جڑ پر بیٹھا ہوا شاخ کاٹ رہا تھا)

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر آپ کی اس بے اعتنائی سے قرآن مجید کا وجود دنیا سے ناپید ہو گیا تو ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کا نام بھی مٹ جائے گا۔ اب تک جو اسلام کا نام دنیا میں روشن ہے وہ اس مبارک کتاب ہی کی بدولت ہے اور جس فرقہ کو آپ مسلمانوں میں سب سے زیادہ بیکار سمجھتے ہیں واللہ وہی اسلامی قومیت کا محافظ ہے۔ تم ہوکس ہوا میں خدا کی قسم اگر یہ قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے والے نہ رہے تو مسلمان دنیا کے طبقہ میں کہیں بھی نہ رہیں گے۔ ساری قومی حمیت ناک کے رستہ نکل جائے گی بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ یہ فرقہ جو تمہارے نزدیک بیکار ہے صرف قومیت اسلامی کا محافظ نہیں بلکہ وجود عالم کا محافظ ہے اگر یہ جماعت دنیا میں نہ رہے تو دنیا ہی نہ رہے گی بلکہ سارا عالم برباد

ہو کر قیامت آجائے گی اور یہ میں اپنے گھر سے نہیں کہتا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَبْقٰی فِی الْاَرْضِ وَاحِدٌ یَقُوْلُ اللّٰہ اَللّٰہ اَوْ کَمَا قَالَ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہنے والا ایک شخص بھی موجود رہے اور ظاہر ہے کہ اللہ اللہ کہنے والے یہی لوگ ہیں جن کو آپ بیکار سمجھتے ہیں اور دوسرے طبقوں میں بھی اگر کوئی خدا کا نام لینے والا ہے تو وہ بھی ان ہی کی برکت سے ان ہی کے تعلق سے ہے۔ اب تو ان جنٹلمین صاحب کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمان کا بچہ دو سال قرآن پڑھ کر دنیا و آخرت کے کتنے درجے طے کرتا ہے۔ اسکول کا ایک درجہ طے کر کے تو وہ خاک بھی حاصل نہیں کرتا اور قرآن کی ایک سورت بلکہ ایک آیت پڑھ کر وہ اسلامی قومیت کا محافظ بلکہ تمام عالم کا محافظ بن جاتا ہے یہ تو دنیا کا نفع ہے اور آخرت کا نفع تو سب جانتے ہیں پھر میں کہتا ہوں کہ آجکل جس علم کی وجہ سے لوگ تعلیم قرآن سے غفلت کر رہے ہیں زمانہ نے اس وقت اس کی قلعی کھول دی ہے پہلے انگریزی تعلیم کی جس درجہ قدر تھی اب اُس کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ خدا اس محکمہ تخفیف کا بھلا کرے اس نے دکھلا دیا کہ بہت سے انگریزی پڑھنے والے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں گو اس سے رنج بھی ہوتا ہے کہ ملازمت چھوٹنے سے بعض مسلمانوں کو تکلیف ہوئی اور ان پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر اس کی خوشی ہے کہ جس کے نشہ میں وہ دین سے غافل ہو رہے تھے اس محکمہ نے وہ نشہ ان کے دماغوں سے اُتار دیا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ انگریزی تعلیم سے دین تو حاصل ہوا ہی نہ تھا دنیا بھی سب کو حاصل نہیں ہوتی۔ ایک صاحب نے خوب کہا کہ علم دنیا تو جب تک مکمل نہ ہو کسی مصرف کا نہیں اور علم دین کا جو درجہ بھی حاصل ہو جائے وہ نافع ہے۔ آخرت کا تو نفع ہے ہی دنیا کا بھی نفع بھی اگر کوئی حاصل کرنا چاہے وہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی کو دین میں اور بھی کچھ حاصل نہ ہو صرف اذان ہی یاد کر لے جو سب سے ادنیٰ درجہ ہے علم دین کا تو وہ بھی اپنا پیٹ پال سکتا ہے دونوں وقت چین سے پکّی پکائی روٹی کھا سکتا ہے بخلاف انگریزی کے کہ اس میں انٹرنس سے کم تو بالکل بیکار ہے اور انٹرنس بھی آجکل زیادہ کارآمد نہیں کیونکہ انگریزی

پڑھنے والے اس کثرت سے ہوگئے ہیں کہ ہر محکمہ میں۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے والوں کی درخواستیں پہلے سے رکھی رہتی ہیں۔ پھر اعلیٰ کے ہوتے ہوئے انٹرنس والوں کو کون پوچھتا ہے۔ بعض لوگ اپنی اولاد کو علم دین اس لئے نہیں پڑھاتے کہ مولوی غریب ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم دین غریب ہی پڑھتے ہیں اگر امراء کے بچے علمِ دین پڑھنے لگیں تو مولوی امیر ہونے لگیں گے تو تم اس کا اہتمام کیوں نہیں کرتے پھر تم امیر ہی مولویوں سے وعظ کہلایا کرنا اُن ہی سے مسائل دریافت کیا کرنا پھر غریب مولویوں کا تعلق صرف غریبوں ہی سے رہ جاویگا۔ دوسرے اُمراء کی تعلیم سے یہ فائدہ ہوگا کہ چندہ کا کام بند ہو جاوے گا جو جڑ ہے ذلت کی۔ امیر مولویوں کو چندہ کی ضرورت ہی نہ ہوگی بلکہ اگر وہ چندہ کریں گے تب بھی وہ نظروں میں ذلیل نہ ہوں گے۔ مگر ان شاء اللہ وہ اگر چندہ کریں گے تو ڈاکہ ہی ڈالیں گے لیکن وہ ڈاکہ ڈال کر بھی معزز رہیں گے۔ غریب مولوی تو چندہ چار روپے ہی پر قناعت کر لیتے ہیں اور وہ چار سو سے کم پر قناعت ہی نہ کریں گے مگر بلا سے ان کی عزت تو کم نہ ہوگی اور غریب مولویوں کے چندہ سے تو دین کی بڑی بے وقعتی ہو رہی ہے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا دھندا اپنے پیٹ کے واسطے کیا جا رہا ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ علماء کو چندہ کا کام ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ جو کام دین کا کرنا ہو اسکے لئے قوم کے معزز آدمیوں کو جمع کر کے یہ کہہ دیا جائے کہ صاحبو! دین کی حفاظت کے لئے اس کام کی ضرورت ہے آپ بھی غور کر لیں کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر وہ ضرورت کو تسلیم کر لیں تو ان سے کہا جائے کہ سب مل کر اس کا انتظام کریں۔ علماء اصل میں کام کریں اور معززین روپیہ کا انتظام کریں غریب علماء ہی پر سارا بار کیوں ڈالا جاتا ہے کہ وہ کام بھی کریں اور روپیہ بھی جمع کریں اور اگر وہ یہ کہیں کہ یہ کام ضروری نہیں فضول ہے تو علماء کو چندہ کی ضرورت نہیں بس وہ کام بند کر کے اپنے گھر پر رہیں اور تجارت و زراعت یا کسی اور شغل میں لگیں اور فرصت کے وقت میں جتنا ہو سکے دین کا کام کر لیا کریں۔ اس صورت میں قیامت کے دن ان پر مواخذہ نہ ہوگا یہ صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے مسلمانوں کے سامنے دینی خدمت کی ضرورت ظاہر کر دی تھی اُنھوں نے اس کو فضول بتلایا اور روپیہ کا انتظام نہ کیا اور ہمارے چندہ کرنے سے

دین کی بے وقعتی ہوتی تھی اس لئے ہم نے چندہ نہ کیا اور معاش کے لئے دوسرے کاموں میں لگ گئے اور اسی کے ساتھ جتنا ہم سے ہو سکا اس قدر دین کی خدمت بھی کرتے رہے اس کے بعد ان لوگوں کی گردنیں نیچی ہو گئی جو دین کی خدمت کو فضول بتلاتے تھے ذرا علماء اس طرح کر کے تو دیکھیں ان شاء اللہ تعالیٰ عوام سب سیدھے ہو جائیں گے اور خود چندہ کر کے روپے لالا کر دیا کریں گے۔ میں نے اوپر جہاں رپورٹ مدرسہ کے حوالہ سے مدرسے کے مقصد کو ظاہر کیا تھا یہ کہہ رہا تھا کہ طبقۂ امراء کو میں نصف قرآن یا ربع قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا ان کو تو پورا قرآن پڑھنا چاہیئے پھر قرآن پڑھ کر دین کا عالم بننا چاہیئے۔ ہاں جن کو ملازمت کی ضرورت ہو ان کو اتنی رخصت ہے کہ اگر وہ عربی زبان میں دین کو حاصل نہ کر سکیں تو کم از کم اردو ہی میں پڑھ لیں کیونکہ ایسے لوگوں کو انگریزی کی بھی ضرورت ہے اور دیہات والے جو فراغت نہیں پاتے وہ کم از کم ایک سال تو دین کے لئے خرچ کر دیا کریں اتنی وسعت دینے کے بعد بھی اگر لوگ جاہل ہی رہیں تو اس وعید کے لئے تیار ہو جاویں جو اس آیت میں مذکور ہے۔

اب میں عنوانِ آیت سے ایک بات پر متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے اِشْتَرٰی کا لفظ اختیار فرمایا ہے جس کے معنی ہیں استبدال بالتراضی (رضامندی سے بدلنا) اس سے معلوم ہوا کہ رضا و خوشی سے جہل و ضلالت کو اختیار کرنا یہ موجب وعید ہے اور افسوس ہے کہ آجکل یہی صورت ہو رہی ہے کہ لوگ خوشی کے ساتھ علم دین سے اعراض کر رہے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ اپنی اس غفلت پر کبھی ان کو افسوس نہیں ہوتا نہ علم سے محرومی پر حسرت ہوتی ہے بلکہ غضب یہ ہے کہ جو بیچارہ طالب اصلاح ہو اور اپنے بچوں کو علم دین پڑھانا چاہے اس پر چاروں طرف سے ملامت و طعن ہوتا ہے کہتے ہیں کہ کیا اپنی اولاد کو ملّا بناؤ گے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ملاّ ہو کر یہ دنیا کے کام کا نہ رہے گا دنیا سے نکمّا ہو جائے گا ہم اس الزام کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے جواب میں مولانا رومی کے التزام کو پیش کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں

؎ تابدانی ہر کرا یزداں بخواند ؏ از ہمہ کارِ جہاں بیکار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں)

واقعی ملّانے دنیا کے کاموں سے بیکار ہو جاتے ہیں مگر خبر بھی ہے کن کاموں سے بیکار ہوتے ہیں سب کاموں سے نہیں

بلکہ ان کاموں سے جو خلاف شرع ہیں یا مباحات زائدہ ہیں۔ باقی جو کام شرع کے موافق ہیں اور ضرورت کے درجہ میں ہیں گو دنیا ہی کے ہوں ان میں وہ بہت چست ہوتے ہیں چنانچہ اپنے اہل و عیال کی طرف سے کبھی بیفکر نہیں ہوتے بلکہ ان کے حقوق واجبہ کو دنیا داروں سے زیادہ ادا کرتے ہیں البتہ طالب علم خاص زمانۂ طالب علمی میں دنیا کے بعضے ضروری کاموں میں بھی سست ہوتے ہیں مگر اس کا راز یہ ہے کہ وہ ایک اہم کام میں مشغول ہیں اس کی طرف توجہ لگی ہوئی ہے اور نفس ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا آپ اس کو عیب سمجھتے ہیں کہ طالب علم کو کھانے کی فکر نہیں ہوتی بعض دفعہ مطالعہ کتاب میں اس کو بھوک کی خبر نہیں رہتی یا ایک طالب علم کی حکایت ہے کہ وہ پانی کے دھوکے میں تیل پی گئے۔ آپ اس پر ملامت کرتے ہیں مگر یہ انصاف ہے۔ پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کا ایک کمیرا بالدی ہل جوتنے میں ایسا مشغول ہو جائے کہ اسے روٹی کی بھی خبر نہ رہے تو کیا آپ اس کو عیب سمجھیں گے یا اس کی تعریف کریں گے کہ بڑا نمک حلال نوکر ہے آقا کے کام کو ایسی محنت سے کرتا ہے کہ اپنی جان کی بھی خبر نہیں رہتی افسوس آپ کے کام میں کسی کو اپنی خبر نہ رہے وہ تو نمک حلال قابل تعریف ہوا اور خدا کے کام میں کوئی اپنے سے بے خبر ہو جائے تو وہ سست اور کاہل اور قابل ملامت ہے۔
صاحبو! غور تو کیجئے کیا یہی انصاف ہے اور طلباء کی یہ سستی بھی صرف زمانہ طلب ہی تک رہتی ہے۔ پھر فارغ ہو کر تو وہ ایسے چست ہو جاتے ہیں کہ ان کی برابر دنیا دار کبھی بھی چست نہیں ہو سکتے وہ تھوڑی دیر میں اتنا کام کر لیتے ہیں کہ دنیا دار دو چار مل کر بھی اس سے زیادہ دیر میں وہ کام نہیں کر سکتے۔ آپ طلباء و علماء کے پاس رہ کر ان کی حالت دیکھیں کہ وہ تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف کا کام کتنی چستی سے کرتے ہیں اور اس سے فارغ ہو کر دنیا کے کام کس پھرتی سے انجام دیتے ہیں اور اہل و عیال کی کیسی خبر گیری کرتے ہیں اور اس میں راز یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی امداد ہوتی ہے اس لئے تھوڑی دیر میں وہ بہت کام کر لیتے ہیں اس امداد پر ایک دیندار کا قصہ یاد آیا کہ وہ جمعہ کے دن اپنے کھیت میں پانی دے رہے تھے کہ جمعہ کی اذان ہوگئی انھوں نے سوچا کہ پانی کا انتظام کرتا ہوں تو جمعہ جاتا ہے اور جمعہ کو جاتا ہوں تو پانی کا کام رہا جاتا ہے بالآخر انھوں نے دین کو دنیا پر ترجیح دی اور کھیت کا کام چھوڑ کر جمعہ کو چلے گئے۔ جمعہ کے بعد جو آکر دیکھا تو کھیت پانی سے

بھرا ہوا تعجب ہوا پڑوسی کہنے لگے کہ عجب بات ہے ہم اپنے کھیتوں میں پانی دیتے تھے اور ڈول ٹوٹ ٹوٹ کر وہ تمہارے کھیت میں پہنچ جاتا تھا۔ تو کبھی حق تعالیٰ کی امداد کھلی آنکھوں نظر آجاتی ہے اور باطنی امداد تو ہمیشہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ان کے وقت میں برکت دیدیتے ہیں اس لئے یہ خیال نہ کرو کہ تمہارا لڑکا علم سے فارغ ہو کر دنیا کے کام کا نہ رہے گا بخدا اگر وہ دیندار ہو گیا تو اپنے مفید کاموں میں وہ دنیا داروں سے زیادہ چست ہوگا دوسرے وہ کم خرچ ہوگا شان اور وضع اور فیشن کا پابند نہ ہوگا۔ تھوڑی آمدنی میں اپنا سارا خرچ چلائے گا۔ اور انگریزی پڑھنے والی اولاد کو اگر اعلیٰ ملازمت نہ ملی تو وہ ساری عمر باپ ماں ہی سے خرچ منگاتے رہیں گے چنانچہ ایسے نظائر موجود ہیں اب آپ کو چاہیئے کہ اپنی اولاد کو اس مدرسہ میں بھیجدیں اور میں نے اس مدرسہ میں یہ بھی رائے دی ہے جو قبول کر لی گئی کہ ایک نصاب ایسا بنایا جائے جس میں اردو فارسی میں لوگ دینیات حاصل کر سکیں اور میری رائے میں مدرسہ کے اندر ایک ایسا نصاب ہونا چاہیئے اور میں نے کئی جگہ یہ رائے ظاہر بھی کی لیکن اہل مدارس نے اس پر توجہ نہیں کی اگر اس مدرسہ میں اس پر عمل کیا گیا اور ان شاء اللہ امید ہے کہ کیا جائے گا تو یہ بات اس مدرسہ کی خصوصیات میں سے ہوگی۔ ایک خصوصیت اس مدرسہ کی اسی جلسہ میں یہ معلوم ہوئی کہ اس مرتبہ جو جلسہ کی وجہ سے مہمانوں کا مجمع ہوا ہے ان کی دعوت وغیرہ کے لئے اور اسی طرح جلسہ کے جملہ اخراجات کے لئے خاص احباب سے چندہ کیا گیا ہے عام چندوں کی رقم میں سے جلسہ کے مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا گیا یہ بات بڑی خوشی کی ہے میری ہمیشہ سے یہی رائے ہے کہ اول تو مہمانوں کو مدرسہ کی طرف سے کھانا کھلانے کی ضرورت نہیں یہ کسی کے بیٹے کی تقریب تھوڑا ہی ہے جو آنے والوں کو کھانا دیا جائے یہ ایک قومی اور دینی کام ہے جو آئے اس کو اپنے پاس سے خرچ کر کے بازار میں کھانا چاہیئے جیسے عام قومی جلسوں میں کھانے پینے کا خرچ ہر شخص خود برداشت کرتا ہے اور اگر یہ نہ ہو اور مہمانوں کو کھانا کھلایا ہی جاوے تو اس کے لئے خاص چندہ کرنا چاہیئے جس میں سب شریک ہونے والوں کو اس بات کی صریحاً اطلاع ہو کہ یہ رقم مہمانوں کے کھلانے وغیرہ میں صرف ہوگی عام چندہ سے یہ اخراجات نہ کرنے چاہئیں کیونکہ عام چندہ دینے والے زیادہ تر یہ سمجھ کر مدارس میں چندہ دیتے ہیں کہ ہماری رقم تعلیمی کام

میں صرف ہوگی اس سے طلبہ کو کھانا کپڑا دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ اور اسی کو زیادہ ثواب سمجھتے ہیں اور اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس سے جلسہ کے مہمانوں کو کھانا کھلایا جائیگا جن میں بہت سے امراء و خوش حال بھی ہوتے ہیں تو شاید بعض لوگ اس اطلاع کے بعد چندہ نہ دیتے اس لئے میرے نزدیک عام رقوم چندہ سے جلسہ کے اخراجات میں صرف کرنا شبہ سے خالی نہیں اور شبہ بھی قوی پس یا تو اس کے لئے خاص چندہ کیا جایا کرے یا کم از کم جلسہ میں جب چندہ جمع کیا جائے اسی وقت اعلان کر دیا جائے کہ اس جلسہ کا خرچ اس چندہ سے نکالا جائے گا جو صاحب اس میں متفق نہ ہوں اس وقت ظاہر فرما دیں تاکہ ان کا چندہ علیحدہ رکھا جاوے اس طرح بھی شبہ سے بچاؤ ہو سکتا ہے مگر اہل مدارس اتنی سہل صورت سے بھی تساہل کرتے ہیں مگر جائے خوشی ہے کہ اس مدرسہ میں اس کا لحاظ کیا گیا مجھے ایک بڑی خوشی اس مرتبہ یہ ہوئی کہ بعض دفعہ مدرسہ کی طرف سے چندہ کے لئے جو سفیر بھیجا جاتا ہے تو اس کے متعلق میں نے ایک رائے دی اور وہ بھی مان لی گئی اور وہ رائے یہ ہے کہ سفیر اگر عالم نہ ہو تو اس کو وعظ گوئی سے منع کر دیا جائے۔ محض ترغیب چندہ کا محدود الفاظ سے مضائقہ نہیں مگر غیر عالم وعظ کبھی نہ کہے اس میں چند مفاسد ہیں ایک تو یہ کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیئے اور آپ فرماتے ہیں اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ کہ جب کام نا اہلوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر رہو. گویا نا اہل کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کے علامات سے ہے اور یہ امر مصرح و ثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامات قیامت سے ہوں وہ معصیت اور مذموم ہے اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں یہ منصب صرف علماء کاملین کا ہے اس لئے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں بوجہ ناواقفیت کے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی گو بعضے بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق اختیار کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے۔ پھر آجکل ایسے نفس کہاں ہیں جو صاف کہدیں کہ ہم جاہل ہیں ہم کو مسائل معلوم نہیں

ضرور کچھ گڑھ مڑھ کر جواب دیں گے اور اکثر وہ غلط ہوگا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچالیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑ جاویں۔ بعض دفعہ جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا اس کا ایسا جواب دیتے ہیں جس سے نہ جواب معلوم ہو نہ جہل ظاہر ہو۔ گنگوہ میں ایک جاہل فتویٰ دیا کرتا تھا مولانا گنگوہی ؒ نے اپنی نوعمری میں اس سے امتحاناً سوال کیا کہ حالت حمل میں بے شوہر عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے۔ کہا ایسا ہے جیسے گھیرا دینا۔ اس گول مول جواب سے نہ اس کا جہل ظاہر ہوا نہ جواز کا فتویٰ ہوا۔ مگر ایسے جوابات سے عوام کیا سمجھیں گے یقیناً غلطی میں پڑیں گے شاید کوئی جاہل واعظ یہ کہے کہ ہم کتابیں دیکھ دیکھ کر فتویٰ دیا کریں گے اور آجکل اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے تو میں کہتا ہوں کہ بعض مسائل کا تعلق دو باب سے ہوتا ہے، ایک باب میں تو اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے باب میں اس کا مقید ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ قیود و شرائط بعض دفعہ ایسی ہوتی ہیں جن پر جاہل تو جاہل ناقص عالم کی نظر بھی نہیں پہنچتی بعض دفعہ ناتمام علم سے لوگوں کو تنگی میں ڈالیگا اور جب وہ تنگی کی برداشت نہ کر سکیں گے تو شرع کو بدنام کریں گے مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ اتحاد جنسین کے ساتھ تفاضل ناجائز ہے مثلاً چاندی کے بدلے چاندی یا سونے کے بدلے سونا خریدا جائے تو مساوات ضروری ہے تفاضل (کمی بیشی) حرام ہے اب جاہل تو اس مسئلہ کو دیکھ کر اسی طرح بیان کر دیگا اور ممکن ہے کہ ایک وقت میں چاندی کا بھاؤ روپے کے برابر نہ ہو بلکہ چاندی دس تولہ آتی ہو جو ایک روپیہ کے مقابلہ میں روپیہ کے وزن سے زیادہ آجائیگی اور ان حضرت کو صرف اتنا ہی مسئلہ معلوم ہے کہ اتحاد جنس کے وقت تفاضل حرام ہے تو یہ حضرت یا تو خود روپے کے برابر ہی لائیں گے پھر گھر والے ان کو بیوقوف بنائیں گے اور یا دوسروں کو اس پر مجبور کریں گے تو دونوں صورت میں شریعت کو بدنام کریں گے کہ یہ اچھا مسئلہ ہے کہ ایک چیز روپے میں روپے سے زیادہ آسکتی ہے مگر شریعت کہتی ہے کہ نہیں برابر ہی لو زیادہ مت لو۔ تو یہ خرابی جہل کی وجہ سے ہوئی محقق اگر اس مسئلہ کو بیان کریگا تو ساتھ ساتھ یہ بھی کہدیگا کہ اگر چاندی ایک روپیہ کے بدلہ میں اس سے زیادہ آتی ہو تو اس وقت روپے سے چاندی نہ خریدو بلکہ روپے کو بھنا کر کچھ دونیاں چونیاں اور ان کے ساتھ کچھ پیسے ملا کر خریدو اب جائز ہے کہ ایک روپے کے بدلے میں تولہ بھر سے زیادہ چاندی لے لو کیونکہ ریزگاری میں جتنی مقدار چاندی ہوگی اس کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آجائیگی باقی چاندی پیسوں کے مقابلہ میں ہو جاویگی اور پیسہ اور چاندی میں جنس بدل گئی اس پر کمی بیشی جائز ہے بعض جاہل کہدیتے ہیں کہ یہ تو بات ہی کیا ہوئی روپیہ دینا اور روپیہ کی ریزگاری دینا ایک ہی بات ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ روپے کے

بدلہ میں تو تولہ بھر سے زیادہ چاندی لے سکیں اور ریزگاری کے بدلہ میں زیادہ لے سکیں میں کہتا ہوں کہ یہ ضابطہ کی بات ہے کہ شریعت نے اس کو ناجائز کیا ہے اور اس کو جائز کیا ہے اس میں ایسے سوالات کا حق نہیں شریعت کا مقصود یہ ہے کہ تم کو نقصان بھی نہ ہو اور احکام کے پابند بھی رہو اس طرح سے کہ جو کام کرو شریعت سے پوچھ کر کرو تاکہ تم معاملات میں آزاد اور مطلق العنان نہ رہو کہ جس طرح چاہا کر لیا بلکہ حکم کے پابند ہو کر کام کرو کیونکہ جو ضروری کام تم آزادی کے ساتھ کرنا چاہتے ہو پابندی شریعت کے ساتھ بھی وہ کام نکل سکتا ہے پھر خوامخواہ گناہ میں مبتلا ہونا کونسی عقلمندی ہے۔ یہ تو مثال تھی تنگی میں ڈالنے نہ ڈالنے کی اب مسئلہ کے اطلاق و تقیید کی مثال سنئے. مثلاً طلاق کے باب الکنایات میں فقہاء نے لفظ اختاری کو کنایات طلاق میں بیان کیا ہے اور اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وقوع طلاق نیت کے بعد ہوتا ہے تو اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختاری میں بھی صرف نیت سے وقوع طلاق کا ہو جاویگا لیکن اسی اختاری سے وقوع طلاق کی ایک اور شرط بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ اختاری میں نیت کے ساتھ وقوع نہیں ہوتا بلکہ عورت جب اسی مجلس میں طلاق کو اختیار کرلے اس وقت وقوع ہوتا ہے اور اختیار منکوحہ کی شرط فقہاء نے باب الکنایات میں نہیں بیان کی بلکہ یہ شرط باب التفویض میں لکھی ہے پس اب اگر کوئی اختاری کو صرف باب الکنایات میں دیکھ کر حکم بیان کریگا وہ ضرور غلطی کریگا اور نیت زوج کے بعد فوراً وقوع کا فتویٰ دیدیگا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس میں بعض علماء تک بھی غلطی کر چکے ہیں چنانچہ علامہ شامی نے ایک فقیہ کی غلطی نکالی ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ میں ایک غلط فتویٰ دیا ہے۔ نیز بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ایک کتاب میں مطلق ہے دوسری کتاب میں مقید ہے اس لئے مسائل مہمہ میں مفتی کو لازم ہے کہ صرف ایک کتاب میں دیکھ کر فتویٰ نہ دے بلکہ مختلف کتابوں میں دیکھ کر جواب دے۔ غرض فقہ کا فن بہت دقیق ہے اسی لئے میں فقہ حنفی کے سوا کسی دوسرے مذہب کی فقہی کتاب طلبا کو پڑھانے کی جرات نہیں کرتا۔ کانپور میں ایک طالب علم نے جو شافعی المذہب تھے مجھ سے اپنے مذہب کی کوئی فقہی کتاب پڑھنا چاہی میں نے عذر کر دیا مجھے یہ اختاری کا مسئلہ اس وقت یاد آ گیا میں نے ان سے یہی عذر کیا کہ بعض دفعہ ایک مسئلہ ایک مقام پر مطلق ہوتا ہے اور دوسرے مقام سے یا دوسری کتاب سے اس میں کچھ قید معلوم ہوتی ہے جیسے ہمارے یہاں مسئلہ اختاری اس کی نظیر ہے تو ممکن ہے کہ آپ کے فقہ میں بھی کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں دوسری جگہ

کوئی قید مذکور ہو اور مجھے اس کی خبر نہ ہو تو ممکن ہے کہ میں آپ کو اطلاق کے ساتھ مسئلہ سمجھا دوں اور آپ بھی اس کو مطلق سمجھ کر ساری عمر غلطی میں مبتلا رہیں اس لئے میں آپ کے مذہب کی کتاب نہیں پڑھا سکتا اپنے مذہب کی کتابوں پر تو تھوڑی بہت نظر ہے اس کا ذخیرہ بھی اپنے پاس موجود ہے دوسرے مذہب پر نہ اتنی نظر ہے نہ کتابوں کا زیادہ ذخیرہ ہے اس میں غلطی ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ تم رامپور جا کر مولوی طیب صاحب عرب سے فقہ شافعی پڑھ لو وہ شافعی المذہب ہیں ان کی نظر اپنے مذہب پر زیادہ ہے وہ اچھی پڑھائیں گے علماء حنفیہ فقہ شافعی کو صحیح طور پر نہیں پڑھا سکتے جیسے علماء شافعیہ فقہ حنفیہ کو اچھی طرح نہیں پڑھا سکتے ہر مذہب والا دوسرے مذہب کے مسائل میں ضرور غلطیاں کریگا چنانچہ ہدایہ میں بعض مسائل کی نسبت دوسرے امام کی طرف غلط کر دی گئی اسی طرح شافعیہ کی کتابوں میں حنفیہ کی طرف بعض مسائل غلط منسوب کئے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے ہندوستان میں تقلید مذہب حنفی کے وجوب کی کہ یہاں رہ کر کسی دوسرے مذہب پر صحیح عمل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندوستان کے علماء اکثر حنفی ہیں اور یہاں کتابیں بھی فقہ حنفی کی زیادہ ملتی ہیں اساتذہ بھی اسی فقہ کے میسر ہو سکتے ہیں۔ دوسرے فقہ کی نہ زیادہ کتابیں یہاں موجود ہیں نہ ان کے پڑھانے والے میسر آ سکتے ہیں تو پھر عمل کی کیا صورت ہو ہمارے ایک مہربان مکہ مکرمہ جا کر شافعی بن آئے ہیں یہ تو کوئی ملامت و طعن کی بات نہیں تھی اگر تحقیق کے ساتھ دوسرے مذہب کو اختیار کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مذاہب اربعہ سب حق ہیں۔ ہاں تلعب بالمذاہب البتہ حرام ہے کہ اس کو کھیل بنا لیا جائے آج حنفی ہو گئے کل شافعی ہو گئے پھر مالکی ہو گئے۔ لیکن یہ ذرا میرے پاس آئیں تو میں ان سے پوچھوں گا کہ ہندوستان میں وہ شافعی بن کر کیونکر رہ سکتے ہیں یہاں رہ کر امام شافعی کے مذہب پر تمام مسائل میں وہ صحیح عمل کیونکر کریں گے اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو وہ خود عالم ہوتے اور فقہ شافعی کو کسی فقیہ شافعی سے حاصل کیا ہوتا سو ان میں یہ وصف موجود نہیں یا ہندوستان کے علماء سے پوچھ پوچھ کر عمل کریں گے سو میں بتلا چکا کہ ہندی علماء مذہب شافعی کے مسائل کو صحیح طور پر نہیں بتلا سکتے۔ اب یہاں امام شافعی کے فقہ پر عمل کیونکر ہوگا بس اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ وہ مکہ مکرمہ ہی جا کر رہیں اور جہاں سے وہ شافعی بن کر آئے ہیں وہیں رہ کر اس پر عمل کریں وہاں اس مذہب کے مشائخ و علماء و اساتذہ بہت موجود ہیں جب وہ ملیں گے تب یہ بات ان سے کہوں گا[1] ابھی تو

[1] بعد میں انھوں نے خط سے اطلاع دی ہے کہ وہ پھر حنفی ہو گئے ۱۲ منہ

انھوں نے دوسرے گذشتہ واقعات سے معافی چاہی ہے میں نے لکھدیا ہے کہ سب معاف ہے ؎

کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

الحمد للہ میرے دل میں کسی کی طرف سے کینہ کبھی نہیں ہوتا ہاں دوستانہ شکایت کبھی پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی قائم نہیں رہتی جلدی زائل ہو جاتی ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایسے مسائل میں جو ایک جگہ مطلق ہوں دوسری جگہ مقید ہوں جاہل واعظ ضرور غلطی کریگا اور اس کے امتحان کی آسان صورت یہ ہے کسی جاہل کے وعظ میں ایک عالم کو دو چار دفعہ پردہ میں بٹھلاؤ دو چار دفعہ کی اس لئے ضرورت ہے کہ ایک دفعہ تو غلطی سے محفوظ رہ جانا ممکن ہے مگر ہمیشہ محفوظ رہنا جاہل سے دشوار ہے دو چار دفعہ کے بعد ان عالم صاحب سے پوچھ لینا کہ اس نے کتنی غلطیاں کی ہیں ان شاء اللہ حقیقت معلوم ہو جائے گی اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ کام نااہل کو نہ دینا چاہیئے میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم سے غلطی نہیں ہوتی عالم بھی بشر ہے اس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے مگر وہ خفیف اور قلیل غلطی کرے گا شدید اور بکثرت غلطی نہ کرے گا یعنی اس کے بیان میں شاذ و نادر کبھی سو بار میں ایک بار غلطی ہو گی اور جاہل کے وعظ میں کثرت سے غلطیاں ہوں گی پھر عالم کو دوسرے وقت اپنی غلطی پر تنبہ ہو سکتا ہے اور وہ دوسرے بیان میں اس کی اصلاح بھی کر سکتا ہے اور جاہل کو تنبہ بھی نہیں ہوتا کہ میں نے کیا غلطی کی ہے اس لئے یہ اس سے اشد ہے خوب سمجھ لو صاحب آپ کو تجربہ نہیں اور مجھے تجربہ ہے جس کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ نااہل کو وعظ کی اجازت نہ دینا چاہیے۔ واللہ جہل کی وجہ سے بڑی خرابیاں ہو رہی ہیں۔ کانپور میں ایک شخص نے ایک ایسے بکرے کی قربانی کی جس کا کوئی عضو عیب سے خالی نہ تھا لوگوں نے اس سے کہا کہ اس کی قربانی جائز نہیں، تو وہ کہتا ہے وہ ہماری بی بی صاحبہ نے فتویٰ دیا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔ پھر اس نے بیوی سے جا کر کہا کہ لوگ تمہارے فتوی میں غلطی نکالتے ہیں۔ اس نے شرح وقایہ کا اردو ترجمہ پڑھا تھا اس میں مسئلہ کا موقعہ نکال کر باہر بھیجدیا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ تہائی عضو سے کم کٹا ہوا ہو تو قربانی جائز ہے اور اس بکرے کا کوئی عضو تہائی سے زائد نہیں کٹا بلکہ کم ہی ہے گو مجموعہ مل کر بہت زیادہ تھا" کچھ ٹھکانا ہے اس نامعقول حرکت کا کہ ایک عورت بھی شرح وقایہ کا ترجمہ پڑھ کر مفتی بن گئی۔ اب میں مکرر خلاصہ مقام کا عرض کرتا ہوں کہ آیت کا حاصل مدلول یہ ہوا کہ تحصیل علم کی بھی سخت ضرورت ہے اور عمل کی بھی۔ اس کے بعد حق تعالے

فرماتے ہیں۔ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۔ یہ سخت وعید ہے جس میں حق تعالیٰ صیغہ تعجب سے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو ہدایت و مغفرت کو اور بعنوان دیگر علم و عمل کو چھوڑ کر ضلالت و معصیت میں مبتلا ہیں جہنم میں جانے کیلئے کیسے دلیر اور کیسے بے باک ہیں لفظ اصبر کے اختیار کرلے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وعید صبر و ثبات علی المعصیۃ پر ہے یعنی گناہوں پر اصرار کرنا اور ان پر جما رہنا سبب وعید ہے ورنہ ایک بار گناہ کر کے پھر نادم ہو کر اس پر ثبات نہ کرنا اس وعید کا محل نہیں بلکہ توبہ کر لینے سے آئندہ و ماضی دونوں کی مغفرت ہو جاتی ہے سبحان اللہ حق تعالیٰ کے کلام میں کیسی بلاغت اور کتنی رعایت ہے کہ لفظ لفظ سے علم عظیم پیدا ہوتا ہے۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں وقت بہت ہو گیا بارہ بج چکے ہیں اتنی دیر بیان کا قصد نہ تھا میں نے اس وقت علم و عمل کی ضرورت پر بقدر ضرورت کافی تقریر کر دی ہے اور چندہ خاص کی کوئی ترغیب نہیں دی ہاں چندہ کے اصول بیان کر دیئے ہیں اور علماء کو چندہ خاص کی ترغیب سے منع کیا ہے البتہ کام کرنے کی صورت بتلا دی ہے کہ جو کام کریں اس کی ضرورت کو مسلمانوں پر ظاہر کر دیں اگر وہ ضرورت کو تسلیم کر لیں تو ان سے کہا جائے کہ اس کا انتظام کریں پھر چندہ وغیرہ وہ لوگ خود کریں گے علماء کو اس کی ضرورت نہیں اور ضرورت نہ سمجھیں تو کام کو بند کر دیں۔

اب مہتمم صاحب مدرسہ کچھ رپورٹ مدرسہ کی طرف سے سنائیں گے اس کو سننا چاہیئے منتشر نہ ہونا چاہیئے۔ اکثر عادت ہے کہ لوگ وعظ کے بعد منتشر ہو جاتے ہیں یہ اچھا طریقہ نہیں جس جلسہ میں آپ مدعو ہیں اس کی کارروائی پوری ہونے کے بعد جانا چاہیئے۔ لہٰذا سب صاحب مدرسہ کی رپورٹ سنیں۔ اور اگر مدرسہ کے قائم رہنے کی ضرورت سمجھ میں آجائے تو اس میں کوشش سے امداد کریں اور اگر اس کو فضول سمجھیں تو یہی ظاہر کر دیں تاکہ اس کے موافق عمل کیا جائے۔

والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

حرمات الحدود

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم اے جناح روڈ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وعظ مسمّٰی بہ

حرمات الحدود

اين	متى	كم	كيف	لم	ماذا	[illegible]	من ضبط	من استمع	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	[illegible]	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
[illegible]	[illegible]	۲ گھنٹہ	کھڑے ہو کر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	تقریباً ۴۰۰	

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ۚ وَ اتَّقُوا

اللہ ربکم لا تخرجوھن من بیوتھن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ وتلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ لا تدری لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراہ

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو زمانہ عدت سے پہلے طلاق دو اور عدت کو یاد رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے اور عدت میں ان مطلقہ عورتوں کو ان کے رہنے کے گھروں میں سے نہ نکالو اور وہ عورتیں خود نہ نکلیں مگر ہاں کھلی ہوئی بے حیائی کریں تو اور بات ہے یہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود ہیں جو شخص ان حدود خداوندی سے تجاوز کرے گا تو اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا تم کو معلوم نہیں شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دیں)

اس وقت جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے اس کے خاص حصہ سے مجھے مقصود کو مستنبط کرنا ہے اس مقصود کی تعیین عنقریب ہو جائے گی اس کا ضروری اور مہتم بالشان ہونا بھی معلوم ہو جائے گا جس مضمون کو میں نے اس وقت اختیار کیا ہے اس کا مجھے یہاں آنے سے پہلے خیال نہ تھا بلکہ یہاں آکر بھی از خود ذہن میں نہیں آیا میرے یہاں آنے کے بعد جب بیان کا تذکرہ ہوا تو میں سوچتا تھا کہ کیا بیان کروں کیونکہ عادتاً یہ ہے کہ بیان کے موافق موقع و مصلحت ہو کیفما اتفق (جیسا کہ اتفاق ہو) کسی مضمون سے بیان کر دینے کی عادت نہیں ہے اس لئے مجھ کو پریشانی تھی کہ اتفاقاً آج رات کو بعض احباب کے حفاظت حدود احکام کے متعلق تذکرہ ہوا انھوں نے یہ کہا تھا کہ ہم کو مسائل و احکام تو کتابوں سے معلوم ہو جاتے ہیں مگر احکام کی حدود معلوم نہیں ہوتیں اس لئے بعض دفعہ سخت خلجان ہوتا ہے اس کے ساتھ انھوں نے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اگر کوئی رسالہ اس مبحث پر لکھ دیا جائے جس میں ضروری احکام کے حدود بیان کر دیئے جائیں تو بہت اچھا ہو۔ اس وقت میں نے یہ جواب دیدیا تھا کہ احکام تو بہت ہیں جزئیات کا احصار بہت مشکل ہے اگر کوئی رسالہ لکھا گیا تو

اس میں خاص خاص جزئیات ہی سے بحث ہو گی اور ان کی تعیین بھی مجھے خود کرنا پڑے گی اس صورت میں ممکن ہے کہ بعض وہ جزئیات رہ جائیں جن کی حدود معلوم ہونے کی آپ کو ضرورت ہے تو وہ رسالہ بھی ناکافی ہوگا اس کی سہل صورت یہ ہے کہ آپ حضرات کو جن جن جزئیات کے حدود معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے آپ ان کو سوال کی صورت میں لکھ کر بھیجتے رہا کریں میں اس کا جواب لکھدیا کروں گا۔ اسی طرح بعض اور احباب سے کہا جائے کہ ان کو جو مسائل ایسے پیش آئیں جنکی حدود ان کو معلوم نہ ہوں وہ بھی ان کو قلم بند کر کے سوال کی صورت میں تھانہ بھون بھیجدیا کریں کچھ عرصہ میں ان جزئیات کا کافی ذخیرہ جمع ہو جائے گا پھر اس کو رسالہ کی صورت میں جمع کر دیا جائے گا۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا اور سوالات بھیجنے کا وعدہ کیا یہ تذکرہ تو ہو چکا لیکن میرے خیال میں اسی وقت یہ بات آئی کہ یہ مضمون واقعی بہت ضروری اور مہتم بالشان ہے کیونکہ آجکل مسلمانوں کی علمی اور عملی کوتاہیوں کا زیادہ تر سبب یہی ہے کہ ہم حدود کی رعایت نہیں کرتے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کو اس مضمون کی طرف رغبت بھی ہے اور حدود معلوم کرنے کے منتظر ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ مختصر طور پر اسی کا بیان آج کے وعظ میں ہو جائے۔ مختصر اس لئے کہا کہ یہ بیان اس وقت کلی ہوگا جزئی نہ ہوگا کیونکہ جزئیات کا احصار ہو نہیں سکتا بالخصوص ایک جلسہ میں لیکن میں نے یہ خیال کیا کہ مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ جس چیز کو پورا حاصل نہ کیا جا سکے اس کو بالکل چھوڑ دینا بھی مناسب نہیں جب یہ مضمون ضروری ہے تو جتنا ایک جلسہ میں مجھ سے بیان ہو سکتا ہے مجھے بیان کر دینا چاہیئے باقی تکمیل خود احباب کے ہاتھ میں ہے اگر وہ واقعات و جزئیات حادثہ سے سوال کریں گے تو اور بھی ذخیرہ تو جمع ہو جائے گا ورنہ یہ بیان ہی ضبط ہو کر اس بحث میں کام دے گا۔ پس ہر چند کہ یہ بیان مختصر ہو گا لیکن پھر بھی ان شاء اللہ کافی ہو جائے گا قواعد کلیہ پر تنبیہ ہو جانے سے بھی کسی درجہ میں کفایت ہو جائے گی ورنہ احصار تو کتب بیچ

سے اور صحبت اہل اللہ سے اور جزئیات میں غور کرنے سے ہوگا۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ جس کام کو ہم نیک سمجھتے ہیں اس میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جس کو بُرا سمجھتے ہیں اس کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ بس ہمارے ذہن میں یہ دو کلیے جمع ہوئے ہیں کہ نیک کام میں جتنا بڑھ سکیں بڑھنا چاہیئے اور بُرے کام کو جتنا چھوڑ سکیں چھوڑنا چاہیئے ہمارے نزدیک نہ نیک کام کے کرنے کی کوئی حد ہے نہ بُرے کام کے چھوڑنے کی مثلاً ہم نے یہ سمجھ لیا کہ خرچ کرنا اچھا کام ہے تو اب اس میں بڑھتے چلے جاتے ہیں نہ اسراف کا خیال ہے نہ اس کی فکر ہے کہ اہل وعیال کو اس سے پریشانی لاحق ہوگی نہ اس کا اندیشہ ہے کہ ہم مقروض ہو جائیں گے اور زمین وجائداد قرضہ میں نیلام ہو جائے گی ہمارے نزدیک صرف رنڈی بھڑووں میں خرچ کرنا ہی گناہ ہے اس کے سوا اور کسی موقعہ میں خرچ کرنا گناہ ہی نہیں۔ چنانچہ تفاخر کی نیت سے خرچ کرنے کو گناہ نہیں سمجھا جاتا حالانکہ حدیث میں اس کی صاف ممانعت ہے۔

نَهَىٰ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ الْمُتَبَارِيَيْنِ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بہ نیت تفاخر کھانا کھلانے والوں کے کھانے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ آجکل شادیوں کے موقعہ پر کھانا کھلایا جاتا ہے کہ اس میں اپنی آمدنی اور حیثیت کو بھی نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ تحقیق کی جاتی ہے کہ فلاں شخص نے اپنے بیٹے کی شادی میں کتنے کھانے پکائے تھے اور کتنے آدمیوں کو بلایا تھا پھر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ کھانے پکاتے جائیں اس سے زیادہ مجمع کیا جائے اگر زیادہ نہ ہو تو کم از کم اس کی برابر تو ہو تا کہ وہ ہم سے بڑھا ہوا نہ رہے یہ ہے طعام المتبارین جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ دعوت کھانے والے بھی اس کی پروا نہیں کرتے اور بے تکلف ہر دعوت کو قبول کر لیتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ داعی کی نیت کیا ہے نہ داعی کو اس کا خیال ہوتا ہے

کہ میری نیت درست ہے یا نہیں۔

رہا قرض وغیرہ اس کے لئے تو ہندی مثل مشہور ہے کہ چڑھ جا بیٹے سولی پر خدا بھلی کرے گا۔ بیدھڑک قرض لیتے ہیں اور یہ سوچ لیا ہے کہ اولاد بعد میں خود ادا کر دے گی ہمیں اس کی فکر کی ضرورت نہیں۔ صاحبو اگر آپ کے باپ دادا بھی یہی سمجھ لیتے تو آج آپ کو ان کی متروکہ جائداد میں یہ گلچھرے اڑانے کا موقعہ نہ ملتا نہ آپ کو اس ناموری کا وسوسہ آتا ساری جائیداد ان کے قرضہ میں نیلام ہو گئی ہوتی۔ پس افسوس ہے آپ کے باپ دادا نے تو اپنا خون پسینہ ایک کر کے یہ جائیداد آپ کی راحت و آسائش کے لئے چھوڑی تھی اور آپ ایسے ظالم نکلے کہ آپ کو اپنے اہل و عیال کی راحت کا ذرا خیال نہیں کہ وہ آپ کے بعد کیسے پریشان ہوں گے جبکہ ساری زمین و جائیداد قرضہ میں نیلام ہو جائے گی کیا اہل و عیال کا آپ پر کچھ بھی حق نہیں۔

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے ایک بار تشریف لے گئے وہ سخت بیمار تھے کہ اپنی زندگی سے مایوس تھے انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اپنے مال میں خدا کے لئے وصیت کرنا چاہتا ہوں کیا سارے مال کی وصیت کر دوں' آپؐ نے فرمایا نہیں کچھ اپنے اہل و عیال کے واسطے بھی تو چھوڑ دو۔ انھوں نے نصف مال کی وصیت کا قصد کیا آپ نے اس سے بھی منع کیا۔ پھر انھوں نے تہائی مال کی وصیت کرنا چاہی۔ آپ نے تہائی کی وصیت کی اجازت دی اور فرمایا تہائی بھی بہت ہے پھر فرمایا کہ اگر تم اپنے اہل و عیال کو خوش حال چھوڑ کر جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو خالی ہاتھ چھوڑ کر جاؤ کہ وہ دوسروں کے ہاتھ کو تکتے پھریں۔ دیکھئے آپؐ نے اللہ تعالےٰ کے واسطے بھی اس طرح وصیت کرنے سے منع فرمایا جس سے اہل و عیال کو تنگی پیش آئے۔ جب نیک کاموں میں خرچ کر کے بھی اہل و عیال کو تنگ کرنا جائز نہیں تو تفاخر اور ناموری میں خرچ کر کے ان کو پریشان کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

مگر ہم لوگوں کو اس کا مطلق خیال نہیں بیدھڑک خرچ کرتے ہیں قرض پر قرض چڑھائے چلے جاتے ہیں اور سارا بوجھ اولاد پر ڈال جاتے ہیں کہ بعض دفعہ ان کے پاس رہنے کو مکان بھی نہیں رہتا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے)

ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ میں ایک رئیس نے بڑی بڑھیا دعوت کی تھی جس میں ہزاروں آدمیوں کو مدعو کیا اور بھنگیوں چماروں کو بھی پلاؤ زردہ کھلایا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے ان کو حکیمانہ طور پر نصیحت کی کہ شیخ صاحب آپ نے اپنی ہمت سے بھی زیادہ کام کیا، ظاہر میں تو یہ تعریف تھی مگر حقیقت میں ان کی حماقت ظاہر کی تھی کہ تم نے اسراف سے کام لیا۔ اپنی رقم برباد کی۔ اور پھر یہ فرمایا کہ لیکن اس کا افسوس ہے کہ آپ نے اس کے عوض وہ چیز خریدی ہے کہ اگر کبھی ضرورت ہو تو کانی کوڑی کو بھی نہیں بک سکتی یعنی نام اور شہرت اور یہ بھی لوگوں کا خیال ہی ہے کہ بڑھیا دعوت سے تعریف ہوتی ہے صرف دو تین دن کچھ تذکرہ رہتا ہے اس کے بعد کوئی نام بھی نہیں لیتا بلکہ بعض دفعہ تو شروع میں بھی تعریف نہیں ہوتی کیونکہ آجکل لوگوں میں حسد کا مرض بہت ہے تعریف کون کرتا ہے بلکہ مذمت کے درپے رہتے ہیں۔ ایک شخص ہزاروں لاکھوں روپیہ پر پانی پھیر کر دعوت کرتا ہے اور کھانے والوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں ذرا سی بات میں کسر رہ گئی انھوں نے اس کو زبان پر لانا شروع کیا اس کا نام بھی کوئی نہیں لیتا کہ اس بیچارہ نے کتنی رقم خرچ کی ذرا کسی مہمان کو حقّہ ملنے میں دیر ہوگئی ہو یا پان کچھ دیر تک نہ ملا ہو بس وہ اسی کا رونا روتے رہتے ہیں تعریف کبھی نہیں کرتے۔

ایک بزرگ سے میں نے حکایت سُنی ہے کہ ایک بنئے نے اپنی بیٹی کی شادی میں بڑے زور کی دعوت کی تھی علاوہ انواع و اقسام کے کھانوں کے اس نے ہر باراتی کو ایک ایک اشرفی بھی تقسیم کی تھی۔ جب بارات رخصت ہوئی تو بنئے کو

خیال ہوا کہ آج ضرور سب باراتی میری تعریف کرتے جائیں گے راستہ میں چل کر سننا چاہیئے کیا کیا تعریفیں ہوتی ہیں چنانچہ وہ بارات کے راستہ میں جاکر چھپ کر بیٹھ گیا۔ بس یہ مقصود ہوتا ہے اسراف اور فضول خرچی سے کہ چند باتیں سُنکر جی خوش کریں۔

ع آدمی فربہ شود از راہ گوش (آدمی موٹا ہوتا ہے تعریف سُننے سے)

مگر افسوس ان لوگوں کو یہ بھی نصیب نہیں ہوتا چنانچہ بہلیاں گذرنا شروع ہوئیں تو وہاں سناٹا تھا کسی نے بھی بنئے کی تعریف نہ کی، اسے بڑا غصہ آیا کہ یہ لوگ بڑے نمک حرام ہیں۔ میں نے تو اتنا خرچ کیا اور یہ ایک دو بات بھی میری تعریف میں نہیں کہتے۔ خیر خدا خدا کرکے ایک بہلی سے کچھ آواز آئی۔ ایک گاڑی بان دوسرے گاڑی بان سے کہہ رہا تھا کہ بھائی لالہ جی نے بڑے زور کی شادی کی کہ کھانا تو کھلایا ہی تھا ایک ایک اشرفی بھی دی، تو وہ دوسرا کہتا ہے کہ میاں کیا کیا سُسرے کے یہاں اشرفیوں کے صندوق بھرے پڑے ہیں دو دو ہی بانٹ دیتا تو اس کے گھر میں کیا کمی آجاتی، سُسرے نے ایک ہی اشرفی دی لیجیئے یہ تعریف ہوئی لالہ جی کو بھی حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی کہ ایک تو میں نے روپیہ خرچ کیا اور پھر سے گاڑی بان بھی میری بیٹ کو سنگولنے لگا غرض اتنا خرچ کرنے پر بھی لوگوں نے عیب ہی نکالا اور کچھ نہ سہی یہی عیب نکال دیا کہ اس سے زیادہ کیوں نہ کیا اور واقعی یہ عیب تو ایسا ہے کہ ہر شخص میں نکل سکتا ہے کہ اتنا ہی کیوں کیا اس سے زیادہ کیوں نہ کیا کیونکہ زیادہ کی کہیں حد ہی نہیں۔ پس لوگوں کا محض گمان ہی گمان ہے کہ ان فضول خرچیوں سے ہمارا نام ہوتا ہے۔ چند خوشامدیوں کی باتوں سے وہ سب کو ایسا ہی سمجھتے ہیں تحقیق کے بعد معلوم ہوسکتا ہے کہ تعریف کرنے والے کتنے ہیں اور عیب نکالنے والے کتنے۔ پھر اگر تعریف ہوئی بھی تو تم کو کیا مل گیا۔ تعریف کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ہوا ہے جو منہ سے نکلتی ہے اور بس اس کے لئے روپیہ برباد کرنا سراسر حماقت ہے۔ خصوصاً ایسے لوگوں کو کھلانا جو وقت پر کام بھی نہ آویں کیونکہ

باراتوں میں اکثر ایسے لوگ آتے ہیں جن کی صورت سے بھی آپ آشنا نہیں ہوتے اور پہلے تو کیا تو کیا آشنا ہوتے بارات آنے کے بعد بھی آپ کو خبر نہیں ہوتی کہ کون کون آیا ہے ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ وقت پر آپ سے آنکھیں چرالیں گے مگر باوجود ان سب باتوں کے آجکل مسلمانوں کا روپیہ اس حماقت میں بہت برباد ہو رہا ہے۔ پھر افسوس یہ ہے کہ گناہ کرتے ہیں اور اس کو گناہ نہیں سمجھتے ان کو اس کا وہم بھی نہیں ہوتا کہ تفاخر میں خرچ کرنا گناہ ہے حالانکہ یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کا گناہ ہونا ظاہر ہے کیونکہ تفاخر کا منشا کبر ہے کہ ہمارا نام ہوگا ہم بڑے آدمی سمجھے جائیں گے اور کبر ایسا گناہ ہے کہ اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں تمام گناہوں کی جڑ یہی تکبر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

علت ابلیس انا خیر بداست
ایں مرض در نفس ہر مخلوق ہست

(ابلیس کی علت یہی انانیت تو تھی اور یہ مرض ہر شخص کے اندر کم و بیش موجود ہے)
حدیث مسلم میں ہے۔ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ کِبْرٍ۔ جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ غرض ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے خرچ کرنے کو اچھا سمجھ لیا ہے تو اب خرچ کرتے چلے جاتے ہیں اسراف کی بھی پرواہ نہیں کرتے حالانکہ خرچ کی شریعت میں ایک حد ہے جس سے آگے بڑھنا اسراف ہے اور اسراف کی سخت ممانعت ہے بلکہ اس پر اتنی سخت وعید ہے کہ مسرف کو شیطان کا بھائی فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا۰
(تحقیق فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے)

اور اس میں راز وہی ہے جو میں نے ابھی بتلایا ہے کہ اسراف کا منشا تفاخر ہے اور تفاخر کا

منشاء کبر ہے اور تکبیر علت ابلیس ہے۔ شیطان کے مردود ہونے کا سبب یہی تھا کہ اس نے اپنے کو آدم علیہ السّلام سے افضل سمجھا اس لئے باوجود حکم خداوندی کے سجدۂ آدم سے انکار کیا یہ تو خرچ کرنے میں ہماری حالت ہے اس کے مقابل بعض لوگوں نے کفایت شعاری کا سبق پڑھا ہے، انھوں نے کسی سے یہ سن لیا تھا کہ کفایت شعاری اچھی چیز ہے۔ پس اب وہ ایسے کفایت شعار بنے کہ بالکل ہی ہاتھ روک لیا۔ بیوی بچوں کو تنگ رکھتے ہیں، ضروریات میں خرچ نہیں کرتے دین کے کاموں میں بھی خرچ نہ کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈھتے ہیں پیسہ پیسہ پر جان دیتے ہیں یہ بھی حد سے تجاوز ہے۔ شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو جب خدا دے تو خود بھی آرام سے رہے اور اہل وعیال کو بھی آرام سے رکھے مگر ہمارے کاموں کے کوئی اصول نہیں ہم جس کام کو اچھا سمجھتے ہیں اس کے ہر درجہ کو اور ہر موقعہ کو اچھا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غلطی ہے، خرچ کرنا مطلقاً اچھا نہیں بلکہ اچھا بھی ہے اور برا بھی اسی طرح خرچ نہ کرنا مطلقاً برا نہیں بلکہ برا بھی ہے اور اچھا بھی اب یہ سمجھنا کہ کس موقع پر خرچ کرنا اچھا ہے اور کس موقع پر اچھا نہیں اور کتنا خرچ کرنا چاہیئے کتنا نہ چاہیئے یہی رعایت حدود ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ نہ اپنے ہاتھ کو گردن سے باندھ لو (کچھ خرچ ہی نہ کرو) اور نہ پوری طرح کھول دو پھر تم نشانہ ملامت ہو جاؤ گے (یعنی بخل کی صورت میں) اور مفلس کنگال ہو جاؤ گے (اسراف کی صورت میں) دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا

اور (وہ نیک بندے) جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ نہ انفاق مطلقاً محمود ہے نہ اقتار بلکہ دونوں میں اعتدال مطلوب ہے جس کی تفصیل فقہاء کے کلام میں ملتی ہے۔ فضول خرچی یہ ہے کہ معصیت میں خرچ کیا جائے

س میں صرف رنڈی بھڑوؤں میں خرچ کرنا ہی داخل نہیں بلکہ تفاخر اور ناموری کے لئے خرچ کرنا بھی معصیت کی فرد ہے اسی طرح مباحات میں بلا ضرورت اپنی استطاعت سے زیادہ خرچ کرنا بھی اسراف میں داخل ہے اسی طرح طاعات ضروریہ غیر میں بھی استطاعت سے زیادہ صرف کرنا جس کا انجام اخیر میں بے صبری اور حرص و بدنیتی ہو یہ بھی اسراف ہے کیونکہ حرص و بدنیتی اور بے صبری یہ امور معصیت ہیں اور اس کا سبب ہوا استطاعت سے زیادہ صرف کرنا اور مُفْضِیْ اِلَی الْمَعْصِیَت (گناہ کی طرف پہونچانے والا) بھی معصیت ہوتا ہے لہذا یہ انفاق معصیت ہوا۔ خلاصہ یہ کہ معصیت میں خرچ کرنا تو مطلقاً اسراف ہے اور طاعات میں استطاعت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے خوب سمجھ لو اور اقطار کی حقیقت یہ ہے کہ طاعات ضروریہ میں بالکل خرچ نہ کیا جائے یا حکم شرعی سے کم ادا کیا جائے۔ اسی طرح مستحبات و مباحات میں اتنی تنگی کی جائے جس سے اپنے کو یا اہل و عیال کو تکلیف ہو یہ بھی ناجائز ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خستہ حالی کے ساتھ آیا آپ کو اس کی حالت دیکھ کر رنج ہوا بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو خوش حال آدمی ہے تو آپ نے فرمایا لِیُرَ اَثَرُ النِّعْمَةِ عَلَیْكَ (اوکما قال) یعنی خدا کی نعمت کا اثر تمہارے اوپر ظاہر ہونا چاہیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مباحات میں اتنی تنگی کرنا جس سے دوسروں کو یہ گمان ہو کہ اس کے پاس کچھ نہیں بیچارہ پر فاقے گذرتے ہوں گے ناجائز ہے کیونکہ اس میں نعمت الٰہی کی ناشکری ہے نیز خوا مخواہ اپنے کو بلا وجہ نظروں میں ذلیل کرنا ہے اور جو کوئی ذلیل بھی نہ سمجھے تو اس کا دل دکھے گا بلا وجہ مسلمانوں کا دل دکھانا بھی بُرا ہے۔ صاحبو اس تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ شریعت نے جو ہر کام کی حدود مقرر کی ہیں اس سے مقصود یہ ہے کہ آپ راحت کے ساتھ زندگی بسر کریں تکلیف نہ برداشت کریں اس لئے اتنا خرچ کرنے کی بھی ممانعت ہے جس کا انجام کلفت ہو۔ اور اتنی کفایت شعاری کی بھی ممانعت ہے جس سے اپنے کو یا اہل و عیال کو تکلیف ہو۔ افسوس اب بھی لوگ شریعت کی قدر نہیں

کرتے غرض خرچ کی بھی ایک حد ہے۔ اور کفایت شعاری کی بھی ایک حد ہے ان حدود سے باہر قدم رکھنا ہمیشہ موجب کلفت ہے اور گناہ ہو اوہ الگ۔ یہ تو خرچ کے متعلق ہماری حالت تھی اب دوسری باتوں کو بھی دیکھ لیجئے اگر کسی نے بولنے کو اچھا سمجھا ہے تو اس کے بولنے کی کوئی حد نہیں جب باتیں کرنے پہ آویں گے تو گھنٹوں بولتے چلے جاویں گے نہ غیبت کی پرواہے نہ شکایت کی نہ اس کا خیال ہے کہ ہمارے منہ سے بعض باتیں بے تحقیق نکل رہی ہیں نہ اس کا خیال ہے کہ بعض باتوں میں ہم خود اپنی مدح کر رہے ہے اگر ترک کلام کو اختیار کیا تو بس گم صُم بنے بیٹھے ہیں اگر کسی سے بات بھی کریں گے تو ادھوری اس کی پرواہ ہی نہیں کہ بات گول مول رہی جاتی ہے جس سے دوسرے کو تکلیف ہوگی۔ اگر کسی نے کھانے کو اچھا سمجھا تو وہ ہر وقت کھانے ہی کی فکر میں ہے۔ لذائذ اور عمدہ غذاؤں میں منہمک ہے اس کی پرواہ نہیں کہ یہ حلال ذریعہ سے حاصل ہوا یا حرام طریقہ سے بس جو آیا کھانے سے کام ہے۔ کوئی دو وقت کھاتا ہے تو یہ حضرت چار وقت پر بھی بس نہیں کرتے چاہے ہضم ہو یا نہ ہو ان کا کلا ہر وقت چلنا چاہیئے اور اگر تقلیل غذا کو اچھا سمجھا تو اس میں حد سے بڑھ گئے دو وقت کی جگہ ایک ہی وقت کھانے لگے چاہے دماغ خشک ہو جائے بدن میں ضعف ہو جائے مگر یہ ایک وقت سے زیادہ کھانا جانتے ہی نہیں پھر اسی پر بس نہیں بلکہ لوگوں کی برائی کرتے ہیں جو اعتدال کے ساتھ دو وقت کھانا کھاتے ہیں۔ جب بیٹھیں گے کم کھانے کے فضائل بیان کریں گے جس میں در پردہ اپنی تعریف مقصود ہوگی بس ہمارا یہ حال ہے ؎

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی　　　چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

(جب بھوکا ہوتا ہے تو کتے کی طرح حریص ہوتا ہے اور جب کھانے کو ملتا ہے تو تند و بدرگ ہوتا ہے)

غرض ہمارے کسی کام کی بھی حد مقرر نہیں جو کام ہے حد سے باہر ہے صاحبو نماز سے بہتر کیا چیز ہے اگر حدود نہ ہوں تو اس کی کوئی حد نہ ہونی چاہیے تھی بس یہ حکم دیدیا جاتا کہ جتنی چاہو نماز پڑھتے رہو اور جب چاہو پڑھ لو۔ حالانکہ ایسا نہیں چنانچہ طلوع فجر کے بعد سے فرض ادا ہونے تک دو سنتوں سے زیادہ نفل نماز مکروہ ہے۔

اور فجر و عصر کے فرضوں کے بعد بھی طلوع و غروب تک نفلیں مکروہ ہیں اور عین طلوع و غروب و استوار کے وقت تو کوئی نماز بھی جائز نہیں نہ فرض نہ نفل بجز اسی دن کے عصر کے اور وہ بھی کراہت کے ساتھ پھر ہر نماز فرض کا وقت مقرر ہے یہ نہیں کہ ظہر کی نماز عصر کے وقت پڑھ لو عصر کی مغرب کے وقت اسی طرح روزہ کیسی عمدہ عبادت ہے مگر اس کے واسطے بھی حدود ہیں یہ نہیں کہ جب چاہو روزہ رکھ لو سال بھر میں بعض ایام ایسے بھی ہیں جن میں روزہ رکھنا حرام ہے یعنی عید کے دن اور بقرعید کے دن اور ایام تشریق میں روزہ مکروہ تحریمی ہے۔ حج کیسی اچھی عبادت ہے مگر اس کے واسطے بھی حدود ہیں عرفات میں جانے کا خاص دن مقرر ہے، منیٰ میں آنے کا خاص دن معین ہے ان تاریخوں کے بغیر حج نہیں ہوسکتا اگر یہ حدود نہ ہوتے تو جب چاہتے حج کر لیتے مگر اب اگر عرفات کا دن نکل جائے تو سال بھر تک حج نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح احرام باندھنے کے مہینے مقرر ہیں۔ اشہر حج سے تقدیم احرام مکروہ ہے اشہر حج شوال سے شروع ہوتے ہیں گو ان سب میں حج نہیں ہوتا حج صرف ذی الحجہ کی بعض تاریخوں میں ہوتا ہے۔ لیکن ان مہینوں میں احرام باندھنے کی اجازت ہے ان سے پہلے احرام باندھنا مکروہ ہے۔ پس یہ مہینے چونکہ محل احرام ہیں اور احرام شرط حج ہے۔ اس لئے ان سب کو اشہر حج کہا جاتا ہے۔ غور کیجئے ان اعمال سے بڑھ کر کونسا عمل ہوگا مگر ان سب کے لئے حدود ہیں۔ اسی طرح معاملات کو دیکھ لیا جائے ان میں بھی حدود ہیں نکاح کی بھی ایک حد ہے کہ چار بیبیوں سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ اسی طرح ہر عورت سے نکاح جائز نہیں بلکہ بعض حلال ہیں بعض حرام بہت سی عورتیں نسب کی وجہ سے حرام ہیں بعض رضاع کی وجہ سے بعض مصاہرت کی وجہ سے۔ بیع و شرار کے لئے بھی حدود ہیں بعض صورتیں ربوا میں داخل ہیں بعض صورتیں بیوع فاسدہ ہیں بعض صورتیں بیوع باطلہ ہیں۔

حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا احکام کو ذکر فرما کر اکثر موقعہ پر تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰہِ (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں) فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ تمام احکام شرعیہ حدود ہی ہیں چنانچہ روزہ کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا ہے۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں۔ ان کے پاس بھی نہ جاؤ) طلاق کے مسائل کے بعد فرمایا ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں پس ان سے تجاوز نہ کرو) گویا تمام شریعت میں حدود ہی حدود ہیں ان کو محل سمجھنا کتنی بڑی غلطی ہے مگر آجکل اسمیں ابتلاء عام ہو رہا ہے لوگ عام طور پر کاموں میں حدود کی رعایت نہیں کرتے اس لئے ضرورت ہے کہ اس مبحث پر قدرے گفتگو کی جائے۔ اور احکام کی حدود سے لوگوں کو مطلع کیا جائے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی جس کو میں نے ابھی تلاوت کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے بعض احکام بیان فرما کر تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰہِ (یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود ہیں) فرمایا ہے مجھے اس آیت میں اخیر کا حصہ مقصود ہے پہلا حصہ مقصود نہیں شاید آپ کو پوری آیت سن کر تعجب ہوا ہوگا کہ طلاق کے ذکر کو اس مقام سے کیا مناسبت۔ مگر میں نے پوری آیت کو تبرکاً پڑھ دیا ہے مقصود اخیر کا حصہ ہے کیونکہ اس میں رعایت حدود کی تاکید مخصوص طور پر مذکور ہے جو دوسرے مقام پر نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس جگہ اول طلاق کے احکام بیان فرمائے ہیں اس کے بعد ارشاد ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰہِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ط یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں اور جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ ظلم اخروی تو ظاہر ہے کہ تعدی حدود سے گناہ ہوتا ہے جس کا نتیجہ آخرت میں بہت سخت ہے تو یہ شخص اپنے ہاتھوں مصیبت آخرت کو خریدتا ہے مگر تعدی حدود میں اپنے نفس پر ظلم دنیوی بھی ہے کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ان حدود کے مقرر کرنے سے یہ بھی مقصود ہے کہ لوگ راحت سے زندگی بسر کریں تو ان سے تعدی کرنے میں دنیوی پریشانی بھی ضرور لاحق ہوتی ہے۔ لہذا اس میں اپنے نفس پر ظلم دنیوی بھی ہے۔ آگے فرماتے ہیں

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا٭ تم نہیں جانتے ممکن ہے حق تعالےٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دیں۔ یہ حکمت ہے ان حدود کی جو طلاق کے متعلق اس جگہ ذکر کئے گئے ہیں اور یہی وہ مضمون ہے جو اس مقام میں خاص طور پر مذکور ہے۔ دوسرے مقام پر مذکور نہیں لَا تَدْرِیْ (تم نہیں جانتے) میں خطاب بظاہر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن حقیقت میں خطاب امت کو ہے جیسے یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو) میں اول ندا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور آگے طلقتم صیغہ جمع کا ہے جس کے مخاطب سب ہیں اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ امت اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایسا تعلق ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ندا کرنا گویا امت کو ندا کرنا ہے۔ اسی طرح لَا تَدْرِیْ (تم نہیں جانتے) میں گو خطاب بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن واقع میں یہ خطاب عام ہے اور اس میں بھی وہی نکتہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور امت میں ایسا تعلق ہے کہ نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کو خطاب کرنا گویا امت کو خطاب کرنا ہے۔ الغرض لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا٭ (تم نہیں جانتے ممکن کہ حق تعالےٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دیں) میں ایک حکمت کی طرف اشارہ ہے اور گو حق تعالےٰ کے ذمہ حکمت کا بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ ہمارے میں اور حق تعالےٰ میں حاکم و محکوم کا علاقہ ہے۔ برابری کا علاقہ نہیں اور حکمت بیان کرنا دوستوں اور بھائیوں میں مناسب ہوتا ہے کیونکہ وہاں حکومت نہیں ہے۔ پس دوستوں اور بھائیوں سے جب کوئی کام لینا ہو وہاں احکام کی حکمت بتلانا ضروری ہے لیکن حکام وقت اپنے احکام میں حکمتیں نہیں بیان کیا کرتے وہ اپنی حکومت کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو حکمتیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں بس جو نہ مانے گا مجرم ہوگا اور سزا بھگتے گا۔

اسی قاعدہ پر حق تعالےٰ کے ذمہ بھی حکمتیں بیان کرنا نہیں ہے۔ لیکن ان کی رحمت نہایت درجہ ہے وہ چاہتے ہیں کہ سامعین کی اصلاح ہو ہی جاوے۔ کیونکہ

بعضے ایسے بھی ہیں جو بدون حکمت کے دل سے احکام کو نہ مانیں گے اس لئے کہیں کہیں انھوں نے احکام کی حکمت بھی بیان کردی ہے مگر بعض جگہ نہیں بھی بیان کی تاکہ سامعین کو حکمت معلوم کرنے کی عادت نہ ہوجاوے اور کسی جگہ حکمت غامض ہوتی ہے جس کو ہر شخص نہ سمجھ سکے گا اور عادت پڑ گئی ہے حکمت سن کر عمل کرنے کی تو وہ عمل بھی نہ کرے گا اور گنہگار ہوگا اس لئے خدا تعالےٰ نے تو ہر جگہ حکمت بیان کی نہ یہ کہ کہیں بھی ذکر نہ ہو۔

اب پوری آیت کی تفسیر سنئے اس سے اس حکمت کی حقیقت واضح ہوجائیگی حق تعالےٰ فرماتے ہیں یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں سے کہدیجئے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو زمانہ عدت سے پہلے طلاق دو یہاں سب کے نزدیک حسب روایت لِعِدَّتِهِنَّ کے معنی فِیْ قُبُلِ عِدَّتِهِنَّ (ان کی عدت سے پہلے) ہیں پھر قبل کے معنے میں حنفیہ و شافعیہ کا اختلاف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک عدت حیض سے شمار ہوتی ہے تو ان کے نزدیک قُبُل کے معنے استقبال و آمد کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ حیض آنے سے پہلے یعنی طہر میں طلاق دو۔ اور شافعیہ کے نزدیک عدت طہر سے ہے ان کے نزدیک قُبُل کے معنی ابتدار کے ہیں یعنی زمانہ عدت کے شروع میں طلاق دو۔ اس کا حاصل بھی وہی ہوا کہ طلاق طہر میں ہونی چاہیئے لیکن جس طہر میں طلاق دی جائے گی حنفیہ کے نزدیک وہ عدت میں شمار نہ ہوگا۔ بلکہ عدت حیض سے شمار ہوگی اور شافعیہ کے نزدیک وہ عدت طہر بھی عدت میں شمار ہوگا ۔ کتب اصول میں فریقین کے دلائل مذکور ہیں اس وقت میں ان کو بیان کرنا نہیں چاہتا۔ آگے فرماتے ہیں وَاَحْصُوا الْعِدَّۃَ یعنی طلاق دینے کے بعد تم عدت کو یاد رکھو وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ جو تمہارا رب ہے یعنی طلاق کے متعلق جو خدا کے احکام ہیں ان کے خلاف نہ کرو۔ مثلاً یہ کہ حدیث میں تین طلاق دفعۃً دینے کی ممانعت ہے تو ایسا نہ کرو اور حیض میں طلاق مت دو وغیرہ وغیرہ۔

اور ایک حکم آگے مذکور ہے لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ یعنی عدت میں ان مطلقہ عورتوں کو ان رہنے کے گھروں سے گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے مثلاً بدکاری یا سرقہ کی مرتکب ہوں اس صورت میں سزا کے لئے گھر سے نکالی جاویں۔ یا بقول بعض علماء کے وہ زبان درازی اور ہر وقت کا رنج و تکرار رکھتی ہوں تو ان کو نکال دینا اور باپ کے گھر بھیج دینا جائز ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ یہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود ہیں اور جو شخص حدود خداوندی سے تجاوز کرے گا (مثلاً تین طلاقیں دفعۃً دیدیں یا طلاق کے بعد عورت کو گھر سے نکال دیا) تو اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا (یعنی گنہگار ہوا آگے طلاق دینے والے کو ترغیب دیتے ہیں کہ طلاق میں رجعی بہتر ہے طلاق مغلظہ نہ دینی چاہیئے فرماتے ہیں) لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا اے طلاق دینے والے تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالے اس طلاق کے بعد کوئی نئی بات تیرے دل میں پیدا کر دیں مثلاً طلاق پر ندامت ہو تو رجعی طلاق میں اس کا تدارک تو ہو سکے گا۔

مفسرین نے لَا تَدْرِيْ الخ کی توجیہ میں اختلاف کیا ہے بعض نے یہ کہا ہے کہ ایک طلاق دینی چاہیئے تین نہ دینی چاہئیں۔ اور ایک توجیہ یہ ہے کہ تین دفعۃً مت دو۔ اگر تین ہی دینی ہوں تو ایک طہر میں ایک طلاق پھر دوسرے طہر میں دوسری طلاق متفرقاً دینی چاہئیں۔ مجھے سب توجیہوں کا بیان کرنا مقصود نہیں صرف یہ بتلانا ہے کہ اس جگہ طلاق کی حد مذکور ہے کہ ایک وقت میں ایک دینی چاہیئے ایک دم سے تین نہ دینی چاہئیں اور اس کی حکمت یہ بتلائی ہے کہ تم کو کیا معلوم ہے کہ اس کے بعد تمہارے دل میں کیا بات پیدا ہو تو ایک طلاق دینے میں یا تین متفرقاً دینے میں مصالح و منافع کی رعایت ہے اور تین دفعۃً دینے میں معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے پھر اگر ندامت ہو تو سوائے حسرت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ آجکل لوگوں کو تین طلاقیں دینے کا

بہت شوق ہے بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ایک یا دو سے طلاق ہی نہیں ہوتی اس کا منشا جہل بالاحکام ہے اور بعض جانتے ہیں کہ ایک یا دو سے بھی طلاق ہو جاتی ہے مگر وہ تین اس واسطے دیتے ہیں کہ عورت اس سے مری رہے گی۔ صاحبو! نکاح تو ایک طلاق سے بھی مرجاتا ہے ہاں اس صورت میں سسک سسک کر مرتا ہے کہ عدت کے بعد ٹوٹتا ہے اور تین میں اسی وقت مرجاتا ہے تو بعض لوگ عورت کو ستانے کے لئے تین طلاق دیتے ہیں کہ اس کو رجعت کی امید کیوں دلائی اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ایک طلاق کے بعد کہیں ہماری ہی رائے نہ بدل جائے اور اس کا رکھنا منظور نہیں اس لئے تین ہی دیدیتے ہیں۔ ان کی حالت بہت افسوسناک ہے کہ خدا نے ان کو عقل اور سمجھ دی تھی مگر یہ اس سے کام نہیں لیتے ان سے کوئی پوچھے کہ اگر بعد میں تمہاری رائے بدل گئی اور اس کو اپنے پاس رکھنا چاہا تو اس کی گنجائش رکھنے میں تمہارا کیا حرج ہے عقل کی بات تو یہ ہے کہ انسان جب کوئی کام کرے تو اس کے تمام پہلوؤں کی رعایت کرے خصوصاً اکثر غصہ میں ہوا کرتی ہے اس میں گنجائش رکھنا اور سمجھ کر کام کرنا بہت ہی ضروری ہے کیونکہ بعض دفعہ عورت سے محبت ہوتی ہے لیکن اتفاقاً ناگواری پیش آگئی ایسی حالت میں تین طلاق دینا اپنے کو سخت پریشان کرنا ہے۔ جب دل میں اس کی محبت ہے تو جدائی میں کلفت ہوگی۔ اور اگر ہمت سے کام لیا تو ارتکاب حرام کا بھی اندیشہ ہے۔ بعض دفعہ عورت سے محبت نہیں ہوتی مگر اس سے اولاد ہو چکی ہے تین طلاق دینے کے بعد جب اولاد کی ویرانی اور پریشانی کا خیال ہوتا ہے تو سوائے حسرت وندامت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اگر اولاد کو اس سے جدا کیا جائے تو مرد سے ان کی تربیت اور دیکھ بھال دشوار ہے اگر جدا نہ کیا جائے اسی کے پاس رکھا جائے تو اولاد کو ماں سے زیادہ ہمدردی ہوگی، باپ کی خاک بھی وقعت ان کے دلوں میں نہ ہوگی۔ بلکہ اس کو اپنا دشمن سمجھیں گے کہ اس نے ہماری ماں کو گھر سے نکال دیا۔

بعض دفعہ طلاق کے بعد اس شخص کو دوسری بیوی نہیں ملتی اور طلاق دینے والوں کو اکثر نہیں ملتی، خاندان میں بدنام ہو جاتا ہے کہ اس کو کون لڑکی دے یہ تو ظالم ہے طلاق دیدیتا ہے پھر یا تو صبر سے کام لینا پڑتا ہے اور ایسے بہت کم ہیں یا رنڈیوں اور لڑکوں سے خراب خستہ ہوتے ہیں جس میں دنیا کی بھی ذلت آخرت کی بھی بربادی اور گھر تباہ ہوا وہ الگ کیونکہ عورت کے بغیر گھر کا انتظام نہیں ہوسکتا تجربہ کر لیا جائے۔ ان واقعات کی بنا پر شریعت نے طلاق کے لیے بہت حدود مقرر کی ہیں۔ اول تو یہ حکم ہے کہ طلاق کو جہاں تک ٹال سکو ٹالو۔ دوسری تدبیروں سے کام لو طلاق مت دو چنانچہ فقہی مسئلہ ہے اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ عِنْدَ اللّٰہِ الطَّلَاقُ (مباحات میں مبغوض تر اللہ کے نزدیک طلاق ہے)

(اور یہ مضمون ایک حدیث کا بھی ہے جس کا مرسل ہونا صحیح ہے اور رفع ضعیف ہے کذا فی المقاصد الحسنۃ للسخاوی ۱۲ جامع) (جیسا کہ سخاوی کی کتاب مقاصد حسنہ میں مذکور ہے)

نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ۔

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر (قدرتی) فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال (عورتوں پر) خرچ کیے ہیں (اس میں بتلا دیا گیا کہ عورتیں تمہارے قبضہ میں ہیں ان کی اصلاح کچھ مشکل نہیں، طلاق کی کیا ضرورت ہے۔ اول تو خدا نے تم کو قدرتی طور پر عورتوں کا حاکم بنایا ہے، دوسرے تم ان پر مالی احسانات کرتے ہو) تو جو عورتیں نیک اور لائق ہیں وہ تو مردوں کے ان فضائل و احسانات ہی کی وجہ سے ان کی) اطاعت کرتی ہیں اور مرد کی عدم موجودگی میں بھی بحفاظت و توفیق الٰہی (اس کی آبرو اور مال کی) نگہداشت کرتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر تم دو باتوں کی رعایت کرو تو شائستہ اور نیک عورتیں تو فوراً تمہاری تابعدار ہو جائیں گی ایک یہ کہ تم حاکم بن کر رہو، برابری اور غلامی کے ساتھ نہ رہو۔ کیونکہ جو شخص ابتدا میں عورتوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتا ہے یا ان کی غلامی اختیار کرتا ہے تو پھر وہ ساری عمر اسی برتاؤ کی منتظر رہتی ہیں لہذا تم کو اول ہی سے ایسا برتاؤ کرنا چاہیے جیسا کہ حاکم محکوم سے کرتا ہے۔

دوسرے تم ان کے ساتھ مالی احسانات کرو مثلاً مہر کی ادائیگی میں جلدی کرو۔ نفقہ اور کپڑے میں تنگی نہ کرو۔ ان کی دلداری اور دلجوئی کا خیال رکھو اس برتاؤ کی خاصیت ہے کہ شریفوں کے دل کو مسخر کر لیتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی بدطینت عورت ہو وہ ممکن ہے کہ اس برتاؤ سے مسخر نہ ہو اس کے لئے آگے دوسرے تدبیر بتلاتے ہیں کہ اگر کوئی عورت بددماغ ہی ہو تو اس کو بھی طلاق دینے کی ضرورت نہیں بلکہ حکمت اور تدبیر سے کام لو۔ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو (قرائن سے) ان کی بددماغی کا احتمال (قوی) ہو (محض گمان اور خیال ہی نہ ہو) تو ان کو (اول) زبانی نصیحت کرو اور اگر اس سے نہ مانیں تو) ان کو خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو اس کا بھی عورت پر بہت اثر ہوتا ہے) اور (اس سے بھی نہ مانیں تو) ان کو (اعتدال سے مارو (حدیث میں اس کی تفسیر آئی ہے ضَرْبًا غَیْرَ مُبَرِّحٍ کہ ایسا مارو جس سے ہڈی پر صدمہ نہ پہنچے، خون نہ نکلے سبحان اللہ کیسی حدود ہیں) فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان پر (زیادتی کرنے کے لئے) بہانہ (اور موقعہ) مت ڈھونڈو اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ؕ کیونکہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی رفعت وعظمت والے ہیں۔

یہ عجیب مراقبہ بتلایا گیا ہے یعنی اگر تم عورتوں پر زیادتی کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈو گے تو یہ سمجھ لو کہ تمہارے اوپر بھی ایک حاکم ہے وہ کون خدا تعالیٰ۔ ان کے حقوق اور علم وقدرت سب سے زیادہ ہیں۔ اگر وہ بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی برتاؤ

کرنے لگیں اور تم کو مجرم بنانے کے لئے تو بہانے ڈھونڈھنے کی بھی ضرورت نہیں واقعی جرائم بے انتہا ہیں تو تمہارا کہاں پتہ رہے۔ پس تم کو اپنے محکوموں کے ساتھ ہی برتاؤ کرنا چاہئیے جو حق تعالےٰ تمہارے ساتھ کرتے ہیں کہ باوجود تمہاری نافرمانی کے توبہ و استغفار کے بعد سب معاف کر دیتے ہیں۔ اور پچھلے گناہوں کا کچھ اثر نہیں رکھتے نیز چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو ویسے ہی معاف کرتے رہتے ہیں چنانچہ وضو اور نماز اور جماعت وغیرہ سے گناہ صغیرہ معاف ہوتے رہتے ہیں۔

اگر اس سے بھی کسی عورت کو تنبیہہ نہ ہو تو اس کے لئے کیا عجیب بات بیان فرماتے ہیں وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اس میں خطاب زوجین کو نہیں ہے بلکہ اوپر والے آدمیوں کو خطاب ہے کہ اگر قرآن سے تم کو ان دونوں میاں بی بی میں (ایسی) کشاکش کا اندیشہ ہو (جس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں) تو تم لوگ ایک ایسا آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی ایسا ہی عورت کے خاندان سے (تجویز کر کے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس بھیجو (کہ وہ جا کر تحقیق حال کریں اور جو بے راہی پر ہو اس کو سمجھا دیں) دیکھئے یہ کیسی اچھی ترکیب ہے کہ جب تک زوجین اپنے معاملہ کو خود سلجھا سکیں اس وقت تک خود سلجھانے کی کوشش کریں۔ اور جب ان سے نہ سلجھ سکے تو کسی کو حکم مقرر کریں کیونکہ اپنا معاملہ فریقین سے طے نہیں ہو سکتا اس لئے پنچ کی ضرورت ہوئی۔

آگے حق تعالےٰ ان پنچوں کی بابت ارشاد فرماتے ہیں اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ (ان ان دونوں پنچوں میں اصلاح منظور ہو گی تو اللہ تعالیٰ ان دونوں زن و شوہر کو اصلاح کی توفیق دیدیں گے) اس میں اپنی اعانت کا وعدہ ہے کہ اس صورت میں ہم بھی معاملہ کے سلجھنے میں امداد کریں گے۔ مگر اس کے لئے ایک شرط ہے وہ یہ کہ اگر ان دونوں پنچوں کو (سچے دل سے) اصلاح معاملہ منظور ہو گی تو اللہ تعالیٰ اُن میاں بی بی میں اتفاق پیدا کر دیں گے (بشرطیکہ وہ اُن دونوں کی رائے پر بھی عمل کریں) اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں۔ یعنی جس طریق سے

زوجین میں باہم مصالحت ہو سکتی ہے اس کو وہ خوب جانتے ہیں پس جب حکمین کی نیت ٹھیک دیکھیں گے وہ طریق ان کے قلب میں القا فرمادیں گے۔ دیکھئے حق تعالٰی نے طلاق سے بچنے کی کتنی عمدہ ترکیبیں بتلائی ہیں اگر لوگ ان طریقوں سے کام لیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی طلاق کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور اگر بدون طلاق کے چارہ ہی نہ رہے تو اس کے لئے یہ تعلیم ہے کہ اول ایک طلاق دو اس سے عورت کا ناز ٹوٹ جائے گا اور اگر اس میں کچھ بھی صلاحیت ہوگی تو وہ سنور جائے گی شریعت نے نہ تو طلاق سے ممانعت کی کہ چاہے باہم کیسا ہی اختلاف ہو طلاق دے ہی نہ سکے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو شوہر ہمیشہ اندر ہی اندر گھٹا کرتا اپنے غصہ کا بھڑاس نہ نکال سکتا۔ اس لئے غصہ نکالنے کی اجازت دی کہ ضرورت کے وقت طلاق دے سکتے ہو۔ مگر حدود کے ساتھ شریعت میں جذبات کی بہت رعایت کی گئی ہے۔

چنانچہ ایک حدیث ہے لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال وغیرہ موقوف رکھے دیکھئے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ چاہے آپس میں کیسا ہی رنج و تکرار ہو بولنا مت چھوڑو حالانکہ شریعت کو یہ بھی اختیار تھا کہ ایسا حکم دیدیتی چنانچہ بعض مشائخ نے طالبین کی اصلاح کے لئے کبھی ایسا حکم دیا ہے مگر ایسی ہمت سالکین کو ہو سکتی ہے۔ ہر شخص کو نہیں ہو سکتی۔ رنج و تکرار کا طبعی تقاضا ہے کہ جس سے تکرار ہو اس کے ساتھ کلام نہ کیا جاوے۔ چونکہ احکام شرعیہ عام ہیں اس لئے اس جذبہ کی رعایت کر کے حکم دیا گیا کہ غصہ اور رنج میں بول چال چھوڑ دینا جائز ہے مگر اس کی حدود مقرر ہیں کہ تین دن سے زیادہ نہ ہونا چاہئے اس میں نکتہ یہ ہے کہ رنج و تکرار کے بعد فوراً سلام و کلام کرنے میں غصہ کو گھونٹنا پڑے گا اور غصہ کے گھونٹنے سے کینہ اور حقد پیدا ہو جاتا ہے اس لئے غصہ نکالنے کی اجازت دی گئی۔ کہ بول چال ترک کر سکتے ہو۔ مشائخ کو بھی ایسے موقعہ پر غصہ گھونٹنے کا حکم نہ دینا چاہئے بلکہ موقع اور حالت کو دیکھ کر حکم دینا چاہئے۔ اسی لئے شیخ بننا بڑا مشکل ہے غرض عام حکم یہ ہے کہ تین دن تک نہ بولنا جائز ہے اور تین دن سے زیادہ ترک کلام جائز نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر گذر جانے سے غصہ کم

ہو جاتا ہے۔ پھر رات گذر جانے سے اگلے دن طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے. بوجھ نہیں رہتا۔ پھر تیسرے دن غصہ بالکل جاتا رہتا ہے۔ اب شریعت ایسے وقت میں دونوں کو ملانا چاہتی ہے کہ ان کے دلوں پر غصہ کا بوجھ نہیں رہا۔ تجربہ ہے کہ تین دن کے بعد غصہ اور رنج کا طبعی اثر باقی نہیں رہتا ہاں اگر کوئی سوچ سوچ کر خود ہی رنج وغصہ کو تازہ کرنا چاہے تو اور بات ہے مگر یہ رنج وغصہ کسبی ہوگا طبعی اثر نہ ہوگا. شریعت نے طبعی تقاضہ کی رعایت کی ہے کیونکہ وہ اختیار سے باہر ہے، کسبی امور کی رعایت نہیں کی کیونکہ ان کا وجود وعدم اپنے اختیار میں ہے مگر یہ حدود اس رنج وغصہ میں ہیں جو دنیوی سبب سے ہو اور اگر دینی سبب سے ہو تو تین دن سے زیادہ بھی ترک کلام وسلام جائز ہے جب تک کہ وہ سبب باقی ہے۔ مثلاً نعوذ باللہ کوئی مرتد ہو گیا یا کوئی شخص فاسق وفاجر و زناکار ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ قطع تعلق کا منشا محض وہ معصیت ہی ہو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ قطع تعلق تو کرتے ہیں کسی دنیوی سبب سے مثلاً ان کو کسی سے کوئی ترک پہونچی ہے اس لئے بول چال قطع کرتے ہیں۔ مگر ان کا نفس مولوی ہے وہ اس کے لئے دینی سبب نکال لیتا ہے کہ میں نے تو اس شخص سے قطع تعلق اس لئے کیا ہے کہ یہ فاسق ہے یا مبتدع ہے۔ اس مرض میں آجکل مولوی زیادہ مبتلا ہیں کہ وہ دنیا کو دین بنا لیتے ہیں، مگر ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ان تاویلوں سے مخلوق کو دھوکہ دے سکتے ہیں مگر خدا کے یہاں یہ ترکیبیں اور حیلے نہیں چل سکتے۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام	در غلط اندازی تا ہر خاص وعام
کارہا باخلق آری جملہ راست	با خدا تدبیر و حیلہ کے رواست
کار او بار است باید داشتن	رایت اخلاص وصدق افراشتن
گر گہے اللہ در دوغے میعزنی	از برائے مسکہ دوغے میزنی

(میں نے فرض کیا کہ اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے بھی دیا مگر خدا تعالیٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے. مخلوق کے ساتھ تو تیرے سب کام درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر و حیلہ کب جائز ہے. حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست

رکھنے چاہئیں ۔ اخلاص اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیئے ۔کبھی کبھی جھوٹی اللہ کی ضرب لگاتا ہے مسکہ کے لئے چھاچھ بلوتا ہے)

ان مولویوں سے تو عوام ہی اچھے کہ وہ گناہ کر کے اس کو گناہ تو سمجھتے ہیں ،مگر یہ لوگ تو گناہ کرتے ہیں اور تاویل کر کے اس کو دین میں ٹھونسنا چاہتے ہیں ان پر گناہ معصیت کا بھی ہے اور تحریف دین کا بھی ۔

ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے بے نمازی آدمی سے نفرت آتی ہے ، سلام کرنے کو جی نہیں چاہتا ، میں نے کہا کہ تم اس وقت اپنے کو اسے سے افضل سمجھتے ہو یا نہیں ۔ اگر اپنے کو افضل سمجھتے ہو تو یہ نفرت شرعی نہیں بلکہ نفسانی ہے ۔کہنے لگے کہ ہاں میں اپنے کو افضل تو سمجھتا ہوں ۔ میں نے کہا بس یہی کسر ہے اس حالت میں تم اس سے بدتر ہو کیونکہ تکبر اور عجب سے بدتر کوئی گناہ نہیں ۔ وہ تو بے نمازی ہی ہے مگر بے نمازی اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھا کرتا ہے اور تم نمازی ہو کر اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں اور دوسرے مسلمان کو حقیر سمجھتے ہو تم اس سے بھی زیادہ ایک گناہ میں مبتلا ہو یہاں شاید کسی کو یہ سوال ہو کہ جب باوجود گناہ اور فسق و فجور کے ہم دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھیں گے تو پھر حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کیا چیز ہے ۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو ہم اپنے سے افضل بھی سمجھیں اور پھر اس سے بغض بھی رکھیں ۔ اس پر ہم کو غصہ بھی آوے اُس سے ترک تعلق بھی کریں ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو اپنی اولاد پر بھی کبھی غصہ آتا ہے یا نہیں اس وقت آپ کی کیا حالت ہوتی ہے ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اولاد پر غصہ کرتے کے وقت ان کے فعل سے نفرت بھی ہوتی ہے ، ان سے قطع تعلق بھی چند روز کے لئے کر لیا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ایک شفقت بھی دل میں ہوتی ہے ۔ اور وہ شفقت ہی ان سب افعال کا منشا ہوتی ہے جس کی علامت یہ ہے کہ اس کی بدحالی پر رنج و افسوس ہو کر رونا آتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ خدا کرے کسی طرح جلدی اس کی اصلاح ہو جائے ۔ نیز آپ غصے کے وقت اولاد کو حقیر و ذلیل بھی نہیں سمجھتے ۔ چنانچہ اگر کوئی دوسرا ان کو حقیر و ذلیل کرنے لگے تو آپ کو ناگوار ہوتا ہے ۔ پس اگر یہی شان عاصی پر غصہ کرنے کی ہو تو وہ بغض فی اللہ ہے

ورنہ نفسانی بغض ہے۔ ایک اشکال اس جگہ یہ ہوتا ہے کہ صاحب بے نمازی سے اپنے کو بدتر کیسے سمجھ لیں اور اس کو افضل کیسے سمجھیں جب خدا نے ہم کو ایک چیز دی ہے اور دوسرے کو نہیں دی۔ تو لامحالہ ہم دوسرے کو اس سے محروم دیکھ کر اپنے سے کم اور اپنے کو اس سے زیادہ سمجھیں گے۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے ایک شخص کو ہزاروں روپے دیئے ہیں اور دوسرے کو ایک بھی نہیں دیا تو اس صورت میں وہ ہزاروں والا اپنے کو مفلس سے کم اور مفلس کو اپنے سے زیادہ کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس اشکال کا جواب تو خود اشکال ہی کے اندر آ گیا۔ وہ یہ کہ جب یہ نعمت خدا نے آپ کو دی ہے تو آپ یوں سمجھیں کہ میں تو سب سے بدتر تھا اور اب بھی بدتر ہوں مگر خدا نے محض اپنے فضل سے مجھ کو یہ نعمتیں دیدی ہیں اس میں میرا کچھ کمال نہیں۔ اس مضمون کے استحضار کے بعد آپ میں کبر و عجب پیدا نہ ہوگا۔ باقی یہ میں نے کب کہا ہے کہ آپ اپنے کو بے نمازی اور بے نمازی کو نمازی سمجھنے لگیں۔ اگر میں یہ کہتا اس وقت یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ صاحب امیر آدمی کو اپنے کو مفلس اور مفلس کو امیر کیسے سمجھ لے۔ نہیں امیر اپنے کو امیر ہی سمجھے اور مفلس کو مفلس سمجھے مگر اس سے اپنے کو افضل نہ سمجھے یہ خیال کر لے کہ میں خود امیر نہیں ہوا بلکہ خدا نے مجھے امیر کیا ہے۔ اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ یہ نعمت مجھ سے سلب کر کے دوسرے کو دیدے۔ یہ بات جس کے دل میں جمی ہوئی ہوگی وہ ہرگز اپنے کو دوسرے سے افضل نہ سمجھے گا اور نہ دوسروں کو حقیر سمجھے گا۔ بلکہ ان کی حالت پر اسکو رحم آئے گا۔

یہ تو سرسری جواب ہے اور حقیقی جواب یہ ہے کہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ تو آپ یہ سمجھ لیں کہ اس وقت گو میں بظاہر دوسرے سے اچھی حالت میں ہوں مگر ممکن ہے کہ خاتمہ کے اعتبار سے وہ اچھا ہو۔ نیز باعتبار حال کے بھی ممکن ہے کہ دوسرے میں کوئی ایسی عمدہ فضیلت ہو جو تم میں نہ ہو۔ مثلاً اس کو خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلق محبت زیادہ ہو، اس میں تو اضع آپ سے زیادہ ہو کیونکہ ہم نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ ان میں ظاہری اعمال کم ہوتے ہیں مگر وقت پر معلوم ہوتا ہے

کہ ان کے دل میں خدا تعالےٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بہت زیادہ ہے تیسرے جو شخص اپنے نفس کے واسطے بغض نہ کرے گا بلکہ بغض فی اللہ کرے گا وہ محض خدا کا حکم سمجھ کر کرے گا اُس کو یہ وساوس وخیال ہرگز پیش نہ آدیں گے کہ میں افضل ہوں یا دوسرا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بادشاہ عادل اپنے بیٹے کو کسی بات پر سزا دے کہ اس کے دس بید ماری جاویں اس وقت شاہی حکم سے بھنگی شاہزادہ کے بید مارتا ہے مگر کیا اس کے دل میں یہ وسوسہ بھی آسکتا ہے کہ میں شاہزادے سے افضل ہوں ہرگز نہیں وہ جو کچھ کرے گا محض حکم کی وجہ سے کرے گا اور اپنی فضیلت کا اُسے وہم بھی نہ ہوگا، یہی حال بغض فی اللہ میں ہوتا ہے۔ بغض فی اللہ والا دوسرے سے بغض بھی کرتا ہے اُس سے قطع تعلق اور ترک سلام وکلام بھی کرتا ہے مگر پھر دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھتا ہے جیسے بھنگی بید مارتے ہوئے بھی شاہزادہ ہی کو اپنے سے بڑا اور افضل سمجھتا ہے۔

الغرض شریعت میں جذبات کی رعایت کا بہت خیال ہے مگر اس کے ساتھ حدود کی رعایت کا بھی بے انتہا اہتمام ہے پس جذبات کی رعایت کر کے تو طلاق کی اجازت دی گئی مگر مصالح کا لحاظ کر کے اولاً رجعی کی اجازت دی کیونکہ تین طلاقیں دینا فیصلہ کرنا ہے اور غصہ میں فیصلہ کرنا ممنوع ہے حکم یہ ہے لَا یَقْضِیَنَّ قَاضٍ بَیْنَ اثْنَیْنِ وَھُوَ غَضْبَانُ۔ غصہ کی حالت میں قاضی کو فیصلہ نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ غصہ میں ہر پہلو پر نظر نہیں ہوتی اس وقت ایک ہی پہلو پر نظر ہوتی ہے تو اس وقت کا فیصلہ صحیح نہ ہوگا اس میں غالب احتمال غلطی کا ہے اسی طرح غصہ میں تین طلاق دینے کا انجام اکثر بُرا ہوگا بعد میں ندامت وحسرت ہوگی۔ چنانچہ ہم نے بہت واقعات دیکھے اور سنے ہیں کہ تین طلاق دے کر بعد میں لوگ پچھتاتے تھے اور اب نکاح باقی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ شوہر کا کفر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ شاید اس سے کبھی کلمہ کفر نکل گیا ہو جس سے نکاح ٹوٹ گیا ہو تو اب یہ تین طلاقیں واقع نہ ہونگی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط اسی لئے شریعت نے تین طلاق ایک دم سے

دینے کی ممانعت کی ہے۔ اسی طرح غصہ میں بچوں کو مارنا نہ چاہیئے کیونکہ غصہ میں یہ خیال نہیں رہتا کہ یہ کتنی سزا کا مستحق ہے ضرور حد سے تجاوز ہو جاتا ہے، مکتب کے میاں جی اس میں زیادہ مبتلا ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ لڑکر آئے بیوی سے اور فیض عام پہنچا سب لڑکوں کو بس ذرا سی بات پر ایک لڑکے کے چھڑی لگائی تھی کہ ایک طرف سے سبھی کو مارتے چلے گئے خطا کی ایک نے اور سزا دی سب کو۔ بھلا یہ بھی کوئی انسانیت ہے ان کو خدا کا خوف نہیں آتا کہ آخرت میں اس کی باز پرس ہوگی۔ یاد رکھو لڑکوں کے معاف کرنے سے یہ ظلم معاف نہیں ہوتا وہ اگر معاف بھی کر دیں تو سرکار مدعی ہوگی اور اول تو ایسے میاں جی آج کل کہاں ہیں جو بچوں سے معافی چاہیں۔ ہم نے صرف ایک ملّا کو دیکھا ہے، گنگوہ میں وہ شاگردوں سے معافی چاہا کرتے تھے جس کی صورت یہ تھی کہ اپنی کمر کھول کر بیٹھ جاتے اور جس لڑکے کو مارتے اس کے ہاتھ میں قمچی دیدیتے کہ بھائی تو میرے مار لے۔ بعضے شریر لڑکے ایسے بھی ہوتے تھے کہ وہ میاں جی کے سڑاسڑ قمچیاں لگاتے تھے۔ اس سے بھی خرابی ہوئی کہ لڑکے گستاخ ہو گئے۔ بچوں سے معافی کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے ایسا برتاؤ کیا جاوے کہ وہ خوش ہو جاویں نہ تو زبانی کافی ہے اور نہ اُن سے انتقام لینے کو کہا جاوے۔ بس آئندہ ان کو اپنے برتاؤ سے خوش کر دینا چاہیئے۔ ان کو پلاؤ، چمکارو، چوٹ کی جگہ سہلاؤ، دودھ پلادو، پیسہ دیدو بس اس طرح وہ خوش ہو جاویں گے تو آپ کے اوپر سے حق العبد اتر جائے گا لیکن اس کے بعد توبہ واستغفار کی بھی ضرورت ہے کیونکہ حق العباد میں حق اللہ بھی فوت ہوتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے لَا تُظْلِمُوْا (ظلم مت کرو) آپ نے اس حکم کی مخالفت کی یہ خدا تعالیٰ کا حق فوت ہوا پس طریقہ یہ ہے کہ بچوں کو غصہ اترنے کے بعد سزا دی جائے اس وقت جو کچھ سزا دی جائے گی وہ خطا کے موافق ہوگی حد سے تجاوز نہ ہوگا ہاں یہ ضرور ہے کہ غصہ فرو ہو جانے کے بعد مارنے میں مزہ نہیں آوے گا مگر جیسا کہ غصہ میں مارنے سے اس وقت مزہ آتا ہے ایسا ہی کبھی بعد میں بدمزگی بھی ایسی ہوتی ہے کہ آپ سارا مزہ بھول جائیں گے۔

مثلاً آنکھ پھوٹ گئی، کان پھٹ گیا، کہیں بے موقع ضرب آ گئی تو میاں جی کھینچے کھینچے پھریں گے اور یہ ایسا نہ بھی ہوا تو آخرت کی بدمزگی تو ضرور ہوگی۔ غرض غصہ کے وقت کا فیصلہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک دم سے تین طلاقیں ہرگز نہ دینی چاہئیں کیونکہ وہ بھی نکاح کا فیصلہ ہے۔ اگر طلاق دو تو ایک دو۔ پھر دیکھو عورت کو ندامت ہے یا طلاق سے خوش ہے۔ بعض دفعہ عورت طلاق سے خوش بھی ہوا کرتی ہے کہ اچھا ہوا قصہ ختم ہوا۔ جس کا سبب کبھی تو شوہر کی زیادتی ہوتی کبھی خود عورت کی شرارت ہوتی ہے، کبھی دونوں طرف سے زیادتی ہوتی ہے تو وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتی ہے کہ اچھا ہوا روز روز کا فضیحتا جاتا رہا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میاں بی بی دونوں نیک ہوتے ہیں مگر پھر بھی عورت کو طلاق سے مسرت ہوتی ہے کیونکہ طبائع میں مناسبت اور موافقت نہ ہونے کی وجہ سے اجتماع نہیں ہو سکتا۔ جیسے سوڈا اور تاٹری فی نفسہٖ عمدہ چیزیں ہیں الگ الگ رہیں تو کچھ آفت برپا نہیں ہوتی۔ مگر جہاں اجتماع ہوا شور برپا ہوا۔ ایسے ہی بعضے میاں بی بی الگ الگ رہیں تو بہت نیک ہیں مگر اجتماع سے آفت نازل ہوتی ہے اس میں علاوہ اختلاف مزاج کے ایک اور نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ حدیث میں ہے

اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ مَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ

روحیں ایک مجمع لشکر کی صورت میں تھیں پس جن میں باہم اس وقت تعارف اور آشنائی ہو چکی ہے ان میں یہاں بھی الفت و محبت ہو جاتی ہے اور جنہیں اسی وقت تعارف نہیں ہوا وہ یہاں بھی میل نہیں کھاتے۔ یہ مضمون محض منقول ہے مشاہد نہیں۔ مگر مخبر صادق کی خبر ہے اس لئے ماننا پڑے گا۔ ہاں بعضے عارفین نے جن کو یہ واقعہ یاد رہا بتلایا ہے کہ عہد الست میں جب ارواح کا اجتماع ہوا تھا تو فلاں شخص ہمارے داہنے تھا فلاں بائیں طرف تھا، فلاں سامنے تھا نیز اہل کشف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس اجتماع کی چار صورتیں ہوئی تھیں بعض ارواح کا منہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھا ان میں تو دنیا میں بھی جانبین سے الفت ہو جاتی ہے۔ بعض اس طرح کھڑی تھیں کہ ہر ایک کی پشت دوسرے کی طرف تھی۔ ان میں ہر ایک کو دوسرے سے نفرت ہوتی ہے

اور بعض اس طرح جمع تھیں کہ ایک کا منہ دوسری کے پشت کی طرف سو ان میں ایک کی طرف سے میلان ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے نفرت۔ اس سے معلوم ہوا کہ مزاج کا فطری اتحاد و اختلاف اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہے جن دو شخصوں کے مزاج میں اختلاف ہوتا ہے ان میں اتحاد نہیں ہوسکتا یہ قدرتی امر ہے۔ بعض دفعہ ایک شخص نیک ہوتا ہے مگر طبیعت کو اس کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ بعضے فاسق فاجر ہوتے ہیں مگر ان کی صورت دیکھ کر طبیعت کو کشش ہوتی ہے۔ پس اس پر تعجب نہ کیا جاوے کہ وہ نیک آدمیوں میں اختلاف مزاج کیوں ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ واقعی میاں بی بی دونوں نیک ہوتے ہیں مگر باہم نباہ نہیں ہوتا۔

روایات میں ہے کہ ایک عورت نے وضع ولد سے بیس منٹ پہلے اپنے شوہر سے طلاق مانگی اس کو یہ مسئلہ معلوم تھا کہ بچہ جننے سے فوراً عدت ختم ہوجاتی ہے اگرچہ اس سے پانچ منٹ پہلے ہی طلاق دی گئی ہو شوہر کو اس وقت خیال نہ تھا اس نے کہا کہ خدا کی بندی اس وقت تو طلاق لے کر کیا کرے گی آخر کوئی وجہ بھی، کہنے لگی کہ وجہ کچھ بھی نہیں بس میرا دل خوش ہوجاوے گا تمہارا حرج ہی کیا ہے۔ ایک طلاق سے نکاح تھوڑا ہی ٹوٹتا ہے تم پھر رجعت کر لینا اس نے طلاق دیدی اور نماز کو چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں بچہ پیدا ہوا اور عدت ختم ہوگئی۔ تو بعض عورتیں بوجہ ناموافقت مزاج کے نباہ نہیں کرسکتیں اس لئے ان کو طلاق سے خوشی ہوتی ہے اسی لئے نکاح میں موافقت مزاج اور مناسبت طبائع کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ جب مزاج میں موافقت نہیں ہوتی تو نباہ دشوار ہوجاتا ہے اور اس نکاح سے زیادہ اس تناسب کے اشتراط میں پیری مریدی کا تعلق ہے اس کا تو سارا مدار مناسبت ہی پر ہے بدون مناسبت کے کچھ نفع ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے طالب کو چاہیئے کہ جس شیخ سے بیعت ہونا چاہے اس کے پاس کچھ مدت تک قیام کرے۔ جب باہم دونوں میں مناسبت ہوجائے اس

وقت بیعت کی درخواست کرے۔ مگر آجکل لوگوں کی حالت یہ ہے کہ آج ایک بزرگ کے پاس گئے اور اُن کی کوئی بات پسند آگئی بس لگے ان سے بیعت ہونے۔ پھر کل کو کسی دوسرے بزرگ کی کوئی ادا پسند آگئی بس ان سے بیعت ہو گئے۔ ان کی بعینہ یہ مثال ہے گنگا گئے گنگا داس، جمنا گئے جمنا داس۔ یہ لوگ طریق کو کھیل بنانا چاہتے ہیں یاد رکھو اس طرح مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک نہ ایک دن ان کی قلعی کھُل جاتی ہے۔ پھر کسی شیخ کو اس پر اعتماد نہیں ہوتا، ہرجائی مشہور ہو جاتا ہے ؎

وفاداری مدار از بلبلاں چشم
کہ ہر دم بر گلے دیگر سرایت

(بلبلان چشم سے وفا کی امید نہ رکھو کہ ہر دم ایک پھول کو چھوڑ کر دوسرے پر چہچہاتی ہیں)

بیعت کا اتنی جلدی فیصلہ کرنا نہ چاہیئے کیونکہ یہ حالت جلدی ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر غور وفکر کے بعد مناسبت تامہ دیکھ کر بیعت ہوں تو ایک ہی کو لگے لپٹے رہیں گے۔ بعض لوگ کسی کے مریدوں کی تعریف پر اس سے بیعت ہو جاتے ہیں یہ بڑی سخت غلطی ہے کیونکہ مریدین تو اپنے شیخ کی تعریف کیا ہی کہتے ہیں۔ اپنی دہی کو کوئی کھٹی نہیں کہا کرتا تم کو خود چکھنا چاہیئے اور اپنے ذوق سے اس کے کھٹے میٹھے ہونے کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔

نیز آجکل ایک یہ بھی آفت ہے کہ بعض دنیادار مشائخ نے اپنے گرگے چھوڑ رکھے ہیں جن کو یہی کام سپرد کیا گیا ہے کہ لوگوں کو بہلا پھُسلا کر لاؤ اور ہم سے بیعت کراؤ۔ اور بعض دیندار مشائخ کے یہاں بھی ایسے گرگے موجود ہیں مگر ان مشائخ کو اس کی اطلاع نہیں ورنہ وہ ہرگز اس کو گوارا نہ کر سکتے اس لئے محض مریدوں کی تعریف وثنا پر کسی سے بیعت ہوتا بڑی غلطی ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ وہ تعلق ہے جس پر ایمان کی تکمیل کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر کسی محقق عارف کے ہاتھ میں پہونچ گئے تب تو ایمان

مکمل ہو جائے گا اور اگر کسی جاہل کے ہاتھ میں پہنچ گئے تو وہ تمہارا پہلا سرمایۂ ایمان بھی غارت کر دے گا۔ افسوس اتنا بڑا تعلق مگر لوگوں کو اس کے اصول کی خبر نہیں۔ اس میں بڑی اصل دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ شیخ عارف محقق ہو دوسرے تم کو اس سے مناسبت تامہ ہو۔ اگر شیخ عارف کامل ہو مگر تم کو اس سے مناسبت نہ ہو تو خاک نفع نہ ہوگا۔ اس لئے بیعت سے پہلے مناسبت کا دیکھنا بہت ضروری ہے ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے اور اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف جاؤ گے اور اس صورت میں مشائخ طریق کے ساتھ گویا تم نے کھیل کیا۔ جس میں وبال کا اندیشہ ہے ؎

با ہر کہ نشستی و نشد جمع دلت | وز تو نرمید صحبت و گلت
زنہار ز صحبتش گریزاں می باش | ورنہ نکند روح عزیزاں بحلت

(جس شخص کی صحبت میں تم کو اطمینان قلب نہ ہو اور اس کی صحبت ترک نہ کرو تو اس کی صحبت مٹی اور پانی کی مثل ہے ضرور اس کی صحبت کو ترک کرو ورنہ روح مردہ ہوگی)

اسی طرح اگر تم کو ایک شیخ سے نفع نہ ہوا لیکن پھر بھی تم اس کو لگے لپٹے رہے۔ اور دوسرے کی طرف رجوع نہ کیا جب بھی تم نے طریق کا حق ضائع کیا۔ غرض ایسا شخص مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نہ اس کو چھوڑتے بن پڑتی ہے نہ الگ ہوتے۔ اس لئے مناسبت کا دیکھنا بہت ضروری ہے۔ جس کے لئے پاس رہنے کی ضرورت ہے۔ اور گو عدم اعتقاد کے لئے تفتیش کی ضرورت نہیں کیونکہ مشائخ کا معتقد ہونا کچھ فرض و واجب نہیں لیکن دست بدست ہونے کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے جیسا کہ اگر تم کسی عورت سے نکاح نہ کرنا چاہو تو اس کے لئے تفتیش کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں نکاح کے لئے چھان پھوڑ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نکاح نہ کرنا معیوب نہیں لیکن نکاح کے بعد طلاق دینا بُرا ہے۔ اس لئے نکاح سے پہلے عورت کے اخلاق و عادات، صورت و سیرت کی خوب تحقیق کر لینی چاہیئے۔ لیکن مشائخ کی تفتیش خود بلا واسطہ کرے اور نکاح میں اولیاء و اقرباء کے واسطہ سے تحقیق کرے مگر آجکل نکاح میں تو مناسبت و موافقت کی

تحقیق و تفتیش کی کسی قدر ضرورت لوگ سمجھتے ہیں اور بیعت ہونے کے لئے اس کا مطلق اہتمام نہیں حالانکہ نکاح ایک دنیوی کام ہے اور بیعت ہونا دینی کام ہے جس پر ایمان کی تکمیل موقوف ہے دوسرے اس میں امور محسوسہ کی تفتیش ہے اور اس میں امور معنویہ کی اور ظاہر ہے کہ امور معنویہ کی تفتیش کے لئے اہتمام بلیغ کی ضرورت ہے۔ تیسرے اس میں ناقصات العقل سے تعلق ہے اور اس میں کامل العقل سے تعلق ہے اتنی وجوہ ترجیح کے ہوتے ہوئے پھر بھی اس کا اہتمام نہ ہوتا جائے تعجب ہے یہ مضمون استطراداً ذکر ہو گیا۔

میں طلاق کو بیان کر رہا تھا کہ اگر ضرورت ہو تو ایک طلاق دے پھر اگر اس سے عورت کو تنبیہ نہ ہوئی ہو تو دوسرے طہر میں دوسری طلاق دے سکتا ہے۔ اس صورت میں ایک مہینہ کم از کم سوچنے کے لئے اس کو ملے گا جس میں تمام مصالح پر نظر کر سکتا ہے۔ دوسری طلاق ایک مہینہ کے بعد ہی دے گا جس کو بہت ضرورت ہو گی اس کے بعد پھر ایک ماہ تک اور سوچتے رہو اگر طلاق سے مصالح فوت ہونے کا اندیشہ ہو تب تو رجعت کر لو اور اگر نباہ دشوار ہی معلوم ہو تو تیسری طلاق تیسرے مہینے میں دے سکتے ہو۔ اگرچہ بہتر یہ ہے کہ تیسری طلاق نہ دے بلکہ عدت ختم ہونے دے وہ خود ہی نکاح سے نکل جائے گی شاید نکاح سے نکلنے کے بعد پھر دونوں کی رائے تجدید نکاح کی ہو تو سہولت رہے گی۔ تین طلاق کے بعد بدون حلالہ کے نکاح نہ ہو سکے گا۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا یعنی تین طلاق ایک دم سے نہ دو تم کو کیا خبر ہے شاید حق تعالیٰ بعد میں تمہاری رائے بدل دیں پھر تم کو پچھتانا پڑے گا۔ یہ حکمت بظاہر طلاق کے متعلق ہے مگر لَا تَدْرِیْ کا تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں) کے بعد میں لانا اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمت تمام حدود کے متعلق ہے گو کہیں بے تکلف وہ حکمت مفہوم ہو جاتی ہے اور کہیں ذرا غور و تامل سے معلوم ہوتی ہے۔ یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ شریعت کا کوئی حکم حکمت سے

خالی نہیں۔ اول تو ہر حکم میں اس کے مناسب جزئی مصالح اور حکمتیں بھی بہت ہوتی ہیں ورنہ کم از کم یہ حکمت تو لا تدری کی مدلول ہے سب کو ہی عام ہے۔ نمونہ کے طور پر یہ سنئے حق تعالیٰ نے خرچ کے متعلق فرمایا ہے۔ وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ط کہ افراط و تفریط سے بچنا چاہیے۔ اور اعتدال سے خرچ کرنا چاہیے۔ دوسری آیت میں ہے وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ (نہ اپنے ہاتھوں کو گردن سے باندھ لو نہ پوری طرح کھول دو) اس حد میں بھی یہ حکمت ہے۔ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ط یعنی اسراف مت کرو شاید حق تعالیٰ بعد میں کوئی نئی بات پیدا کر دیں جس کے لئے تم کو روپیہ کی ضرورت ہونے لگے۔ بعض دفعہ مال ہوتے ہوئے کوئی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ روپیہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ مگر بعد میں دفعۃً ضرورت نکل آتی ہے، کوئی بیمار ہو گیا یا کوئی مقدمہ سر پر آپڑا اس لئے سارا روپیہ برباد نہ کرنا چاہیے۔ کچھ اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیے۔

ہمارے حاجی صاحب باوجود بڑے کامل تارک ہونے کے فرماتے تھے کہ اہل تعلقات کو کچھ ذخیرہ مال کا نفس کے بہلانے کو اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیے۔ دیکھئے حکماء یہ حضرات ہیں کہ ہر شخص سے اس کی حالت کے مناسب معاملہ کرتے ہیں اور واقعی وہ شیخ اناڑی ہے جو ساری دنیا کو تارک بنانا چاہے۔ جو شخص سب مریدوں کو ایک ہی لکڑی ہانکے وہ اس حکیم کے بیٹے کے مشابہ ہے جو ایک بار اپنے باپ کے ساتھ کسی مریض کو دیکھنے گیا۔ باپ نے نبض دیکھ کر کہا کہ شاید آپ نے نارنگی کھائی ہے۔ مریض نے اقرار کیا۔ حکیم نے آئندہ کو منع کر دیا۔ راستہ میں لوٹتے ہوئے لڑکے نے باپ سے پوچھا کہ آپ نے نبض سے کیسے معلوم کر لیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے۔ کہا نبض سے تو برودت و بلغم کا اثر معلوم ہوا تھا پھر وہاں نارنگی کے چھلکے پڑے ہوئے نظر آئے اس قرینہ سے میں سمجھ گیا کہ اس نے آج نارنگی کھائی ہے۔ پس صاحبزادہ کے ہاتھ ایک قاعدہ کلیہ آ گیا۔ باپ تو مر گئے۔ آپ ان کی جگہ بیٹھے وہی مثل ہوئی کہ

آدمیاں گم شدند ملک خدا خر گرفت
زشتیٔ اعمال ما صورت نادر گرفت

(اہل آدمی گم ہوگئے ملک خدا گدھوں و نا اہلوں) کے قبضہ میں آیا ہماری بداعمالی نے نادر کی صورت اختیار کی)

ایک مرتبہ کسی رئیس کے یہاں تشریف لے گئے اس کی نبض دیکھ کر چارپائی کے نیچے دیکھا آپ کہتے ہیں کہ شاید آپ نے نمدہ کھایا ہے۔ اتفاقاً پلنگ کے نیچے نمدہ ہی پڑا تھا لوگ ہنسنے لگے کہ بھلا نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ نبض سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں نے نکال دیا کہ جا تیری دم میں نمدہ۔

اسی طرح بعضے عطائی حکیم ہر شخص کو سنکھئے کا تیل بتلا دیتے ہیں چاہے کسی کے موافق ہو یا نہ ہو، تو جیسے یہ لوگ اناڑی طبیب ہیں ایسے ہی وہ شیخ بھی اناڑی ہے جو سب کو تارک بنانا چاہے۔ یاد رکھو فطری طور پر طبائع مختلف ہیں۔ کسی کو بدون مال کے جمعیت ہوتی ہے کسی کو مال ہی سے جمعیت ہوتی ہے اور ہر ایک کے لئے توکل کی شان جدا ہے جس کو بدون مال کے جمعیت نہ ہو اس کے لئے مال جمع کرنے کے ساتھ بھی توکل جمع ہو سکتا ہے اور جس کو بغیر مال کے جمعیت ہو سکے اس کے لئے اس طرح بھی توکل صحیح ہو سکتا ہے پس توکل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ آئے سب خرچ کر ڈالے کچھ جمع نہ کرے ہاں یہ کہنا چاہیئے کہ توکل کی ایک صورت یہ بھی ہے وہ حکیم عطائی ہے جو سب کو تارک بنا کر متوکل بنانا چاہے۔ دیکھئے حضرت صدیق اکبر رضؓ نے بیت المال سے تنخواہ لی ہے اور حضرت عمر رضؓ نے اول اول نہیں لی پھر بطور قرض لینے لگے مگر دونوں متوکل تھے۔ کیا حضرت صدیق اکبر رضؓ پر کوئی شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ وہ متوکل نہ تھے۔ نیز حضرات صحابہ میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کے پاس ہزاروں لاکھوں روپئے جمع تھے اور یقیناً صحابہ سے بڑھ کر کوئی متوکل نہیں ہو سکتا پس یہ خیال غلط ہے کہ توکل کے لئے مال جمع نہ کرنا شرط ہے۔ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ پر بھروسہ اور اعتماد ہو۔ اسباب پر نظر نہ ہو۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ اسباب کو جمع ہی نہ کرے

ایک صورت یہ ہے کہ اسباب کو جمع کر کے پھر ان پر نظر نہ کرے۔ تو شیخ کو چاہیے کہ جس شخص کی طبیعت کمزور دیکھے اس کو مال جمع کرنے سے نہ روکے بلکہ مال جمع کرنے کے ساتھ اس کو توکل کی تعلیم دے اور طبیعت کا کمزور ہونا قوی ہونا یہ فطری امر ہے اگر کوئی شخص فطرۃً کمزور ہو تو اس سے ولایت و معرفت میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ میرا سارا رزق ایک دم سے دیدیجئے۔ الہام ہوا کیا تم کو ہم پر اعتماد نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ الٰہی مجھے آپ پر اعتماد کیوں نہ ہوتا۔ لیکن شیطان مجھ سے کہتا ہے کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا۔ میں کہتا ہوں خدا دے گا کیونکہ اس کا وعدہ ہے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (اور کوئی جاندار روئے زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) تو وہ کہتا ہے کہ خدا کا وعدہ سچا ہے مگر یہ تو نہیں فرمایا کہ تم کو کل ہی کو رزق مل جاوے گا۔ بس یہ وعدہ ہے کہ رزق ہمارے ذمہ ہے تو ممکن ہے کہ تین چار دن کے بعد روزی ملے جبکہ تم فاقے کر کے پریشان ہو چکو گے یہاں آکر میں خاموش ہو جاتا ہوں اگر ساری روزی مجھے ایک دم سے مل جائے تو میں اس کو ایک کوٹھری میں بند کر کے رکھدوں گا، پھر اگر شیطان مجھ سے کہے گا کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا تو میں اشارہ کر کے بتلادوں گا کہ اس کوٹھری میں سے کھاؤں گا پھر آگے اس کی بات نہ چل سکے گی۔ تو دیکھئے ان بزرگ نے اپنی طبیعت کی کمزوری کا کیسا علاج کیا۔ اب یہاں سے اُن واعظوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو سارے مسلمانوں کو بے ایمان بتلاتے ہیں کہ ان کو وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (اور کوئی جاندار زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) پر بھروسہ اور یقین نہیں۔ اور اس کی تائید میں یہ دلیل بیان کیا کرتے ہیں کہ دیکھو اگر کوئی شخص ان کی دعوت کر دے تو شام کو میرے یہاں کھانا کھائیے گا تو اس کی بات پر ایسا یقین ہو جاتا ہے کہ فوراً چولھا ٹھنڈا کر دیتے ہیں اور گھر میں کھانا نہیں پکواتے۔ اور خدا تعالےٰ

ان کی دعوت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تمہاری روزی ہمارے ذمہ ہے تو اس پر اعتماد کرکے کوئی بھی چولھا ٹھنڈا نہیں کرتا۔

یاد رکھو یہ مضمون غلط ہے اور ہر مسلمان کو حق تعالےٰ کے ارشاد پر یقین ہے مگر پھر یہ فرق اس لئے ہے کہ دعوت کرنے والا تو وقت مقرر کر دیتا ہے کہ شام کو آج ہی دعوت ہے اور حق تعالےٰ نے دن یا وقت مقرر نہیں کیا اُن کا وعدہ مطلق ہے اس لئے ابہام سے بعضوں کو پریشانی ہوتی ہے کہ نہ معلوم یہ وعدہ کب پورا ہو۔ اگر حق تعالیٰ کی طرف سے بھی وعدہ معین ہوتا تو خدا کی قسم جو کوئی مسلمان فاسق سے فاسق بھی چولھا تیار کرتا۔

دوسری یہ کہ بعض دفعہ حق تعالےٰ کا وعدہ کسی شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے جو کلام میں صراحۃً مذکور نہیں ہوتی۔ مثلاً حق تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ تم جس کام کا ارادہ کروگے ہم اس کو پورا کر دیں گے، مگر اس کے لئے ایک شرط بھی ہے وہ یہ کہ تم اپنی طرف سے کوشش بھی کرو۔ اسی طرح یہاں بھی احتمال ہے کہ ہر شخص کی روزی خدا کے ذمہ ہے یعنی بشرطیکہ تم اس کے لئے کوشش بھی کرو۔ اس لئے مسلمان کوشش کرتے ہیں اگر حق تعالےٰ کوشش سے بھی منع فرما دیتے تو کوئی شخص بھی اسباب کو اختیار نہ کرتا۔ بعض لوگوں کو اس جگہ ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (اور کوئی جاندار روئے زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا رزق خدا کے ذمہ ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ قحط کے زمانہ میں بھوکوں مر جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے رِزْقُهَا میں اضافت ہے جس سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کا جو رزق مقدر ہے اس کا پہونچانا خدا کے ذمہ ہے، اب جو لوگ بھوکوں مر جاتے ہیں ان کا رزق ہی نہ رہا تھا اس لئے وہ فاقہ سے مر گئے اگر ان کا رزق باقی ہوتا تو کبھی فاقہ سے نہ مرتے لہٰذا اب کچھ اشکال نہیں غرض ان بزرگ نے یہ دعا کی تھی کہ میرا سارا رزق ایک دم سے مل جائے

تا کہ اگر شیطان مجھ سے یہ کہے کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا تو میں کہہ دوں گا کہ اس کوٹھڑی سے کھاؤں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعضے بزرگ بھی دل کے کچے ہوتے ہیں ان کو رزق جمع کرنے کے بعد اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے بس سب کو تارک بنانا یہ عطائی حکیموں کا کام ہے۔ محقق کبھی ایسا نہ کرے گا چند روز سے خود مجھے یہ واقعہ پیش آرہا ہے کہ مجمع میں مجھ سے پانی نہیں پیا جاتا۔ بس تھوڑا سا پیا اور پیاس جاتی رہی یہ بھی طبیعت کی کمزوری ہے تقدیم میں اس وقت زیادہ پانی نہیں ہوتا مگر صراحی میں ہونے سے تسلی رہتی ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت۔ ہے کہ وہ ایک بادشاہ سے باتیں کر رہے تھے اور بے باکانہ گفتگو کر رہے تھے غالباً بادشاہ کو کسی حرکت پر تنبیہ کر رہے تھے بادشاہ کو غصہ آگیا اور اس نے پکارا کوئی ہے۔ تو ان بزرگ صاحب نے بھی آواز دی کہ کوئی ہے۔ بس ان کا پکارنا تھا کہ دفعۃً غیب سے ایک شیر نمودار ہوکر بادشاہ کی طرف لپکا جس کو دیکھ کر بادشاہ تو بھاگا ہی تھا وہ بزرگ خود بھی بھاگے حالانکہ انہی کی کرامت سے وہ آیا تھا مگر آپ خود بھی اس سے ڈر کر بھاگے بات کیا تھی، بات یہ تھی کہ ان کا دل کمزور تھا تو یہ بزرگی کے منافی نہیں۔ بزرگوں کو ضعف قلب اور اختلاج اور خفقان ہوسکتا ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا مرض ہے جس طرح ان کو بخار وغیرہ ہوجاتا ہے ضعف قلب اور اختلاج بھی ہوجاتا ہے اس سے ولایت و معرفت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔

دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ کی گفتگو ہو رہی تھی نبوت عطا ہو چکی تھی اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو ایک معجزہ عطا فرمانا چاہا۔ حکم ہوا کہ اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو۔ چنانچہ ڈال دیا اور وہ ہیبتناک اژدہا بن گیا موسیٰ علیہ السلام اس کو دیکھ کر ڈر گئے اور پیٹھ موڑ کر ایسے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ فَلَمَّا رَاٰھَا تَھْتَزُّ كَاَنَّھَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ (سو انہوں نے جب اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا جیسے سانپ ہو تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی تو نہ دیکھا)

بھلا اس سے زیادہ قوت قلب کے اسباب کیا ہوں گے کہ بلا واسطہ حق تعالےٰ سے گفتگو بھی ہو چکی تھی، نبوت عطا ہو چکی تھی. حق تعالےٰ کے ارشاد سے عصا کو ڈالا تھا مگر پھر بھی بشریت کے اقتضاء سے اژدہا کا خوف غالب ہو گیا اور بھاگ گئے معلوم ہوا کہ خوف طبعی نبوت کے بھی منافی نہیں ولایت اور بزرگی کے منافی تو کیا ہوتا بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ علماء کو ایسا ہونا چاہیئے يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ کہ بس خدا ہی سے ڈریں اور کسی سے نہ ڈریں، ان کے نزدیک علماء کو نہ شیر سے ڈرنا چاہیئے نہ سانپ بچھو سے نہ توپ سے نہ بندوق سے نہ حکام سے نہ ڈاکوؤں سے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ موذی چیز سے انبیاء علیہم السلام کو بھی خوف طبعی ہوتا تھا اگر یہ خوف طبعی توکل کے خلاف ہے تو کیا معاذ اللہ انبیاء علیہم السلام کو غیر متوکل کہو گے ہرگز نہیں کس کا منہ ہے جو اپنے کو موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ متوکل بتائے مگر وہاں یہ حالت تھی کہ نبوت کے بعد ان کے دل میں فرعون سے بھی خوف تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں قَالَا رَبَّنَا اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَا اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ قَالَ لَا تَخَافَا اِنَّنِيْ مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو فرعون کی طرف سے یہ خوف ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرنے لگے یا حد سے بڑھ جائے (تم ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں) باوجودیکہ حق تعالےٰ کی طرف سے ان کو صریح اور صاف حکم ہو چکا تھا اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکشی پر کمر باندھ رہا ہے مگر باایں ہمہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے آجکل کے بہادروں کی طرح اپنی بہادری ظاہر نہیں کی کہ ہم کو نہ قتل کا خوف ہے نہ قید خانہ کا اندیشہ ہے ہم بلا خوف و خطر اس خدمت کو انجام دیں گے بلکہ انہوں نے اپنے طبعی خوف کو حق تعالےٰ سے عرض کر دیا کہ ہم کو اس کی زیادتی سے ڈر لگتا ہے اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم کو قتل نہ کر دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ طبعی خوف کا ہونا نبوت و ولایت کے بالکل منافی نہیں ورنہ حق تعالےٰ اس

خوف پر انکار فرماتے۔ مگر حق تعالیٰ نے اس پر ان کو ذرا ملامت نہیں کی بلکہ تسلی دیکر فرمایا کہ لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَكُمَا تم ڈرو نہیں تمہاری ساتھ ہوں اور دوسری جگہ ارشاد ہے نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُوْنَ ؕ کہ ہم تم کو رعب عطا کریں گے جس کی وجہ سے وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے اور تم کو اور تمہارے متبعین ہی کو غلبہ حاصل ہوگا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے طبعی خوف کے ازالہ کا سامان کرلیا اس وقت فرعون کے پاس تشریف لے گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (وہ اللہ سے ڈرتے ہیں خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے) میں خوف طبعی کی نفی نہیں بلکہ خوف عقلی کی نفی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ آیت تبلیغ احکام کے متعلق ہے اور مقصود یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام میں سوائے خدا کے کسی سے ایسا نہیں ڈرتے کہ وہ تبلیغ سے مانع ہوجاوے۔ چنانچہ پوری آیت اس طرح ہے اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ؕ وہ انبیاء ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہونچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

اس میں تبلیغ احکام کے وقت غیر اللہ کے خوف عقلی کی نفی کی گئی ہے۔ رہا یہ کہ ان کو کسی سے خوف طبعی بھی نہیں ہوتا یہ اس آیت کا مفہوم نہیں۔ لوگ قرآن کو ادھورا پڑھتے ہیں اس لئے اشکال ہوتا ہے پورے مضمون پر نظر کرنے کے بعد کچھ اشکال نہیں رہتا۔ غرض تبلیغ احکام کے وقت بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت خوف طبعی کسی درجہ کا لاحق نہیں ہوتا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کو فرعون سے طبعی خوف تھا اسی لئے انہوں نے حق تعالیٰ سے اپنا خوف ظاہر کرکے اس کا علاج چاہا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام ضرور کرتے ہیں اور تبلیغ کے متعلق خوف عقلی تو ان کو صرف خدا سے ہوتا ہے مخلوق کا خوف عقلی انہیں ذرا نہیں ہوتا جس کے اثر سے خوف طبعی مخلوق کا ان پر ایسا غالب نہیں ہوتا جو تبلیغ سے روک دے بلکہ اگر کسی وقت

مخلوق سے ان کو خوف طبعی ہوتا بھی ہے تو وہ خشیت خداوندی سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ پس مخلوق کے خوف عقلی کی تو مطلقاً نفی ہے اور خوف طبعی کی مطلقاً نفی نہیں بلکہ اس کے غلبہ کی نفی ہے۔

اب یہ مضمون ان شاء اللہ تعالےٰ کسی نص سے متعارض نہ ہوگا۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر علماء کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ مخلوق سے خوف عقلی ان کو ذرا نہ ہو اور خوف طبعی اگر ہو تو خوف خداوندی سے مغلوب ہو اس پر غالب نہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ علماء کے ذمہ تبلیغ فرض ہوتی ہے وہاں بیشک ان پر خوف خداوندی ہی غالب ہوتا ہے مخلوق کا خوف طبعی غالب نہیں ہوتا مگر جہاں ان پر تبلیغ فرض ہی نہ ہو محض مستحب ہو وہاں اگر ان کو مخلوق سے طبعی خوف ہو تو اس میں کیا حرج ہے۔ بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ ان پر تبلیغ ہر حالت میں فرض ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جن علماء کو تم خائف کہتے ہو وہ اس خوف کی وجہ سے کسی فرض و واجب کو ترک کر رہے ہیں یا مباح و مستحب کو۔ اگر تم انصاف سے دلائل میں غور کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ مخلوق کے خوف سے کسی فرض و واجب کو ہرگز ترک نہیں کرتے بلکہ محض بعض مباحات یا بہت سے بہت بعض مستحبات کو ترک کر رہے ہیں۔ سو ایسی حالت میں وہ یَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ؕ (اس سے ڈرتے ہیں اور وہ اللہ تعالےٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے) کے خلاف کیونکر ہوتے (بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جن مسائل کی تبلیغ آجکل کے بہادر لوگ کر رہے ہیں علماء بھی ان سب کی تبلیغ کر رہے ہیں صرف عنوان کا فرق ہے۔ بہادران قوم مقابلہ اور سب و شتم کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں اور جن کو تم خائف کہتے ہو وہ تہذیب اور نرمی کے ساتھ ان مسائل کو بیان کرتے ہیں، اب صرف اس بات کا فیصلہ باقی رہا کہ مخالفین اسلام کے سامنے آیا ہم کو مقابلہ اور سب و شتم کے ساتھ احکام کو ظاہر کرنا چاہیئے یا نرمی و تہذیب کے ساتھ سو اس کا فیصلہ خود قرآن مجید نے کر دیا ہے۔ حق تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرما کر جب فرعون کے پاس تبلیغ احکام کے لئے جانے کا حکم فرمایا

تو اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ اور فرعون سے نرمی کے ساتھ بات چیت کرنا شاید اس کو نصیحت ہو جاوے یا خدا کا خوف اس کے دل میں آجاوے۔ دیکھئے موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ کون متوکل ہوگا اور فرعون سے زیادہ ظالم و سرکش کون مگر بااینہمہ یہ حکم ہو رہا ہے کہ اس سے نرمی کے ساتھ گفتگو کیجئے گا۔

صاحبو قاعدہ یہی ہے کہ جب کسی مخالف پر اپنا زور اور دباؤ نہ ہو تو وہاں مقابلہ اور سختی نافع نہیں ہوتی بلکہ اکثر مضر ہو جاتی ہے ایسے موقع میں اکثر نرمی ہی سے کچھ نفع ہو جاتا ہے ۱۲ جامع)

غرض بعض لوگ فطرۃً دل کے کمزور ہوتے ہیں اور بعض قوی القلب ہوتے ہیں تو وہ شیخ اناڑی ہے جو اپنی قوت کو دیکھ کر مریدوں کو بھی اسی کی تعلیم دے کہ میری طرح تم بھی تارک بن جاؤ۔ اس کی وہی مثال ہوگی جو چوہے اور اونٹ کی مثال ہے کہ ایک اونٹ سے کسی چوہے کی دوستی ہوگئی تھی، ایک مرتبہ دونوں ساتھ ساتھ جارہے تھے کہ راستہ میں دریا آیا اونٹ تو دریا میں گھس گیا چوہا کنارہ ہی پر رہ گیا۔ اونٹ نے چوہے سے کہا کہ تم کیوں رُک گئے، اُس نے جواب دیا کہ مجھے ڈوبنے کا خوف ہے اونٹ نے کہا نہیں پانی زیادہ نہیں ہے صرف گھٹنوں تک ہے۔ چوہے نے کہا حضور آپ کے گھٹنوں تک ہے کہ میرے بھی ذرا آپ اپنے گھٹنوں کو تو دیکھیں کہ کتنے اونچے ہیں جب اتنا پانی ہے تو میرا کہاں پتہ رہے گا۔ اسی طرح جو شیخ اپنے گھٹنوں تک پانی دیکھ کر چوہے مرید سے بھی کہے کہ چلے آؤ وہ بیوقوف ہے ہمارے حضرات نے ہمیشہ اس کی رعایت کی ہے کہ ہر شخص کو اس کے مناسب حال تعلیم کی جاوے۔ چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب صاحب کے پاس ایک خانصاحب جو کہ اس سے پہلے بھی کئی بار کسی ظالم کی شکایت اور دعا کی درخواست لے کر آچکے تھے ایک دن پھر آئے اور عرض کرنے لگے کہ حضرت وہ شخص برابر میرے اوپر ظلم کر رہا ہے اب تو اس نے میری زمین بالکل ہی دبالی ہے ظلم سے باز نہیں آتا۔ میں کیا کروں۔ حاجی صاحب نے فرمایا بھائی صبر کرو خدا تعالےٰ

تم کو اور کہیں سے روزی دیدیں گے۔

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے یہ جواب سُن لیا، حجرہ سے باہر تشریف لائے اور خانصاحب سے کہا کہ نہیں خاں صاحب جاؤ اس کی نالش کرو ہم دعا کریں گے اور حاجی صاحب سے فرمایا کہ آپ کے نہ بیوی نہ بچے اس لئے ہر چیز سے صبر کر کے بیٹھ گئے تو آپ سبھی کو صبر کی تعلیم کرنے لگے۔ بھلا وہ بیچارہ بیوی بچوں والا آدمی اُس سے فاقہ مستی پر کیونکر صبر ہو گا۔ آپ کے صبر کا انجام تو وصول الی اللہ ہے اور اس کے صبر کا انجام وصول الی السقر (دوزخ) ہے کیونکہ وہ صبر کر کے بعض دفعہ پریشان ہو گا۔ اور جب پریشانی کے ضبط کا تحمل نہ رہے گا تو گناہ کرنے لگے گا۔ میں کہتا ہوں کہ یہاں تک بھی غنیمت ہے اگر خدانخواستہ کسی نے ایسی حالت میں اس کو بہکا دیا تو وہ عیسائی ہو جاوے گا۔ ہم نے ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ بعض لوگوں سے تنگی اور فقر پر صبر نہ ہو سکا تو انہوں نے دین بدل دیا نعوذ باللہ من ذلک۔ اسی طرح حضرت حاجی صاحب اکثر عوام کو صبر کی تعلیم نہیں فرماتے تھے بلکہ ان کو اختیار اسباب کا امر فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسماۃ نے حضرت سے عرض کیا کہ میں اپنی زمین کو وقف کرنا چاہتی ہوں، حضرت نے منع فرمایا کہ زمین کو وقف نہ کرو اپنی ملک ہی میں رکھو اس سے نفس کو سہارا رہتا ہے۔ یہ مضمون حدیث میں بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص زمین کو فروخت کرے تو اس روپے سے جلدی کوئی زمین ہی خرید لے کیونکہ نقد میں برکت نہیں ہوتی ادھر اُدھر خرچ ہو جاتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث شریف میں یہ ارشاد بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اے عائشہؓ تم زمین و جائیداد نہ خریدنا بظاہر ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے مگر وجہ تطبیق یہ ہے کہ جس کے پاس پہلے سے زمین ہو وہ تو اس کو ضائع نہ کرے کیونکہ وہ اس سبب معاش کا پہلے سے خوگر ہے اگر زمین نہ رہی تو پریشان ہو گا۔ اور جس کے پاس نہ ہو وہ خواہ مخواہ اپنے سر پر یہ بلا نہ خریدے کیونکہ زمین جائداد میں مشغولی زیادہ ہوتی ہے۔ سبحان اللہ۔

ہر شخص کی حالت کی جداگانہ رعایت ہے سب کو ایک لکڑی نہیں ہانکا گیا۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نواب صاحب رئیس چھتاری کو ایک حکیمانہ خط لکھا تھا جس میں نواب صاحب کی حالت کی بہت زیادہ رعایت تھی نواب صاحب کا ارادہ یہ ہوا تھا کہ ہجرت کر کے حرم شریف میں قیام فرمائیں۔ اول تو حضرت حاجی صاحب اکثر عازمین ہجرت کو فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں اس حالت میں رہنا کہ جسم وہاں ہو اور دل مکہ مکرمہ میں یہ اس سے بہتر ہے کہ جسم مکہ مکرمہ میں ہو اور دل ہندوستان میں اس لئے جب تک شوق کا غلبہ بیحد نہ ہو اس وقت تک ہجرت کا ارادہ نہ کرے مگر نواب صاحب کا غلبہ شوق حضرت کو معلوم تھا اس لئے منع تو نہیں فرمایا مگر ان کو یہ لکھا کہ جب یہاں آنے کا ارادہ کریں تو ریاست کا معقول انتظام کر کے آدیں تاکہ ریاست کی طرف سے کسی قسم کا فکر دل پر نہ ہو۔ ایک بات یہ بھی لکھی تھی کہ جب ریاست کا انتظام آپ دوسروں کے سپرد کریں تو اس کا خیال رکھا جائے کہ ملازمین کی تنخواہیں بڑی بڑی ہوں کیونکہ جب تنخواہ معقول ہوتی ہے تو انسان رشوت اور خیانت کا قصد نہیں کرتا اور تھوڑی تنخواہ میں اس وقت تو آپ کو کفایت معلوم ہوتی ہے مگر بعد میں ملازمین خیانت اور غبن کر کے زیادہ نقصان پہونچاتے ہیں۔ سبحان اللہ دنیا کی سمجھ بھی ان ہی حضرات کو زیادہ ہے۔ اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ مکہ معظمہ میں رہ کر آپ ریاست سے جو کچھ صدقات وخیرات کرنا چاہیں وہ رقم اپنے پاس نہ منگاویں جو کچھ سخاوت کرنی ہو سب وہیں کسی کے سپرد کر دیں جو آپ کی مرضی منشاء کے موافق تقسیم کر دے بلکہ مناسب تو یہ تھا کہ آپ اتنی تنخواہ کا بھی وہیں سے انتظام نہ کرتے بلکہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی کریم کے یہاں جایا کرتا ہے تو اپنے ساتھ توشہ باندھ کر نہیں لیجاتا۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

روض الریاحین میں لکھا ہے کہ ایک نوجوان لڑکا قافلہ حجاج کے ساتھ تھا مگر اس کے ساتھ کچھ توشہ نہ تھا کسی نے اس سے دریافت کیا کہ میاں تم کہاں جا رہے ہو

کہا بیت اللہ کا ارادہ ہے، لوگوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ نہ کچھ توشہ ہے نہ سامان ہے آخر یوں بے سروسامان کس طرح پہونچو گے اس پر نوجوان زاہد کو جوش ہوا اور اس نے بزبان قال یا حال یہ جواب دیا ؎

وَفَدْتُ عَلَى الْكَرِيْمِ بِغَيْرِ زَادٍ — مِنَ الْحَسَنَاتِ وَالْقَلْبِ السَّلِيْمِ
وَاِنَّ الزَّادَ اَقْبَحُ كُلِّ شَيْءٍ — اِذَا كَانَ الْوُفُوْدُ عَلَى الْكَرِيْمِ

(میں بغیر توشہ کے نیکیوں اور قلب سلیم سے کریم کے پاس جارہا ہوں
اس لئے توشہ ہر شئے قبیح تر ہے جبکہ کریم کے پاس جانا ہو)

حاصل یہ ہے کہ میں کریم کے پاس جارہا ہوں تو یہ بڑی بے شرمی ہے کہ اپنی ساتھ توشہ باندھ کر لیجا دیں۔ تو حقیقت میں اہل حال اس کو بے شرمی سمجھتے ہیں۔ مگر حاجی صاحب نے نواب صاحب کو لکھا کہ اگرچہ مناسب تو یہ تھا کہ آپ اپنی تنخواہ کا بھی انتظام ہندوستان سے نہ کرتے لیکن چونکہ آپ ہمیشہ سے اسباب کے عادی ہیں اس لئے اپنی تنخواہ مقرر نہ کرنے میں آپ کو پریشانی ہوگی جس سے جمعیت قلب فوت ہو جائے گی اس لئے اپنی تنخواہ کا انتظام تو کر لیجئے مگر اس کے علاوہ اور کوئی جھگڑا تقسیم وغیرہ کا ساتھ نہ لائیے۔ اور یہ لکھا کہ گو یہ سخاوت ہے مگر ؎

نان دادن خود سخائے صادق است — جان دادن خود سخائے عاشق است

(روٹی دینا خود سخاوت صادق ہے جان دینا عاشق کی سخاوت ہے)

سبحان اللہ کیسی شان ہوتی ہے اہل اللہ کی واقعی محقق جامع اضداد ہوتا ہے۔ وہ متضاد امور کو اس طرح جمع کرتا ہے کہ غیر محقق اس کی حقیقت نہ سمجھنے کے سبب پریشان ہوکر پکار اٹھتا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ — باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

(تختہ سے باندھ کر قعر دریا میں ڈالدیا ہے پھر کہتے ہو کہ دیکھ ہوشیار رہ کہ دامن تر نہ ہو)

جس کسی کا یہ شعر ہے وہ محقق نہیں معلوم ہوتا۔ ورنہ محقق کبھی ایسا نہیں کہہ سکتا[1] وہ اضداد کو جمع کرکے دکھلاتا ہے۔ چنانچہ حاجی صاحب نے اس خط میں ایسا کرکے دکھلادیا کہ تدبیر بھی توکل بھی،

---

[1] اضداد سے مراد وہ ہیں جو بزعم اہل ظاہر کے اضداد ہوں نہ کہ حقیقی اضداد ۱۲ منہ

حاجی صاحب کی ایک اور حکایت جمع بین الاضداد کی یاد آئی۔ ایک مرتبہ مولانا رحمۃ اللہ صاحب نے آپ سے عرض کیا کہ میں سلطان کے پاس جا رہا ہوں اگر آپ فرما دیں تو سلطان سے آپ کا تذکرہ کر دوں۔ فرمایا کیا فائدہ ہوگا۔ بلیش برین نیست داس سے زیادہ نہیں کہ میرے معتقد ہو جاویں گے پھر اس اعتقاد کا کیا نتیجہ ہوگا بس یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ مجھ کو بلالیں گے جس کی حقیقت یہ ہوگی کہ بیت السلطان سے قرب اور بیت اللہ سے بعد ہوگا سو مجھ کو یہ منظور نہیں اس میں تو حضرت نے اپنی شان استغنا کو بیان فرمادیا۔ مگر اس میں بڑائی کا شبہ ہوسکتا تھا اس کا یہ علاج کیا کہ فرمایا لیکن میں نے سنا ہے کہ سلطان بہت عادل ہیں اور روایات میں آیا ہے کہ سلطان عادل کی دعا قبول ہوتی ہے تو آپ اُن سے میرے واسطے دعا کرا دیجئے گا۔ سبحان اللہ اس درخواست میں اپنے نفس کو کیسا مل دیا۔ حقیقت ظاہر کر دی کہ دنیوی حوائج سے تو غنا ظاہر کر دی اور دینی امور میں احتیاج ظاہر کی۔ عارف کو ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ دنیوی امور میں مخلوق سے مستغنی ہو اور دینی امور میں ہر ایک کی دعا کا محتاج ہو ظاہر میں استغنا اور تواضع کا جمع ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے مگر حاجی صاحب نے دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیا۔ مگر اس درخواست میں ناتجربہ کاری کا شبہ ہوتا تھا کیونکہ سلاطین سے دعا کرانا خلاف آداب شاہی ہے میں آپ کو اس کی ایک ترکیب بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ ان کو میری طرف سے سلام پہونچا دیجئے گا اس کے جواب میں وہ علیہ وعلیکم السلام فرمادیں گے بس دعا ہو جاوے گی اور یہ بات حضرت حاجی صاحب ہی کے قول سے ثابت ہیں کہ سلام دعا ہے اور واقعی اب معلوم ہوتا ہے کہ بڑی جامع دعا ہے کیونکہ اس میں سلامتی کی دعا ہے جو کہ عام ہے ظاہری باطنی ہر قسم کی سلامتی کو اس میں تمام مقاصد داخل ہیں مگر افسوس ہے کہ آجکل لوگوں نے اس جامع دعا کو چھوڑ کر دوسرے الفاظ آداب عرض وغیرہ اختیار کر لئے ہیں۔

ایک جگہ شیخ زادوں کے مجمع میں کسی حجام نے جا کر السلام علیکم کہا، ایک شیخ صاحب نے اٹھ کر پانچ جوتے مارے۔ حجام نے کہا کہ حضور پھر کیا کہا کروں۔ شیخ صاحب بولے کہ حضرت سلامت کہا کرو۔ اس کے بعد نماز جمعہ کا وقت آیا جب امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو وہ حجام پکار کر کہتا ہے حضرت سلامت ورحمۃ اللہ حضرت سلامت ورحمۃ اللہ۔ لوگوں نے پھر اس کو مارنا چاہا تو اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر سن لو پھر جو چاہے کر لینا۔ بات یہ ہے کہ میں نے آج شیخ صاحبوں کے مجمع میں السلام علیکم کہا تھا تو وہ بڑے خفا ہوئے اور میرے پانچ جوتے مارے اور کہا حضرت سلامت کہا کرو۔ میں ڈرا کہ اگر کہیں فرشتے بھی السلام علیکم سے ناراض ہو گئے تو وہ تو مجھے جیتا بھی نہ چھوڑیں گے کیونکہ ان میں ایک فرشتہ عزرائیل علیہ السلام بھی ہیں اس لئے میں نے نماز میں بھی حضرت سلامت کہا۔ یہ جواب سن کر شیخ زادے شرمندہ ہو کر اپنا سا منہ لے رہ گئے۔ سو بعض جگہ تو یہ غضب ہے کہ السلام علیکم سے ناراض ہوتے ہیں مگر غریب قوم کے لوگوں کو بھی اتنی رعایت چاہئے السلام علیکم تان کر نہ کہا کریں جس سے سننے والوں کو یہ شبہ ہو کہ یہ اپنے کو ان کی برابر سمجھتے ہیں۔

ایک بار میں کاندھلہ گیا بیٹھا تھا تو ایک نائی صاحب آئے اور بڑے تان کر سلام کیا یعنی سخت لہجہ میں السلام علیکم کہا مجھے اس کے لہجہ سے مساوات کا دعوے معلوم ہوتا تھا، میں نے جواب دیدیا۔ اس کے بعد اُس نے سوال کیا کہ حضرت جو سلام سے بُرا مانے وہ کیسا ہے۔ میں نے کہا جو سلام سے برا مانے وہ بہت بُرا اور جو تان کر سلام کرے جس سے مساوات کا دعوے ٹپکتا ہو وہ اس سے بھی بُرا وہاں جتنے رئیس بیٹھے تھے سب ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ اس مرض کو تم نے سمجھا سلام سے بھلا کون بُرا مانتا ہے مگر اس کے طرز سے لوگوں کو ناگواری ہوتی ہے اور فی الواقع چھوٹوں کا دعوے مساوات تو ناگوار ہوتا ہی ہے۔ بیٹا چاہے کیسے ہی بڑے درجہ پر ہو باپ سے تو ادنیٰ ہی ہے پھر اگر وہ باپ کی برابری کرنے لگے تو یقیناً بُرا معلوم ہوگا بیٹا ظاہر میں تو باپ سے کم ہی ہے گو باپ کافر ہی ہو اس کا بھی ادب

ضروری ہے ورنہ سلام سے مسلمانوں کو کیوں ناگواری ہونے لگی۔

حدیث میں آتا ہے کہ جنت میں حق تعالےٰ مسلمانوں کو سلام فرمائیں گے یعنی اہل جنت سے فرمائیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ قرآن شریف میں ہے سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِیْمِ (ان کو پروردگار مہربان کی طرف سے سلام فرمایا جاویگا) نیز تشہد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللہِ وَبَرَکَاتُهٗ (سلام تم پر اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اللہ تعالےٰ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں) کہا جاتا ہے تو ہر مسلمان روزانہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سلام کرتا ہے پھر یہ کیوں برا ہونے لگا۔ یہ تو بیچ میں کچھ جملے معترضہ آگئے تھے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو شیخ سب کو تارک بنانا چاہے وہ اناڑی ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے ان بی بی کو جائداد وقف کرنے سے منع فرمایا۔ امام سفیان ثوریؒ باوجودیکہ بہت بڑے تارک تھے حتیٰ کہ خلیفہ ہارون رشید جو خلافت سے پہلے ان کا بڑا دوست تھا خلیفہ ہونے کے بعد انہوں نے ہارون رشید سے ملنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ بیت المال میں ان کے مذاق کے موافق احتیاط نہ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ہارون رشید کا خط ان کے پاس آیا تو اس کو ہاتھ سے نہیں کھولا بلکہ ایک لکڑی سے کھولا۔ خط میں ہارون رشید نے ان کی شکایت کی تھی کہ آپ نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا امام سفیان ثوری نے سخت جواب دیا اور لکھا کہ تم بیت المال میں بیجا تصرف کرتے ہو قیامت میں تم سے اس کی باز پرس ہوگی اس لئے میں تم سے نہیں ملنا چاہتا مبادا کہیں میں بھی غضب میں گرفتار نہ ہو جاؤں وقف کا مال بہت احتیاط کے قابل ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چراغ جلا کر کچھ کام کر رہے تھے کہ اتنے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ تشریف لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے چراغ فوراً گل کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے پوچھا کہ میرے آتے ہی آپ نے چراغ کیوں بجھا دیا فرمایا کہ اس میں بیت المال کا تیل ہے اب تک تو میں بیت المال کا کام کر رہا تھا اس لئے میرے واسطے مباح تھا اور اب ہم دونوں باتیں کریں گے

اس کے لئے بیت المال کا تیل جلانا جائز نہیں۔ اس لئے میں نے چراغ گل کر دیا۔

سبحان اللہ حضرات صحابہ میں کیسی احتیاط تھی اگر آجکل کوئی شخص ایسی احتیاط کرنے لگے تو عوام تو کیا خواص بھی اسے وہمی کہنے لگیں۔

میرے ایک دوست کا قصہ ہے کہ وہ ایک اسلامی مدرسہ میں مہمان ہوئے مغرب کے بعد مہتمم صاحب نے کسی خادم کو حکم دیا کہ ان کے کمرہ میں لالٹین روشن کر دے انہوں نے فوراً ہی کہا کہ اگر مہتمم صاحب کا تیل ہو تو لانا اور اگر مدرسہ کا ہو مت لانا۔ وہاں ایک بزرگ خانصاحب تشریف فرما تھے جو ہمارے حضرات کے صحبت یافتہ ہیں وہ کہنے لگے کہ یہ شخص اشرف علی کا تعلیم یافتہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایسی احتیاط اسی کے یہاں ہے۔ ان باتوں پر لوگ مجھے وہمی کہتے ہیں مگر ایسا وہم بھی مبارک ہے جو حضرات سلف کے مذاق سے مطابق ہو۔ تو امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اتنے بڑے تو تارک تھے مگر وہ فرماتے ہیں کہ وہ زمانہ گذر گیا جبکہ روپیہ رکھنا مضر تھا آجکل روپیہ جمع کرنا مفید ہے کیونکہ آجکل افلاس کا سب سے پہلا اثر دین پر ہوتا ہے کہ مفلسی میں انسان کو حرام و حلال کی کچھ تمیز نہیں رہتی پھر فرمایا کہ ہمارے پاس یہ دنانیر نہ ہوتے تو یہ امراء ہم کو دستمال بنا دیتے۔ مگر مال کی بدولت یہ ہم کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ اکبر یہ وہ زمانہ ہے جو خیر القرون میں داخل ہے جو صحابہ کے زمانہ سے بہت قریب ہے۔ امام سفیان ثوری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ اس زمانہ کے بابت فرما رہے ہیں کہ اس وقت مال جمع کرنا مفید ہے اس سے قیاس کر لیا جائے کہ آجکل مال جمع کرنا کتنا ضروری ہے۔ پس جس مسلمان کے پاس کچھ ذخیرہ ہو اُسے چاہئے کہ احتیاط سے خرچ کرے اسراف نہ کرے لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا[1] ۔ شاید کسی وقت ضرورت ہو جائے تو پریشان نہ ہونا پڑے۔ اسی طرح بخل بھی نہ کرو اس کی علت بھی وہی ہے لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا ۔ (شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں) کیونکہ بخل سے بعض دفعہ ضرورت کے موقعہ میں بھی

[1] ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں۔

تنگی کی جاتی ہے اور اتنی تنگی کے بعد پھر ندامت ہوتی ہے کہ ہائے ہم نے اس موقعہ میں کیوں نہ خرچ کیا۔ مثلاً کسی نیک کام کے لئے چندہ ہو رہا ہے جس میں بہت کچھ ثواب ملنے کی امید ہے بخیل آدمی ایسے موقعہ میں بھی تنگی کرتا ہے پھر بعد میں اُسے افسوس ہوتا ہے لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا ۝ (شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں) یہاں بھی صادق ہے اب میں اسراف کے متعلق ایک بات بتلاتا ہوں جو شاید آج تک نہ سنی ہو گی وہ یہ کہ اسراف کی حقیقت مشہور یہ ہے کہ معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے اس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ قیمتی کپڑے پہننا اور گھر کے لئے زینت و آرائش کا سامان خریدنا اسراف میں داخل نہیں کیونکہ یہ انفاق امور محرمہ میں نہیں ہے اور بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ بلا ضرورت خرچ کرنا اسراف ہے گو مباح ہی میں صرف کیا جائے ان کے نزدیک زیادہ قیمتی لباس بھی اسراف میں داخل ہے کیونکہ وہ ان کے نزدیک بلا ضرورت ہے مگر یہ دونوں باتیں غلط ہیں بلکہ اسراف کے لئے دو حدیں اور واقع میں وہ ایک ہی حد ہے لیکن میں تفصیل کرنے کے لئے ان کو دو قرار دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ اسراف کے معنے تو وہی ہیں جو پہلے بیان کئے گئے یعنی انفاق فی المعصیت (گناہ میں خرچ کرنا) لیکن معاصی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو فی نفسہٖ معاصی ہیں جیسے زنا اور تفاخر وغیرہ ان میں خرچ کرنا تو ہر شخص کے لئے اسراف ہے اور حرام ہے اور بعض معاصی وہ ہیں جو فی نفسہ معاصی نہیں بلکہ مفضی الی المعصیت (گناہ کی طرف پہونچانے والا) ہونے کی وجہ سے معاصی بن گئے۔ ایسے مواقع میں خرچ کرنا مطلقاً حرام نہیں بلکہ جس کے لئے وہ فعل سبب معصیت بن جائے اس کے لئے حرام اور جس کے لئے سبب معصیت نہ ہو اس کے لئے جائز ہے تو اسراف کی ایک قسم ایسی نکلی جو ہر ایک کے لئے اسراف نہیں بلکہ بعض کے لئے اسراف ہے اور بعض کے لئے مباح ہے۔ مثلاً چار روپیہ کا حلوہ کھانا یہ ہر ایک کے لئے اسراف نہیں بلکہ جس شخص کے پاس روپیہ حاجت سے زیادہ ہو اور چار روپیہ کا حلوا کھانے سے اس پر قرض بھی نہ ہو یا قرض ہو مگر اس کا ادا کرنا اسے آسان ہو

اور کسی قسم کی پریشانی اس کو نہ ہو اس کو چار روپیہ کا حلوا کھانا یا عمدہ غذائیں کھانا جائز ہے اور جس شخص پر حلوا کھانے یا عمدہ عمدہ غذائیں پکوانے سے سودی قرض ہوتا ہے اس کے لئے یہ اسراف ہے کیونکہ اس کے حق میں یہ مقضی الی المعصیت (گناہ کی طرف پہونچانے والا) ہے۔ اسی طرح دو روپے گز کا کپڑا پہننا پہلے شخص کے لئے جائز ہے اور دوسرے کے لئے اسراف اسی طرح مکان بنانا ایک تو ضرورت کے موافق ہے یہ توسب کو جائز ہے۔ اور ایک ضرورت سے زیادہ ہے یہ بعض کے لئے جائز ہے بعض کے لئے اسراف ہے۔ جو شخص مرجع خلائق ہو کہ اس کے یہاں مہمان بکثرت آتے ہوں وہ لوگوں کو ٹھہرانے کے لئے اپنی حاجت سے زیادہ مکان بنا دے تو جائز ہے بلکہ طاعت ہے اور جس کے یہاں مہمانداری زائد نہیں ہے اس کو ضرورت سے زیادہ مکان بنانا اسراف ہے۔ ہاں اگر یہ نیت ہو کہ ایک مکان میں خود رہیں گے اور دوسرے مکانات کرایہ پر دے کر ان سے روپیہ وصول کریں گے اس صورت میں بھی زیادہ مکان بنانا اسراف میں داخل نہیں۔

اسی طرح مہمان کو عمدہ کھانا کھلانا اگر اس میں عجب و ریا و تفاخر نہ ہو احسان جتلانے کی نیت نہ ہو نہ اُس سے مقروض ہونے کا اندیشہ ہو محض تطییب خاطر ضیف کی نیت سے اپنی وسعت کا لحاظ کر کے عمدہ کھانے پکائے جائیں تو اس حالت میں یہ فعل اسراف نہیں اور جو شخص زیادہ سامان کرنے سے ان بلاؤں میں مبتلا ہو جائے اس کو زیادہ سامان کرنا حرام اور اسراف ہے۔ اس کو چاہیئے کہ جو موجود ہو مہمان کے سامنے رکھدے۔ اور اگر کچھ نہ ہو تو فاقہ کرے اور مہمان کو بھی فاقہ کی اطلاع کر دے۔

حضرت شاہ ابوالمعالی کے پیر ایک مرتبہ ان کے گھر پر تشریف لائے شاہ صاحب کہیں گئے ہوئے تھے اور اُس دن ان کے گھر پر فاقہ تھا ان کی بیوی کو جب معلوم ہوا کہ پیر صاحب تشریف لائے ہیں تو ان کو فکر ہوئی کہ پیر صاحب کب کب تشریف لاتے ہیں اگر آج ان کو بھی فاقہ کرایا تو بڑی بیجا بات ہے ماما کو

محلہ میں بھیجا کہ کسی سے آٹا دال قرض لے آوے مگر غریبوں کو قرض بھی کوئی نہیں دیا کرتا کہیں سے آٹا دال نہ ملا پھر دوسری مرتبہ بھیجا کہ پیسے ہی قرض مل جاویں تو بازار سے جنس منگالیں گے مگر کہیں سے دام بھی اُدھار نہ ملے پیر صاحب نے جو بار بار ماما کو آتے جاتے دیکھا تو کچھ کھٹکے اس سے دریافت کیا کہ تو کس فکر میں بار بار آتی جاتی ہے۔ اس نے کہا حضور بات تو کہنے کی نہیں مگر مرشد سے کیا پردہ۔ بات یہ ہے کہ آج شاہ صاحب کے یہاں فاقہ ہے۔ میں اس فکر میں ہوں کہ کہیں سے آٹا دال یا پیسے اودھار مل جاویں تو آپ کے لئے کھانا تیار ہو جاوے۔ مگر کہیں سے کچھ بھی نہیں ملا حضرت شیخ کو یہ حال سنکر رنج ہوا اپنے پاس سے انھوں نے ایک روپیہ نکال کر دیا کہ جاؤ اس کا غلّہ منگاؤ اور کھانا تیار کراؤ۔ اور جب غلّہ آجاوے تو ہمارے پاس لے آنا چنانچہ غلّہ لایا گیا آپ نے ایک تعویذ لکھ کر غلّہ میں رکھ دیا۔ اس کی ایسی برکت ہوئی کہ غلّہ کسی طرح ختم ہی نہ ہوا اور عرصہ تک فاقہ کی نوبت نہ آئی۔

حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب سفر سے واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ بہت دنوں سے روزانہ بلا تکلف کھانا پک رہا ہے فاقہ ہی نہیں ہوتا ان کو تعجب ہوا کہ میرے پیچھے اتنا غلّہ کہاں سے آگیا آخر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پیر صاحب تعویذ دے گئے ہیں، وہ بڑے پریشان ہوئے کیونکہ وہ فاقہ کے مشتاق تھے ان حضرات کا فاقہ اختیاری تھا اب ایسے وقت میں اگر کوئی غیر عارف ہوتا تو یوں کہتا ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

(قعر دریا میں مجھ کو تختہ سے باندھ کر ڈال دیا پھر کہتے ہو دیکھ ہوشیار رہ دامن تر نہ ہو)

کیونکہ یہاں دو چیزوں میں تعارض ہو رہا ہے اگر پیر کا تعویذ غلّہ سے نکال کر الگ کرتے ہیں تو اس میں بظاہر پیر سے اپنے بڑے ہونے کا دعویٰ ہے اور اگر الگ نہیں

کرتے تو اپنے مذاق توحید کے خلاف ہے۔ مگر شاہ صاحب عارف تھے انھوں نے دونوں کو خوب جمع کیا فرمایا کہ پیر صاحب کے تعویذ کی برکت کا ہمارا سر زیادہ مستحق ہے غلہ میں رکھنے سے اس کی بے ادبی ہوتی ہے لاؤ اس تعویذ کو ہم اپنے سر سے باندھیں گے چنانچہ وہ نکال کر لایا گیا اور شاہ صاحب نے اس کو اپنے سر سے باندھ لیا۔ دو تین روز میں غلہ ختم ہو گیا اور پھر وہی حالت ہو گئی جو پہلے تھی۔ کبھی فاقہ تھا کبھی کھانے پکتے تھے۔ شاید کوئی منطقی یہ کہے کہ اگر شاہ صاحب کو فاقہ کا ایسا ہی شوق تھا تو اس کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ تعویذ کو غلہ ہی میں رہنے دیتے تاکہ اس میں بھی برکت رہتی اور خود فاقہ کر لیا کرتے تو یاد رکھو یہاں منطق نہیں چل سکتی یہ معرفت کا طریق ہے جس کا فتویٰ یہ ہے کہ موجود ہوتے ہوئے فاقہ کرنا خلاف ادب ہے۔ مگر بیماری میں فاقہ کرنا خلاف ادب نہیں گو گھر میں سب کچھ موجود ہو۔ تو دیکھئے یہ حضرات کیسے بے تکلف تھے کہ ان کی تعلیم یافتہ ماما نے پیر کو بھی فاقہ کی اطلاع کر دی۔

اسی طرح ہمارے استاد علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے کے یہاں ایک بار مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مہمان ہوئے۔ اس دن ان کے یہاں فاقہ تھا انھوں نے بے تکلف مولانا سے عرض کر دیا کہ آج میرے یہاں تو فاقہ ہے اور قرض کو جی نہیں مانتا اگر آپ فرمائیں تو بعض لوگ آپ کی دعوت کرنے کے مشتاق یہاں موجود ہیں ان سے کسی کو دعوت کی اجازت دیدوں، مولانا نے فرمایا کہ ہرگز نہیں میں تو تیرا مہمان ہوں اگر تیرے یہاں فاقہ ہے تو میں بھی فاقہ کروں گا' چنانچہ شام تک مولانا کا بھی فاقہ رہا۔ مغرب کے قریب ایک آدمی گاؤں سے آیا اور حکیم صاحب کو گیارہ روپے دے گیا کیونکہ اس کا کوئی عزیز حکیم صاحب کے علاج سے اچھا ہوا تھا حکیم صاحب وہ روپے لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت آپ کی برکت سے خدا تعالیٰ نے یہ روپے بھیجدیئے ہیں اب میں عمدہ کھانا پکواؤنگا حضرت نے منع فرمایا کہ بھائی تکلف مت کرو، مگر وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ حضرت

دن بھر تو فاقہ رہا اب بھی عمدہ کھانا نہ کھاویں غرض عشاء کے وقت تک پلاؤ وغیرہ بہت عمدہ تیار کرادیا۔ تو میزبان کو ایسا ہی بے تکلف ہونا چاہیئے مگر مہمان کو زیادہ بے تکلف نہ بننا چاہیئے کہ لگیں طرح طرح کی فرمائشیں کرنے دوسرے یہ کہ میزبان اگر تکلف ہی میں رہے تو کب تک رہے گا۔ تم نے آج دو آدمیوں کے واسطے اُدھار قرض کرلیا روز روز کس کس کے لئے اُدھار کرتے پھروگے کیونکہ آنے والوں کی یہ عادت ہے کہ جس شخص کو زیادہ مہمان نواز دیکھتے ہیں اس کے یہاں باربار آمدورفت رکھتے ہیں حتیٰ کہ وہ غریب تنگ آجاتا ہے مہمان بننے والوں کو اس کی ذرا فکر نہیں ہوتی کہ میزبان غریب کیا گذر رہی ہے اس لئے مجھے ایسے شخص پر بہت رحم آیا کرتا ہے جو مہمان نوازی میں مشہور ہو۔ اس کے یہاں بعض لوگ محض کھانے ہی کے واسطے پڑے رہتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بے حیا بھی بہت ہیں۔

تھانہ بھون میں ایک ملا تھا اس بےچارہ کے یہاں مہمانوں کی کثرت رہتی حتیٰ کہ اُسے اُدھار قرض کرنا پڑتا تھا، اس نے مجھ سے شکایت کی۔ میں نے کہا کہ تم مہمانوں کے لئے نہ کچھ اہتمام اور انتظام کیا کرو اور نہ ان کو جواب دیا کرو۔ بس جتنی روٹیاں تمہارے پاس ہوا کریں وہی سب کے سامنے رکھدیا کرو چاہے کسی کا پیٹ بھرے یا نہ بھرے اُدھار قرض کرکے ہرگز نہ کرو جب لوگ بھوکے رہیں گے خود ہی آنا چھوڑدیں گے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا تب اس کا پیچھا چھوٹا۔ تو یہ آنے والے مہمان اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے کہ جس کے یہاں ہم جارہے ہیں اس پر کیا گذر رہی ہے ان کو تو اپنے کھانے سے کام دوسرے کی کیا فکر بلکہ بعض لوگ تو سفر ہی اسی واسطے کرتے ہیں تاکہ چند روز عمدہ عمدہ کھانے ملیں گے۔

جیسا کانپور میں ایک طالب علم تھے وہ کہا کرتے تھے کہ جو لوگ فارغ ہوکر دستاربندی کرالیتے ہیں بڑے بے وقوف ہیں کیونکہ پھر مدرسہ کی روٹیاں نہیں ملتیں اسی لئے ہم تو اتنے عرصہ سے مدرسہ میں پڑے ہیں مگر نورالانوار سے آگے نہیں بڑھتے تاکہ فراغت کے بعد روٹیاں بند نہ ہوجاویں تو اس بندہ خدا کو پڑھنے سے بھی

روٹیاں ہی مقصود تھیں۔

مثل مشہور ہے کہ کسی طالب سے کسی نے پوچھا دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا چار روٹیاں وہ بھی کوئی ایسا ہی بندۂ شکم ہوگا جس کو پڑھنے پڑھانے سے روٹیاں ہی مقصود ہوں گی۔

اسی طرح ایک بسیار خوار سے کسی نے پوچھا کہ تم کو قرآن کا کونسا مضمون یاد ہے۔ کہنے لگا دو آیتیں ایک احکام کی ایک دعا کی۔ احکام میں کُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ اور پیو) دعا میں رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (اے پروردگار ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما) سو بعضے مہمان بھی ایسے ہوتے ہیں۔ اس لئے میں کہہ رہا تھا کہ میزبان کو بے تکلف ہونا چاہیے کہ جو موجود ہو سامنے رکھ دے اور اگر کچھ نہ ہو تو مہمان کو فاقہ کی اطلاع کر دے خوامخواہ دوسروں کے لئے قرض نہ کرے۔ قرض سے بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ قرض لینا جائز ہے اگر ضرورت ہو اور پریشانی نہ ہو مگر پریشانی میں طبائع مختلف ہیں۔ بعض لوگوں کو قرض سے پریشانی نہیں ہوتی اور بعض کو بہت پریشانی ہوتی ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ اپنی وصیت میں تحریر فرماتے ہیں کہ بندہ پر کبھی قرض نہیں ہوتا۔ وہ تو قرض سے اتنا بچتے تھے کہ وصیت میں بے تکلف لکھ گئے کہ میرے قرض ادا کرنے کی کوئی فکر نہ کرے مجھ پر قرض ہوتا ہی نہیں۔

اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ پر قرض ہوتا تھا یہاں تک کہ وصال کے وقت مولانا کے ذمہ کئی ہزار روپیہ قرض تھے جو ایک رئیس صاحب نے تنہا ادا کر دیئے۔ تو بزرگوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

(ترجمہ :- گل کے کان میں کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہے۔ بلبل سے کیا فرما دیا ہے کہ نالاں ہے)

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست ۔۔۔ ور بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب آئیم مستان ویئم ۔۔۔ ور بہ بیداری بہ دستان ویئم

در تردد ہر کہ او آشفتہ است ۔۔۔ حق بگوش او معما گفتہ است

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ ان کا ایوان ہے کہ تصرف حق سے علم کا درجہ حاصل ہو اور جہل میں مبتلا رہیں تو ان کا زندان ہے کہ حق تعالےٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سو رہیں تو انھیں کے بے ہوش کیے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں۔ جو شخص کسی تردد میں گرفتار ہو رہا ہے گویا حق تعالےٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہدیا ہے)

اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ مدیون کی روح دین کی وجہ سے معلق رہتی ہے جنت میں داخل نہیں ہوتی سو وہ اس پر محمول ہے کہ قرض بلا ضرورت ہو اور ادا کا قصد نہ ہو اور اگر بضرورت ہو اور ادا کا پختہ قصد ہو تو اس کیلئے وعدہ ہے کہ حق تعالےٰ یا تو اس کا قرض دنیا ہی میں ادا کر دیں گے ورنہ آخرت میں دائن سے معاف کرا دیں گے۔ اسی لئے بعض اہل اللہ قرض پر بہت جری ہوتے تھے۔ حضرت شیخ احمد خضرویہ رح بہت مقروض تھے مگر ایسے ہی آمدنی بھی بہت تھی لوگ معتقد تھے نذرانے بہت آتے تھے اس لئے کوئی شخص قرض دینے سے انکار نہ کرتا تھا جب وہ مرنے لگے تو سب لوگوں کو اپنے اپنے روپیہ کی فکر ہوئی اور انھوں نے گھر پر آ کر تقاضا شروع کیا کہ آپ تو مر رہے ہیں ہماری رقم کہاں ہے آپ خاموش ہو کر منہ ڈھانک کر لیٹ گئے۔ فرمایا، خدا پر نظر رکھو۔ اتنے میں ایک حلوائی کا لڑکا حلوا بیچتا ہوا سامنے سے گذرا آپ نے اسے بلایا

اور سارا حلوا خرید کر لوگوں کو کھلا دیا۔ لڑکے نے دام مانگے تو آپ نے فرمایا کہ بھائی یہ لوگ بھی اپنے دام ہی مانگ رہے تو بھی ان کے ساتھ بیٹھ جا۔ یہ سن کر لڑکے نے رونا شروع کیا کہ ہائے مجھے تو میرا باپ مار ڈالے گا۔ لڑکے کے رونے کو دیکھ کر سب لوگوں کو شیخ پر غصہ آیا کہ بھلا ان بزرگ کو مرتے مرتے بھی قرض کرنے کی کیا ضرورت تھی مگر ان کو کیا خبر تھی کہ انھوں نے قرض خواہوں کی ضرورت سے یہ کام کیا تھا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ کسی امیر کا ایک خادم ایک سینی میں اشرفیاں لے کر حاضر خدمت ہوا اور حضرت شیخ سے عرض کیا کہ فلاں امیر نے یہ ہدیہ خدمت والا میں ارسال کیا ہے آپ نے اسے قبول فرمایا دیکھا تو بالکل قرض کے برابر تھا اسی وقت آپ نے سب قرضہ ادا فرما دیا۔ اب تو لوگ بڑے معتقد ہوئے کہ واقعی مقبول بندے ہیں۔

کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت، آپ نے حلوائی کے لڑکے کا حلوا بلا ضرورت کیوں خرید فرمایا تھا۔ اس سے تو بڑی ذلت ہو رہی تھی فرمایا کہ یہ سارے قرض خواہ جب یہاں آکر بیٹھے ہیں نے دعا کی ارشاد ہوا کہ ہمارے یہاں کچھ کمی نہیں مگر اس وقت کوئی رونے والا ہونا چاہیئے اور ان میں کوئی رونے والا ہے نہیں۔ میں نے یہ رونے کی ترکیب کی تھی۔

اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

تا نہ گرید کودک حلوا فروش ... بحر بخشائش نمی آید بجوش
تا نگرید طفل کے جوشد لبن ... تا نہ گرید ابر کے خندد چمن
گر تو خواہی کز بلا جاں وا خری ... جان خود را در تضرع آوری
در تضرع باش تا شاداں شوی ... گریہ کن تا بے دہاں خنداں شوی

(جب تک حلوا فروش لڑکا نہ رویا بخشش کا دریا جوش میں نہ آیا۔ جب تک بچہ نہیں روتا ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں جوش مارتا۔ جب تک ابر نہ برسے چمن سرسبز نہیں ہوتا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ بلا سے جان تمہاری

چھوٹ جائے تو جان سے گریہ وزاری کرو تاکہ تم کو خوشی حاصل ہو گریہ کرو تاکہ بے دہان ہنسنے والے ہو)

پھر فرماتے ہیں ؎

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست
مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(ہر گریہ وزاری کے بعد خوشی ہے مرد آخر بیں مبارک بندہ ہے)

اس شعر میں اکبر حسین جج مرحوم نے لطیفہ کیا وہ کہتے ہیں ؎

در پس ہر لکچر آخر چندہ ایست
مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(ہر لکچر کے بعد چندہ ہے انجام سوچنے والا مبارک بندہ ہے)

وہ کہتے تھے کہ مولویوں کے وعظ تو سیکڑوں ایسے سنے ہوں گے جو چندہ کے ذکر سے خالی ہوں گے مگر لکچر ایک بھی ایسا نہ ہوگا۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرض سے پریشانی ہونے میں طبائع مختلف ہیں بعض لوگوں کو اس سے پریشانی نہیں ہوتی۔ لہذا ایسے لوگوں کو قرض کرنا جائز ہے۔ غرض اسراف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مصرف تو جائز ہے مگر اس میں خرچ کرنے سے گناہ پیدا ہو سکتے ہیں تو جہاں مصرف جائز سے بھی گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اس کو بھی اسراف کہا جائے گا اور جس کو یہ اندیشہ نہ ہو اس کے لئے وہ اسراف نہیں۔ اسپر ایک حکایت اور یاد آئی۔ حافظ محمد یوسف صاحب تھانوی نے بیان فرمایا کہ بھوپال میں ایک مرتبہ سنتیں پڑھتے ہوئے سخت بارش آگئی سب لوگ نماز توڑ توڑ کر کوئی جلدی جلدی پوری کر کے اندر بھاگ گئے مگر ایک شخص جو نہایت عمدہ قیمتی لباس پہنے ہوئے تھے اطمینان سے نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ ان کا قیمتی لباس سب بھیگ گیا مگر انھوں نے اس کی ذرا پروا نہیں کی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے اپنے کپڑے خراب کر لئے نماز مختصر کر کے اندر کیوں نہ آگئے۔ کہا مجھے خدا نے کپڑے بہت

دیئے ہیں میں گھر جا کر دوسرا جوڑا بدل لوں گا لیکن دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ محض کپڑوں کی خاطر میں نماز کو مختصر کروں۔ اس شخص کو قیمتی کپڑا پہننا جائز تھا کہ اس کی وجہ سے نماز میں قلب ذرا مشغول نہ ہوا اور ایسے لوگوں کو اجازت نہیں جن کی یہ حالت ہے کہ جب عمدہ کپڑا پہنتے ہیں تو خدا تعالےٰ کے حکم کا خیال نہیں رہتا کپڑوں کی وجہ سے نماز برباد کر دیتے ہیں بعض لوگ عمدہ لباس پہنکر ایسے تکلف سے نماز پڑھتے ہیں کہ جب تک ان کے پاس والا آدمی کھڑا نہ ہو جائے اس وقت تک وہ نہیں اٹھتے۔ یہ سوچتے ہیں کہ ایسا نہ ہو ہمارا کپڑا دوسرے آدمی کے نیچے دب جائے اور اٹھتے ہوئے جھر جھر ہو جائے اس لئے وہ بعد میں اٹھتے ہیں تو ان کی ساری نماز کپڑوں کے سنبھالنے میں ختم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کو قیمتی کپڑا پہننا مکروہ ہے۔

ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جمعہ کے دن ایک نیا کرتہ پہنا جو ان کو اچھا معلوم ہوا، آپ نے قینچی منگا کر اس کی دونوں آستین کاٹ ڈالیں لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں یہ کرتہ پہن کر اپنے کو اچھا لگا اور جس وقت انسان اپنی نگاہ میں اچھا لگے اس وقت وہ خدا کی نظر میں بُرا ہوتا ہے اس لئے میں نے کرتہ کو معیوب کر دیا تھا تاکہ اس پر نظر نہ رہے۔

سبحان اللہ ان حضرات کو اپنے نفس کی کیسی نگہداشت تھی ان کو قیمتی کپڑا پہننا بالکل جائز تھا کیونکہ ان کو قیمتی لباس سے اپنے اوپر نظر نہ ہوتی تھی اور اگر کبھی اس کا شبہ ہوتا تھا تو فوراً ہی اُس کا علاج کر لیتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں کسی جگہ سے ایک آئینہ بہت قیمتی ہدیہ میں آیا۔ حضرت شیخ کنگھی کرتے ہوئے اُسے سامنے رکھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ خادم ہاتھ میں آئینہ لئے آتا تھا اتفاق سے گر کر ٹوٹ گیا خادم کو خوف ہوا کہ دیکھئے آج خفگی نہ ہو۔ اُسنے آکر عرض کیا ؎

از قضا آئینہ چینی شکست (قضاء الٰہی سے چینی آئینہ ٹوٹ گیا)

آپ نے فوراً جواب دیا ؎

خوب شد اسباب خود بینی شکست (اچھا ہوا کہ اسباب بینی ٹوٹ گیا)
معلوم ہو گیا کہ شیخ کے دل کو اس سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا جب تک موجود رہا خدا کی نعمت سمجھ کر استعمال کرتے رہے، جب ٹوٹ گیا تو دل پر ذرا بھی گرانی نہ تھی۔ اس حالت میں آپ کو قیمتی سے قیمتی سامان رکھنا بھی جائز تھا اسے اسراف نہ کہا جائے گا اور جس کو قیمتی سامان سے تعلق اور لگاؤ ہو جائے اس کے لئے ایسا سامان اسراف میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ بعض دفعہ ایک مرید کو خوش پوشاکی پر زجر فرماتے ہیں اور دوسرے کو کچھ نہیں کہتے۔ اس کا منشا یہی ہے وہ دیکھتے ہیں کہ اس کے قلب کو اس سے لگاؤ ہوتا ہے اور دوسرے کے قلب کو لگاؤ نہیں ہوتا۔ یہ مضمون بہت طویل ہو گیا مگر کچھ مضائقہ نہیں بہت سے کارآمد مضامین بحمد اللہ بیان ہو گئے۔

میں یہ بتلا رہا تھا کہ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں) ایسی عام حکمت ہے جو طلاق کے علاوہ تمام احکام میں جاری ہے۔ چنانچہ اسراف اور بخل میں بھی حکمت جاری ہے۔ اسی طرح ایک اور مثال بیان کرتا ہوں۔

دشمنی اور دوستی کے لئے بھی شریعت نے ایک حد مقرر کی ہے اور اس میں بھی اس حکمت کا جریان بہت واضح ہے بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا مَّا وابغض بَغِيْضَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ حَبِيْبَكَ يَوْمًا مَّا یعنی دوست کے ساتھ دوستی اعتدال کے ساتھ کرو۔ شاید وہ کسی وقت تمہارا دشمن ہو جاوے تو تمہارے سارے راز معلوم ہونے کے سبب تم کو ضرر پہونچاوے۔ اور دشمن کے ساتھ دشمنی بھی اعتدال سے کرو شاید وہ کسی وقت دوست ہو جاوے تو آنکھیں سامنے کرتے ہوئے حجاب نہ ہو۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر ساری دنیا کے عقلاء جمع ہو جاویں تو اس ذات پاک حضور صلی اللہ

کی پیرا بر ہرگز حکمتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ نے دوستی اور دشمنی کی کیسی حد بتلا دی کہ دوستی ایسی کرو کہ اگر وہ کسی وقت دشمن ہو جاوے تو تم کو پریشانی نہ ہو۔ اور دشمنی بھی ایسی کرو کہ اگر کسی وقت دوست ہو جاوے تو آنکھیں سامنے کرتے ہوئے ندامت نہ ہو یہ وہی حکمت ہے لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا (شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں) کہ دوستی اور دشمنی کرتے ہوئے یہ سوچ لیا کرو کہ شاید حق تعالیٰ بعد میں کوئی نئی بات پیدا کر دیں۔ پھر نادم ہونا پڑے تو اسی وقت اس کی رعایت کر لینی چاہیئے۔ کیا کوئی حکیم ہے جس کی باتوں میں ایسی حکمتیں ہوں ہرگز نہیں۔ اب ہماری حالت یہ ہے کہ نہ ہماری دوستی کی کوئی حد ہے نہ دشمنی کی۔ دوستی کریں گے تو ایسی کہ دوست کو بھائی اور اولاد سے بھی بڑھا دیں گے۔ بھائی سے تو روپے پیسے کا بھی حساب ہوتا ہوگا اور دوست سے کسی کا چیز کا حساب نہیں وہ جو چاہے کرے، پورا خود مختار ہے۔ اس کے سامنے اپنے سارے راز بیان کر دیتے ہیں حتّٰی کہ خاندانی جھگڑے بھی سب اس کے سامنے کھول دیتے ہیں۔ عزیزوں سے تو کچھ پردہ بھی ہوتا ہے مگر دوستوں سے کسی بات کا پردہ ہی نہیں ہوتا جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی وقت وہ دشمنی پر آمادہ ہو گیا تو ان حضرت کے سارے راز ظاہر کر دے گا۔ میں کہتا ہوں کہ دوستوں سے اپنے خاص راز ہرگز ظاہر نہ کرو۔ پیر سے زیادہ کوئی دوست نہیں ہوتا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ پیر سے بھی وہی راز ظاہر کرے جن سے اصلاح کا تعلق ہو۔ باقی راز مت ظاہر کرو۔ شاید کوئی یہ کہے کہ کیا پیر بھی دشمن ہو سکتا ہے۔ اگر اس میں ایسا احتمال ہو تو پھر وہ پیر بننے کے لائق ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ دشمن نہ ہوا تو شاید تم دشمن ہو جاؤ۔ اور اس کا آجکل مشاہدہ ہو رہا ہے کہ بعض لوگ ایک عرصہ تک کسی کے معتقد تھے مگر پھر کسی بات پر پیر کے دشمن ہو گئے کیونکہ وہ بات ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ افسوس یہ ایک تعلق ایسا تھا جس کو تمام تعلقات سے قوی سمجھا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں اس کے لئے بھی بقا نہیں۔ بس جب تک پیر سے کوئی بات اپنی طبیعت کے خلاف

صادر نہ ہوا اس وقت تک تو وہ پیر ہے، قطب ہے اور بڑا ولی ہے اور جس دن مرید کی طبیعت کے خلاف کوئی بات اس سے ظاہر ہوئی گو وہ شریعت کے بالکل مطابق ہو مثلاً اس نے زجر و تنبیہہ کے طور پر مرید کو اپنے یہاں سے نکالدیا یا مجمع عام میں اس کو بُرا بھلا کہدیا۔ اب یہ حضرت پیر کے بھی دشمن ہو گئے اور اس کے خاندان کے بھی تو میں کہتا ہوں کہ پیر کا دشمن ہو جانا اگر بعید معلوم ہوتا ہے تو آپ کا دشمن ہو جانا کچھ بھی بعید نہیں۔ تو اسی خیال سے آپ سارے راز اس کے سامنے ظاہر نہ کیجئے کہ نہ معلوم ہم آج اُن کے معتقد ہیں کل کو ہم کیسے ہوں گے اس وقت افسوس کرنا پڑیگا۔ ہم نے بے ضرورت اپنے اسرار پر کسی کو کیوں مطلع کر دیا۔ دوسرے پیر بھی آخر بشر ہے اگر وہی دشمن ہو جاوے تو کیا محال ہے حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ہمارے استاد الاستاد فرماتے تھے کہ راحت اگر چاہتے ہو تو کسی سے توقع نہ رکھو۔ کیونکہ اکثر رنج و غم کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ہم کو کسی سے امید تو او رکچھ اور اُس سے برتاؤ اور کچھ ظاہر ہوا پھر مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ بھائی میں کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی امید نہ رکھو۔ اللہ اکبر یہی تو اہل اللہ کی علامت ہے، کہ وہ معاملات میں اپنے کو بھی دوسروں کی برابر سمجھتے ہیں چنانچہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ صحابہ کے ساتھ ایسا ہی تھا کہ کوئی خاص امتیازی شان آپ نے اپنے واسطے نہیں رکھی تھی۔ حدیث میں ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان پر تشریف لے گئے تو آپ نے تین بار السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ (السلام علیکم میں اندر آؤں) فرمایا۔ یہ استیذان تھا یعنی آپ نے بعد سلام کے اجازت طلب کی کہ میں اندر آؤں، حضرت سعد بن عبادہ خاموش رہے یہ خیال کیا کہ اچھا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سلام فرمائیں جو کہ دعا ہے تو ہم کو برکت دعا کی زیادہ حاصل ہو۔ جب تین بار کے بعد بھی جواب نہ آیا تو آپ واپس ہو گئے۔ سبحان اللہ کیسی شان تھی بھلا آجکل تو کوئی ایسا کر کے دیکھے اپنے پیر کے ساتھ جو اسی وقت بیعت قطع نہ کر دیں کہ ہم نے تین بار آواز دی اور جواب بھی نہ دیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا بھی ناگواری نہ ہوئی کیونکہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے گھر میں آنے کی اجازت دے یا نہ دے اور استیذان کا یہ قاعدہ زنانہ مکان میں تو ہے ہی مردانہ مکان میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ کہ بدوں اجازت کے اندر مت جاؤ۔ مگر افسوس آجکل مسلمانوں نے اس طریقہ کو چھوڑ دیا اور شرم کی جگہ ہے کہ اس پر غیر قومیں عمل کرتی ہیں انھوں نے اسلام ہی سے

یہ قاعدہ سیکھا ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کو اسلامی اصول کی قدر نہیں البتہ مردانہ مکان میں ایک تفصیل بھی ہے وہ یہ کہ مردانہ مکان دو قسم کے ہیں ایک وہ جس میں اسی واسطے بیٹھتے ہوں تاکہ لوگ آکر ملیں وہاں استیذان کی ضرورت نہیں مثلاً مردانہ مکان کے صحن میں جانے کیلئے استیذان کی ضرورت نہیں اور ایک مردانہ مکان وہ ہے جہاں ملاقات کے لئے نہیں بیٹھتے مثلاً مردانہ مکان میں کوئی کمرہ ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں گویا کواڑ بند ہیں تو اس میں بدون استیذان کے داخل نہ ہونا چاہئے۔ خوب سمجھ لو اس میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ غرض جب واپس تشریف لے چلے اور حضرت سعدؓ نے پھر آواز سنی تو باہر نکلے اور آپؐ کے پیچھے دوڑے اور واپس تشریف لیجانے کے متعلق دریافت کیا آپ نے فرمایا کہ جب تیسری بار میں جواب نہیں ملا ہم واپس ہوگئے۔ کیونکہ شرعی قانون اس کے متعلق یہی ہے تو دیکھئے آپ نے اس قانون کو اپنی ذات مبارک کے لئے بھی جاری فرمایا۔ اسی طرح حدیث میں ایک اور واقعہ حضرت بریرہ کا ہے کہ جب وہ آزاد ہوگئیں اور شرعی قاعدہ سے ان کو اختیار دیا گیا کہ اپنے پہلے شوہر کے ساتھ (جس سے غلامی کی حالت میں نکاح ہوا تھا) نکاح باقی رکھیں یا فسخ کردیں اور انھوں نے اس اختیار کی بنا پر فسخ نکاح کو اختیار کیا تو ان کے پہلے شوہر کو بہت رنج ہوا کیونکہ ان کو بریرہ سے محبت تھی اور حضرت بریرہ کو ان سے نفرت تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوہر کی حالت کو دیکھ کر بریرہ سے فرمایا کہ اگر تم مغیث سے نکاح کرلو تو اچھا ہے۔ حضرت بریرہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے یا مشورہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکم نہیں محض مشورہ ہے۔ تو انھوں نے صاف عرض کردیا کہ میں اس مشورہ کو قبول نہیں کرتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت بریرہ کے اس جواب سے مطلق ناگواری نہیں ہوئی۔ کیونکہ مشورہ کا قانون یہی ہے کہ دوسرے شخص کو اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ لیکن آجکل تو اس قاعدہ پر کوئی عمل کرکے دیکھے کہ پیر صاحب کوئی مشورہ دیں یا کسی کی سفارش کریں اور مرید نہ مانے تو پھر دیکھئے کیا حال ہو۔ لیکن شرعاً اس پر کوئی ملامت نہیں۔ کیونکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر عمل کرنا واجب نہیں تھا تو پیر صاحب کے مشورہ پر عمل کرنا کہاں سے واجب ہوگیا۔ تو حضرت مولانا کا اتباع سنت ملاحظہ ہو کہ اس قاعدہ کلیہ میں اپنے کو بھی داخل فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ اَحْبِبْ حَبِیْبَکَ الخ (دوست سے اعتدال کے ساتھ دوستی رکھو) سے بزرگوں نے اپنے کو بھی مستثنیٰ نہیں فرمایا۔

پس اس بنا پر بجز خاص اسرار کے جن کو اصلاح حال میں دخل ہو باقی اسرار پیر سے بھی نہ کہو پس یہ قاعدہ سب کو عام ہے اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا مَّا وَاَبْغِضْ بَغِيْضَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ حَبِيْبَكَ يَوْمًا مَّا (دوست کے ساتھ دوستی اعتدال سے کرو شاید کہ وہ کسی وقت تمہارا دشمن ہو جائے اور دشمن کے ساتھ دشمنی اعتدال سے کرو شاید وہ کسی وقت تمہارا دوست ہو جائے) یہ تو دوستی کی حالت کا بیان تھا کہ حد سے بڑھ جاتے ہیں اسی طرح ہماری حالت دشمنی میں یہ ہے کہ اس میں بھی حد سے نکل جاتے ہیں کہ بس جس سے عداوت ہوگی اس کی ایذا رسانی میں کسر نہیں رکھتے ہر ممکن طریقہ سے اس کو ضرر پہنچاتے ہیں خواہ وہ شریعت کے موافق ہو یا خلاف حلال و حرام کی بھی ذرا تمیز نہیں رہتی۔ لہٰذا اس حدیث میں دشمنی کی بھی حد بتلادی۔ کیا ٹھکانا ہے انتظام کا کہ حق تعالیٰ نے کفار تک کے ساتھ عداوت کرنے کیلئے بھی قوانین مقرر فرمائے ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (ترجمہ) اور تم کو کسی قوم کی عداوت جو اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے تم کو مسجد حرام سے روک دیا ہے اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم حد سے تجاوز کرنے لگو اور (ہمیشہ) نیکی اور تقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کا ساتھ دو اور گناہ اور ظلم میں کسی کا ساتھ نہ دو اور (ہمیشہ) خدا تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچتے رہو۔ بیشک حق تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔ دیکھئے صحابہ کی عداوت دینی تھی اور اس کا منشا بھی دین تھا کہ کفار نے مسجد حرام پر ناحق قبضہ کر رکھا تھا اور اس کے اندر نماز اور طواف کرنے سے مسلمانوں کو روک دیا تھا مگر اس میں بھی حکم ہوتا ہے کہ حدود سے مت نکلو گناہ اور ظلم نہ کرو نہ ان کاموں میں کسی کا ساتھ دو۔ اب اس ارشاد کو سنکر مسلمان اپنی حالت پر غور کریں تو ان کو معلوم ہوگا کہ وہ دوستی اور دشمنی میں حدود سے کتنا تجاوز کرتے ہیں آجکل ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جو دین کے لئے کسی سے دوستی اور دشمنی کرتے ہوں ہماری دوستی اور دشمنی سب دنیا کے واسطے ہے پھر اگر شاذ و نادر کسی کو کسی سے دین کے واسطے بھی دشمنی ہو تو اس میں حالت یہ ہے کہ دشمنی میں حدود سے اتنا تجاوز کرتے ہیں کہ دین بھی برباد ہو جاتا ہے پرائے شگون کو اپنی ناک کٹانا اسی کا نام ہے کہ دوسروں کی دنیا برباد کرنے کے لئے اپنا دین خراب کرتے ہیں آجکل دشمنی میں صرف یہ مقصود ہوتا ہے کہ دوسرے کو

ضرر پہنچ جاوے چاہے اپنے کو کچھ نفع ہی نہ ہو بلکہ خواہ اپنے کو اس سے بڑھ کر ضرر پہنچ جاوے اور اس میں راز یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے جذبات نفسانیہ کو عقل و شرع کے تابع نہیں کرتے بلکہ خود عقل و شرع کو جذبات کے تابع بنانا چاہتے ہیں اور شریعت کا حکم یہ ہے کہ جذبات نفسانیہ کو احکام الٰہی کا تابع بناؤ۔ چنانچہ ہجرت کے قبل جہاد مشروع نہ ہونے کا نکتہ محققین نے یہی فرمایا ہے کہ مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو جہاد کی اس لئے اجازت نہ ہوئی کہ اس وقت تک مسلمانوں کے جذبات نفسانیہ کی کامل اصلاح نہ ہوئی تھی مسلمانوں کی اصلاح تدریجاً ہوئی ہے۔ دفعۃً نہیں ہوئی اور یہ ایسی بات ہے جس کا انکار وہی کر سکتا ہے جس نے احادیث و آیات میں تامل نہ کیا ہو ورنہ نصوص میں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے مَنْ قَالَ وَاللَّاتِ وَالْعُزّٰى فَلْيَقُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَنْ قَالَ تَعَالَ اُقَامِرْكَ فَلْيَتَصَدَّقْ یعنی جس شخص کی زبان سے لات و عزیٰ کی قسم نکل جاوے اس کو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ لینا چاہیے۔ اور جس کی زبان سے یہ کلمہ نکل جاوے کہ آؤ جوا کھیلیں اس کو صدقہ کرنا چاہیے دیکھئے آجکل اگر کوئی لات و عزیٰ کی قسم کھالیوے تو اس پر کفر کا اندیشہ ہے مگر اس وقت چونکہ صحابہ نو مسلم تھے جو چند روز پیشتر ان کلمات کے عادی تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر عادت سابق کے موافق ایسے کلمات زبان سے نکل جاویں تو کلمہ توحید پڑھ لینا چاہیے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ابتدائے اسلام میں جاہلیت کا کچھ اثر باقی رہ جانا مستبعد نہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ تعلیم فرمائی گئی تھی۔ پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ حضرات صحابہ کی اصلاح کی تکمیل تدریجاً ہوئی ہے اس لئے انکو مکہ مکرمہ میں جہاد کی اجازت نہ دی گئی کیونکہ اس وقت جہاد میں نفس کی آمیزش ہوتی اخلاص نہ ہوتا۔ اور بدون اخلاص کے دینی کامیابی کا نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے مگر مسلمان کو دنیوی کامیابی بھی بدون اس کے نہیں ہوتی اخلاص کے باب میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھیں) اور حدیث میں ہے يُؤْتٰى بِالشَّهِيْدِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کہ قیامت کے دن شہید کو بلایا جاویگا اور اپنی نعمتیں یاد دلا کر اس سے پوچھا جائے گا کہ ہمارے واسطے تو نے کیا کیا۔ وہ عرض کرے گا کہ میں نے آپ کے راستہ میں اپنی جان دی اور کفار سے جہاد کیا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹ بولتا ہے تو نے

ہمارے واسطے جان نہیں دی تھی یُقَاتِلُ لِاَنْ یُّقَالَ جَرِئٌ بلکہ اس لئے سب کچھ کیا تاکہ لوگ تجھے بہادر کہیں کہ بڑا جوانمرد ہے کسی سے نہیں ڈرتا حاکم کے سامنے بڑی جرأت سے اظہار دیئے فَقَدْ قِیْلَ یعنی دنیا میں تیری بہت کچھ تعریف ہو چکی اور تیرا مدعا حاصل ہو گیا یہاں تیرے واسطے صرف جہنم ہے۔ چنانچہ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے جہنم میں کھینچ کر لے جاؤ تو حق تعالیٰ نے حضرات صحابہ کو اس بلا سے بچالیا کہ جب تک ان کے جذبات نفسانیہ کی کامل اصلاح نہ ہوگئی اس وقت تک جہاد کی اجازت نہ دی اگر ابتداء اسلام ہی میں اجازت ہو جاتی تو بہت سے ناموری یا شفاء غیظ کے لئے جہاد کرتے اخلاص کے ساتھ محض رضائے حق کے لئے کام نہ ہوتا جب صحابہ کی تکمیل ہوگئی اور کفار کی ایذائیں سہتے سہتے اُن میں جذبات نفسانیہ کے دبلنے کا ملکہ پیدا ہو گیا اس وقت آپ کو ہجرت کا حکم ہوا اور مدینہ منورہ پہنچکر جہاد کی اجازت ہوئی مکہ مکرمہ میں جہاد کی ممانعت کا سبب یہ نہ تھا کہ جماعت اہل اسلام کم تھی اگر یہ سبب ہوتا تو مدینہ منورہ پہنچکر بھی اجازت نہ ہوتی کیونکہ وہاں پہنچکر بھی مسلمانوں کا مجمع کفار سے بہت ہی کم تھا اگر کم نہ ہوتا تو ملائکہ کا جوڑ نہ لگایا جاتا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوات میں اکثر ملائکہ کا لشکر آیا کرتا تھا جن کی برکت سے مسلمانوں کو غلبہ ہوتا تھا اور اگر قلت و کثرت عدد پر مدار ہوتا تو جنگ حنین میں جس میں مسلمان زیادہ تھے مغلوب نہ ہوتے اور زیادتی بھی معمولی نہ تھی بلکہ کفار سے تین حصہ زیادہ تھے چنانچہ کفار چار ہزار تھے اور مسلمان بارہ ہزار اور زیادتی عدد کے ساتھ ایک اور خصوصیت بھی تھی وہ یہ کہ بارہ ہزار کے عدد میں ایک خاصیت نص میں وارد ہے کہ لَنْ یُّغْلَبَ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا مِّنْ قِلَّةٍ یعنی بارہ ہزار مسلمان قلت عدد سے ہرگز مغلوب نہ ہوں گے تو تمام مقتضیات غلبہ کے موجود تھے مگر پھر بھی مغلوب ہو گئے معلوم ہوا کہ قلت عدد عدم مشروعیت جہاد کا سبب نہ تھا اگر اس پر شبہ ہو کہ مسلمان تو اس سے زیادہ مغلوب ہوتے ہیں چنانچہ حنین ہی میں مغلوب ہوئے اور کیا اس میں کوئی قید نہیں یعنی اگر مقابل لاکھوں ہوں تب بھی یہ وعدہ ہے جواب خود اس حدیث ہی کی ایک قید سے نکلتا ہے وہ قید مِنْ قِلَّةٍ کی ہے یعنی قلت سبب مغلوبیت کا نہ ہوگا گو کوئی اور علت سبب ہو جاوے۔ چنانچہ حنین میں عجب سبب ہوا اس مغلوبیت کا۔ اور ظاہر اس میں اور کوئی قید نہیں۔ اب یہاں ایک شبہ ہے وہ یہ کہ بعد اذن بالقتال کے بھی تو بعضے مجاہدین نو مسلم تھے اور ان میں تمہارے بیان کے موافق غلبہ جذبات کا ہوگا تو ان کو جہاد میں کیوں

شریک کیا گیا جواب یہ ہے کہ تجربہ ہے مخلوط جماعت میں اثر غالب عدد غالب کا ہوتا ہے اور جب جہاد مشروع ہوا اس وقت زیادہ تر جماعت کاملین کی تھی گو ان میں بعضے نو مسلم بھی ہوتے تھے مگر غلبہ کاملین کو تھا اور فلاح و کامیابی کے لئے اتنا کافی ہے کہ زیادہ تر کام کرنے والے مخلص ہوں۔ اگر تھوڑے سے غیر مخلص بھی ہوں تو مغلوبیت کی وجہ سے کام خراب نہیں ہوتا۔ دوسرے جب غلبہ مخلصین کو ہوتا ہے تو ناقصین پر بھی ان کا اثر پڑتا ہے کہ ان میں بھی اخلاص پیدا ہو جاتا ہے اور اگر غلبہ غیر مخلصین کو ہوا اور مخلص قلیل ہوں تو اس وقت معاملہ برعکس ہو جاتا ہے کہ ان غیر مخلصین کی کثرت کا اثر مخلصین پر پڑتا ہے کہ ان کا اخلاص بھی ناقص اور کمزور ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آجکل مسلمانوں کے اکثر کام پورے نہیں ہوتے کیونکہ غلبہ غیر مخلصین کو ہے اگر مخلصین کو غلبہ ہو تو پھر ناکامی کبھی نہ ہو۔ اور صحابہ کے جذبات نفسانیہ کی یہاں تک اصلاح ہو گئی تھی کہ جب کفار نے ان کو مکہ مکرمہ میں جانے سے روکا اس وقت وہ آپے سے باہر نہیں ہوئے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر جمے رہے اگر ہم لوگوں کو کبھی ایسا واقعہ پیش آوے تو نہ معلوم جوش غضب میں کیا کچھ کر بیٹھیں غرض اصل مقصود اتباع احکام ہے اور دوستی اور دشمنی وہی قابل اعتبار ہے جو احکام شریعت کے موافق ہو۔ بخدا اتباع احکام کے بغیر نہ سلطنت مقصود ہے نہ ترقی اگر خالی سلطنت مقصود ہو تو فرعون سب سے زیادہ کامیاب سمجھا جانا چاہیئے نعوذ باللہ منہ بس مسلمان کا اصل مقصود یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کو راضی رکھے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(مصلحت یہی ہے کہ تمام مصلحتوں پر خاک ڈالکر تمام دوست ایک ہی محبوب کی طرف متوجہ ہو جائیں)

اگر دلیل شرعی سے خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ثابت ہو کہ گوہ کا ٹوکرا اٹھا دیں اور خاموش رہیں تو ہماری فلاح اسی میں ہے جیسا کہ مکہ مکرمہ میں حضرات صحابہ کفار کے ہاتھوں ایذائیں برداشت کرتے رہے اور اسی میں خوش رہے۔ اور اگر اتباع احکام کے ساتھ ہم کو سلطنت بھی مل جاوے تو نور علیٰ نور ہے پس ہم کو نہ ترقی مقصود بالذات ہے نہ تنزل ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(فراق و وصل کیا ہووے رضائے الٰہی طلب کرو اس لئے افسوس ہے سوائے اسکے تمنا کرنا)

خدا کو راضی رکھ کر اگر دنیا مل جائے تو مبارک ہے ورنہ ایسی تیسی اس دنیا کی جس میں چند روزہ گلچھرے اڑا کر ہم جہنم کے کندے بن جاویں حیرت ہے کہ مسلمان مسلمان ہو کر رضائے الٰہی کے سوا کسی اور چیز کو مقصود سمجھے یہ تو دوستی اور دشمنی کے حدود تھے جو میں نے بیان کر دیئے۔

اب میں ترقی کر کے یہ کہتا ہوں کہ معاملات خلق سے متجاوز ہو کر باطنی احوال و مقامات تک کے لئے بھی حدود ہیں یعنی خوف الٰہی اور شوق خداوندی اور تواضع وغیرہ جو کہ اخلاق باطنی ہیں جن کو صوفیہ کی اصطلاح میں مقامات کہا جاتا ہے جو بظاہر علی الاطلاق ہر درجہ میں مطلوب معلوم ہوتے ہیں، ان کے لئے بھی حدود ہیں یہ نہیں کہ ان کا ہر درجہ مطلوب ہو۔ یہ مضمون شاید آپ نے کبھی نہ سنا ہو گا کیونکہ اخلاق حمیدہ باطنیہ کے بارے میں لوگوں کا عام خیال ہے کہ ان میں جتنی ترقی ہو اچھی بات ہے ان کا کوئی درجہ مذموم نہیں اور قیاس ظاہری بھی اسی کو چاہتا ہے کیونکہ یہ امور مطلوبہ ہیں اور مطلوب کا ہر درجہ مطلوب ہوا کرتا ہے۔ مگر اس قیاس میں اتنی غلطی ہے کہ امور مطلوبہ کو عام رکھا گیا ہے حالانکہ یہ قاعدہ مطلوب بالذات کے لئے ہے کہ اس کا ہر درجہ مطلوب ہوا کرتا ہے اور یہ امور مطلوب بالعرض ہیں اصل مطلوب رضائے الٰہی ہے جس کا ہر درجہ مطلوب ہے۔ اس تمہید کے بعد اب میں اخلاق و مقامات باطنیہ میں نمونہ کے طور پر بتلانا چاہتا ہوں کہ حدود سے وہ بھی خالی نہیں اور نمونہ اس واسطے کہا کہ سب احکام کا بیان کرنا دشوار ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش
کہ حسن این قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ روشنائی بکھیر کاغذ پھاڑ اور خاموش رہ اس لئے حسن یہ قصہ عشق کا ہے دفتر میں نہیں سما سکتا)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۞ (آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی ہو تو سمندر ختم ہو جائے اگرچہ اس کی مدد کے لئے ہم ایک دوسرا سمندر لے آویں)

احکام الٰہی کی انتہا نہیں اس لئے نمونہ کے طور پر بیان کرتا ہوں کہ مثلاً شوق اور

خوف کے لئے بھی حدود ہیں۔ دیکھئے حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ شَوْقًا اِلٰی لِقَائِكَ فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءِ مُضِرَّةٍ وَّلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ اگر شوق کے لئے حد نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قید کیوں بڑھائی فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءِ مُضِرَّةٍ وَّلَا فِتْنَةٍ یعنی آپ دعا فرماتے ہیں کہ اے اللہ مجھے اپنے لقاء کا ایسا شوق عطا فرما جس میں نہ کوئی ضرر ہو اور نہ کوئی فتنہ مضلہ ہو ضرار کا مقابلہ اضلال کے ساتھ مقتضی ہے کہ یہ کوئی دنیوی ضرر ہے یعنی بیماری وغیرہ پس معنی یہ ہوئے کہ اس شوق میں مجھ کو نہ کوئی بیماری لگے اور نہ کسی گمراہ کرنے والے فتنہ میں ابتلا رہو۔ بات یہ ہے کہ غلبہ شوق کے دو اثر ہوتے ہیں ایک جسمانی، ایک روحانی جسمانی اثر تو یہ ہے کہ کثرت شوق سے حرارت جسمانیہ بڑھ جاتی ہے اور جب بدن میں خشکی کا غلبہ ہو جاتا ہے جس کے لئے ضعف لازم ہے تو غلبہ شوق سے بدن میں ضعف و اضمحلال بڑھ جاتا ہے۔ بعض دفعہ ہڈیاں تک گھل جاتی ہیں تو پہلے نماز کھڑے ہو کر پڑھ سکتے تھے اب قعود ہی رہ گیا۔ چند دنوں کے بعد قعود بھی دشوار ہو گیا پہلے روزے بہت رکھ سکتے تھے اب نہیں رکھ سکتے۔ وعلیٰ ہذا القیاس نیز شوق کے غلبہ میں کھانا پینا بھی چھوٹ جاتا ہے۔ دیکھئے بعض دفعہ جب کسی عزیز کے آنے کا انتظار ہوتا ہے تو عین کھانے کے وقت خبر آمد سن کر بھوک جاتی رہتی ہے کھانا نہیں کھایا جاتا یہی حالت غلبہ شوق لقاء میں ہو جاتی ہے اہل شوق کو ایسے واقعات پیش آئے ہیں تو غلبہ حرارت کے ساتھ جب غذا بھی کم ہو جاوے اب جتنا بھی ضعف ہو تھوڑا ہے۔ تو آپ نے فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءِ مُضِرَّةٍ میں ایسے غلبہ شوق کی نفی کر دی کہ اے اللہ شوق کی وجہ سے میری صحت خراب نہ ہو کیونکہ بعض اوقات حد قدرت کے اندر بھی عمل میں سستی ہونے لگتی ہے جس سے معصیت بھی ہوتی ہے یہ ضرر ہوا حد سے زیادہ غلبہ شوق کا۔

دوسری خرابی روحانی یہ ہے کہ شوق سے ناز بڑھ جاتا ہے کیونکہ غلبہ شوق میں انبساط زیادہ ہوتا ہے اور زیادت انبساط سے ناز پیدا ہوتا ہے تو یہ شخص ناز میں آ کر کچھ سے کچھ بکنے لگتا ہے۔ مجذوبین میں یہی تو نقص ہے گو اس وقت اس شخص کو گناہ نہ ہو کیونکہ غلبہ حال سے وہ بے خبر ہوتا ہے مگر تاہم یہ حال کمال کے منافی ہے۔ کمال یہی ہے

لہ ادب سے تجاوز نہ ہو۔ پھر یہ شخص تو بے خبر ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ اس کی باتیں دوسرے لوگ سن لیتے ہیں وہ ان سے گمراہ ہو جاتے ہیں اہل شوق کو چاہیئے کہ مجمع عام میں اپنی باتیں نہ کیا کریں۔ مولانا اسی کی شکایت فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند
از سخنہا عالمے را سوختند

یعنی وہ لوگ بڑے ظالم ہیں جنھوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر دنیا کو اپنی باتیں سنائیں اور مخلوق کو گمراہ کیا نیز بعض دفعہ غلبہ حال رفع ہو جانے کے بعد بھی اس شخص کی زبان سے حسب عادت کلمات شطحیہ نکل جاتے ہیں۔ اس وقت گناہ بھی ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وَلَا فِتْنَةٍ مُّضِلَّةٍ میں اس کی بھی نفی فرمادی کہ غلبہ شوق سے میں گمراہی کے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اسی طرح خوف کے لئے بھی آپ نے ایک حد بتلائی ہے حدیث شریف میں ہے۔ وَاَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ اور اے اللہ میں آپ کا اتنا خوف چاہتا ہوں جس سے گناہوں کے درمیان اور میرے درمیان رکاوٹ ہو جاوے اور اس قید کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ غلبہ خوف سے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ صفات جلال کے مشاہدہ سے صفات جمال یعنی رحمت و رأفت خداوندی کی طرف بالکل ذہن نہیں جاتا جس سے مایوسی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ جب رحمت خداوندی سے مایوسی ہو گئی تو کفر تک پہونچ گیا فَاِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ (اس لئے بجز کافر لوگوں کے اللہ کی رحمت سے کوئی مایوس نہیں ہوتا۔) اور اگر مایوسی بھی نہ ہوئی تو تعطل کی نوبت آجاتی ہے۔ سمجھتا ہے کہ جب ان اعمال سے کچھ کام نہیں چل سکتا تو یہ سب بیکار ہیں۔ اب نماز روزہ سب کو بالائے طاق رکھدیتا ہے اس ورطہ میں بہت لوگ تباہ ہو گئے ہیں۔ جو اولیاء مستہلکین کہلاتے ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنِيْ وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ (اتنا خوف جو میرے اور میرے گناہوں کے رکاوٹ ہو جائے) فرما کر بتلادیا کہ خوف کا ہر درجہ مطلوب نہیں۔

صاحبو! جب شوق خداوندی اور خوف الٰہی کے لئے بھی حدود ہیں تو اب باقی امور کو

خود ہی سمجھ لیجیے کہ ان کے لئے حدود کیوں نہ ہوں گے شوق اور خوف میں لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا ۝ (شاید اس سے اللہ تعالیٰ کوئی بات پیدا کر دیں) کا اجراء اس طرح ہوگا کہ زیادہ غلبۂ شوق کی تمنا نہ کرو کیونکہ شاید اس سے طاعات میں کمی ہوجاوے پھر تم پچتاؤ گے یا ناز پیدا ہوگیا اور حد ادب سے نکل گئے تو پیشانی ہوگی اور اگر شوق کے بعد انس عطا ہوگیا تو اس وقت تم ادب کرنا چاہو گے مگر عادت کی وجہ سے کلمات ناز زبان سے نکل جایا کریں گے تو گناہ بھی ہوگا پھر پچتاؤ گے کہ ہائے میں نے اتنا شوق کیوں مانگا تھا۔

اسی طرح خوف میں سمجھ لیجیے غرض باطنی امور میں بھی حدود ہیں لیکن ظاہری امور میں تو حدود اختیاری ہیں ان سے خود بچنا چاہیئے اور باطنی امور میں حدود غیر اختیاری ہیں ان کے لئے حق تعالیٰ سے دعا کرنا چاہیئے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور دعا کے فرمایا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَوْقًا اِلٰی لِقَائِکَ فِیْ غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّۃٍ وَّلَا فِتْنَۃٍ مُّضِلَّۃٍ (اے اللہ مجھے اپنی لقا کا اس قدر شوق عطا فرما جس میں نہ کوئی ضرر ہو اور نہ کوئی فتنہ مضلہ ہو) البتہ باطنی امور میں اتنی بات اختیاری ہے کہ اپنی طرف سے کوئی درجہ اپنے لئے تجویز کر کے اس کی تمنا نہ کرے بلکہ حق تعالیٰ پر تفویض کر دے امید ہے کہ یہ نمونہ تمام حدود کے لئے کافی ہوجائے گا۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل عطا فرماویں۔

(نوٹ) وعظ ختم ہونے کے بعد موذن نے فوراً وقت سے پہلے ہی اذان کہدی تاکہ سارا مجمع اسی مسجد میں نماز پڑھ کر جاوے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ بھی وہی بات ہے کہ ہم لوگوں میں حدود کی رعایت نہیں۔ موذن صاحب نے کثرت جماعت کا تو خیال کیا مگر یہ نہ دیکھا کہ ابھی عصر کا وقت نہیں ہوا۔

وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین ۝

تمام شد

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً
(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

الحجُّ المبرور

(از افادات)

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب
تھانوی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ کراچی
ایم اے جناح روڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمیٰ بہ

الحج المبرور

این	متیٰ	کم	کیف	لم	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کس لئے ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
بمبئی مکان حکیم اجمیری صاحب	۱۱ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۷ھ بوقت شب	۲ گھنٹہ	بیٹھ کر	حجاج کی اصلاح کے لئے	حج میں اخلاص کی ضرورت	ظفر احمد عفی عنہ	تقریباً ۲۵	مستورات زیادہ تھیں

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصا لہ الدین ○

یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے ایک بڑے ضروری امر کا امر فرمایا ہے۔ اور یہ قرآن شریف کا خاص حصہ ہے کہ تھوڑے سے الفاظ میں مقصود کا ہر پہلو سے بیان ہو جاتا ہے۔ اخلاص کے بارے میں جتنی باتیں بیان کرنا ضروری تھیں وہ سب ان تھوڑے سے لفظوں میں بیان ہو گئیں ہیں۔ اگر ان سب کی تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لئے وسیع وقت کی ضرورت ہے اور وعظ کا وقت مستورات کی مصلحت سے رات کا رکھا گیا ہے اس لئے وقت میں زیادہ گنجائش نہیں کیونکہ رات کے وقت دیر تک بیان ہونے سے سننے والے گھبرا جاتے ہیں۔ بعض پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو اونگنے لگتے ہیں جس سے بیان کرنے والے کی طبیعت منقبض ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں اس کا خلاصہ عرض کئے دیتا ہوں جو ان شاء اللہ تعالیٰ تھوڑے وقت میں بیان ہو جائے گا۔ اس آیت میں جس خاص ضروری بات کا امر ہے وہ اخلاص ہے۔ یوں تو اس کی ضرورت ہر وقت ہے اور ہر کام میں ہے۔ اخلاص کے بدون کوئی دین کا کام مقبول نہیں ہوتا۔

مگر اس وقت جس خاص کام کے لئے اخلاص کی ضرورت مجھ کو بیان کرنا ہے اس کے لئے ایک خاص محرک موجود ہے۔ وہ یہ کہ سامعین کو معلوم ہے کہ اس وقت ان میں سے بہت سے حضرات کا حج کا ارادہ ہے۔ جن میں مرد بھی ہیں اور مستورات بھی ہیں اور مجھے بھی بمبئی تک انہی کے پہونچانے کے لئے آنا پڑا ہے۔ اگرچہ میرے مشاغل اس قدر ہیں کہ مجھ کو اس سفر کیلئے مہلت نہ مل سکتی تھی، مگر محض اس خیال سے یہاں تک چلا آیا کہ مجھے اگر حج کی توفیق دوبارہ نہیں ہوئی تو کم از کم حجاج کی خدمت اور راحت رسانی ہی کا کچھ ثواب لے لوں۔ اگرچہ میں کسی کی کچھ خدمت بھی نہیں کر سکتا مگر غالباً میرے بمبئی تک ساتھ ہونے سے میرے رفیقوں کو بہت کچھ سہولتیں اس سفر میں

ہوگئی ہوں گی۔ اور اگر سب کو نہیں تو خاص میرے متعلقین کو تو قوت اور اُنس ضرور ہو رہا ہوگا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ میرے یہاں تک آنے سے مشہور یہی ہوگیا کہ میں حج کو جا رہا ہوں خیر یہ بھی ایک نیک فال ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مجھے حجاج کی معیت میں حج ہی کا ثواب مل جائے گا۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے الدال علی الخیر کفاعلہ کہ نیک کام کا راستہ بتانے والا بھی ثواب میں کرنے والے کے برابر ہے تو جب صرف دلالت کا ثواب کرنے کے مثل ہے تو اس مشقت کا ثواب کہ میں گھر سے بمبئی تک حجاج کی مصلحت سے ان کے ساتھ آیا یہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ثواب میں حج کے برابر ہی ہو جائے گا۔ پھر میں اس وقت حج کے کامل اور مقبول ہونے کا طریقہ بتلانا چاہتا ہوں اگر اس بیان سے کسی کو نفع ہوگیا تو دلالت علی الخیر بھی پائی گئی جس کا ذکر حدیث شریف میں صراحۃً موجود ہے۔

بہر حال بعض رفقاء کا ارادہ حج اس بات کا محرک ہوا کہ حج کے متعلق کچھ ضروری تنبیہات گوش گذار کردی جائیں تاکہ جس امر کا انھوں نے خدا تعالیٰ کی توفیق سے ارادہ کیا ہے اس کو آداب و شرائط کے ساتھ ادا کریں کیونکہ ہر چیز اپنے آداب و شرائط ہی کے ساتھ کامل ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی امر کی طرف اس آیت میں تنبیہ کی گئی ہے۔ جس کو میں نے اس وقت تلاوت کیا ہے اور وہ امر جس کی طرف اس آیت میں تنبیہ ہے بہت ہی زیادہ ضروری ہے کیونکہ یہ ایک قاعدہ مسلمہ عقلیہ ہے کہ ہر فعل میں جس چیز کی کمی ہوا کرتی ہے اس کا تدارک دوسرے محسنات سے مقدم ہوتا ہے یعنی اگر ایک کام میں کمی نہ ہو گو زوائد بھی اس میں نہ ہوں وہ تو مقصود کے لئے کافی ہے اور جس کام میں اصل ہی سے کمی ہو گو محسنات بھی اس میں ہوں وہ ناکافی ہوتا ہے پس ہر کام کی تکمیل کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے ان کوتاہیوں کو پورا کیا جائے جن پر اُس کی صحت اور مقبولیت موقوف ہے۔ پھر اگر خدا ہمت دے تو

ان مستحبات اور نوافل وزوائد کو بھی پورا کیا جائے جن سے اس کا حسن دو بالا ہوجاتا ہے اور اگر نوافل و زوائد کو پورا بھی نہ کیا جائے تو حسن اصلی تو جب بھی رہے گا اور کوتاہیوں کے ہوتے ہوئے کسی کام میں حسن پیدا نہیں ہوسکتا۔

دیکھیے اگر ایک مکان میں تمام ضروریات موجود ہوں کسی معتبر چیز کی کمی نہ ہو مگر استرکاری اور بیل بوٹے نہ ہوں تو اس مکان کو ناقص نہ کہا جائے گا اور اگر اس میں باورچی خانہ یا غسلخانہ یا اور کوئی ضروری چیز نہ ہو تو چاہے اس میں ہزار بیل بوٹے ہوں اس کو یقیناً ناقص کہا جائے گا اور سب یہی کہیں گے کہ یہ مکان رہنے کے قابل نہیں۔

اسی طرح ہر چیز پر غور کرلیا جائے تو اس عقلی قاعدہ کی تائید ہر چیز میں ملے گی کہ اول ہر چیز کے نقصانات اور کوتاہیوں کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے محسنات اور زوائد کا مرتبہ بعد میں ہے۔ اس لئے میں نے اس آیت کے مضمون کو زیادہ ضروری قرار دیا کیونکہ اس میں ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس پر ہر نیک عمل کا درست اور مقبول ہونا موقوف ہے اور اس میں آج کل بہت کمی کی جاتی ہے اور وہ اخلاص ہے۔ اگرچہ اخلاص کی کمی ہمارے اکثر اعمال میں آجکل ہے اس لئے بظاہر حج کی کوئی خصوصیت معلوم نہ ہوئی ہوگی۔ مگر میں ابھی بتلا دوں گا کہ اخلاص کی ضرورت حج میں زیادہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حج کی ایک خاص شان ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر اخلاص سے خالی ہوجاتا ہے۔ اور یہ ہمارے سوء فہم کا نتیجہ ہے کہ اس کی وہ خاص شان اُس کو مقتضی ہوگئی کہ اس میں اخلاص کم ہوتا ہے ورنہ اس شان کا اصلی مقتضا یہ تھا کہ اس میں دوسرے اعمال سے زیادہ اخلاص کا اہتمام کیا جاتا۔ حج کی ایک شان یہ ہے کہ وہ ساری عمر میں ایک بار فرض ہوتا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جو کام بار بار ہوتا اس میں اگر پہلی بار اخلاص نہ ہو تو آہستہ آہستہ پیدا ہوجاتا ہے نماز دن میں پانچ مرتبہ

فرض اگر کسی کو اول روزا خلاص نصیب نہ بھی ہو تو وہ کوشش کر کے دو چار روز یا دو چار ہفتوں میں اخلاص حاصل کر سکتا ہے۔ روزہ میں اتنا تکرار تو نہیں مگر ہر سال رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ہے اگر کوئی شخص تمنا کے ساتھ بلوغ کے بعد پچاس سال کی عمر پائے تو پچاس مرتبہ زکوٰۃ فرض ہو گی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ دوسرے اعمال میں اخلاص کا پیدا ہونا آہستہ آہستہ ممکن ہے اگر پہلی بار میں نہ ہو دوسری بار میں ہو جائے گا۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اخلاص کے وجوداً وعدماً تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ فعل کے وقت غایت صحیحہ کا قصد ہو یہ تو غایت اخلاص ہے اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال کا ہے۔ دوسرے یہ کہ غایت فاسدہ کا قصد ہو یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ ہے کہ کچھ بھی قصد نہ ہو نہ غایت صحیحہ کا نہ غایت فاسدہ کا بلکہ یونہی معمول کے موافق ایک کام کرلیا یہ درجہ بین بین ہے اس کو اخلاص سے اتنا بُعد نہیں جتنا دوسرے درجے کو بُعد ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور قصد یہ ہو کہ خدا تعالیٰ ہم سے راضی ہوں گے اس کے سوا اور کچھ نیت نہ ہو یہ تو اخلاص کا درجہ کمال ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص ہمارے خشوع خضوع کو دیکھ کر ہمارا معتقد ہو جاوے گا یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ ہم معمول کے موافق نماز پڑھ لیں نہ وہ خیال دل میں ہو نہ یہ خیال ہو۔ یہ مرتبہ بین بین ہے۔ یہ اگر اخلاص کا درجۂ کمال نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں اس کو اخلاص سے قرب ضرور ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ فعل اختیاری فاعل مختار سے بدون کسی غرض کے تصور کے نہیں ہو سکتا تو اس کی کیا وجہ کہ بعض دفعہ ہم ایک فعل کرتے ہیں اور نیت کچھ نہیں ہوتی یہ محض عادت کی برکت ہے جب کسی کام کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود صادر ہونے لگتا ہے اس کے لئے اب بار بار ارادہ او عزم نہیں کرنا پڑتا۔

یہ مطلب نہیں کہ نماز کی نیت بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی غایت پر نظر نہیں ہوتی تکرار کی وجہ سے عادت ہوگئی ہے اور عادت کی بعد غایات کا لحاظ نہیں ہوا کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ جس کام میں تکرار ہو اس میں اخلاص سے من وجہ قرب ہے اور جس میں تکرار نہ ہو اس میں اخلاص اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ غایت صحیحہ کا تصور اور اس کا قصد نہ ہو۔ اسی وجہ سے حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہا کرتی کیونکہ ریا کرتے کرتے پھر اس کام کی عادت پڑ جاتی ہے اور جس کی عادت ہو جاتی ہے اس میں پھر کوئی خیال نہیں آیا کرتا پھر وہ اخلاص سے قریب ہو جاتا ہے۔ اب حج کو دیکھئے تو اس میں تکرار بالکل نہیں یعنی فرض کے اعتبار سے کوئی کتنا ہی کرے مگر یہ اجتماعی مسئلہ ہے کہ حج ساری عمر میں فرض صرف ایک ہی بار ہے تو اس میں جب تک غایت صحیحہ کا تصور اور قصد نہ کیا جائے گا اس میں اخلاص نہیں پیدا ہوگا کیونکہ اس میں تکرار نہیں اور تکرار کی وجہ سے عادت بھی نہیں اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے اس احتمال کی بھی نوبت نہیں آتی کہ بالکل خالی الذہن ہو کر حج کیا جائے۔ بس اس میں دو ہی صورتیں ہیں یا تو غایت صحیحہ کا قصد ہوگا یا غایت فاسدہ کا۔ اس لئے اخلاص کے اہتمام کی دوسری عبادات سے زیادہ ضرورت ہے یہی اس وقت مجھ کو بیان کرنا ہے کہ یوں تو ہر عبادت کے لئے اخلاص کی ضرورت ہے مگر حج کے لئے خصوصاً اخلاص کی ضرورت بہت ہے کہ ساری عمر میں ایک مرتبہ اس کے ادا کرنے کا موقعہ ملتا ہے پھر نہ معلوم کسی کی قسمت میں دوبارہ بھی ہے یا نہیں تو ایسی عبادت میں بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ اس میں کوتاہی رہ گئی تو بڑی ناکامی ہوگی۔ اول تو حج کرنا دوسری عبادات کی طرح آسان نہیں۔ جانی اور مالی دونوں قسم کی مشقتیں اس میں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ دوسرے بار بار اس کی توفیق اور ہمت ہونا بھی محتمل ہے اگر ایسی حالت میں یہ ساری محنت اخلاص سے خالی ہوئی تو نیکی برباد گناہ لازم ہوا۔ پھر رہ یہ

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔

الگ ضائع ہوا اس سے زیادہ ناکامی اور کیا ہوگی۔

غرض حق تعالیٰ نے اس آیت میں بہت اہتمام سے اخلاص کا امر فرمایا ہے قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصا لہ الدین۔ فرما دیجئے کہ مجھ کو امر کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت اسی کے لئے خالص کر کے بجا لاؤں۔

یہ ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہر حکم کو ضروری ظاہر فرماتے تھے۔ آپ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) تھے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرض منصبی ہے کہ تمام احکام کو مخلوق کی طرف پہنچائے لہٰذا اس کی ضرورت نہ تھی کہ حق تعالیٰ خاص طور پر کسی حکم کے لئے یہ فرمائیں کہ اس کو پہنچا دو مگر پھر بھی جب کسی حکم کے لئے آپ کو یہ ارشاد ہوگا کہ اس حکم کو پہنچا دو تو ضرور اس سے اس حکم کا مہتم بالشان ہونا سمجھا جائے گا۔ چنانچہ یہاں اخلاص کا امر فرماتے ہوئے حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ قُل سے خطاب فرمایا ہے کہ یہ بات امت سے کہہ دیجئے ایک تو یہی قرینہ ہے کہ آئندہ جو حکم آئے گا وہ بہت قابل اہتمام ہے پھر اس کے بعد اخلصوا نہیں فرمایا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ اخلاص کیا کریں بلکہ اس کے بجائے امرت ان اعبد اللہ فرمایا کہ یوں کہہ دو کہ مجھ کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے۔ اس جملہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مامور بالاخلاص ہونا ظاہر فرمایا گیا اس سے اخلاص کی عظمت بہت بڑھ گئی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبوب ہیں اور جس امر کا محبوب بھی مامور ہو وہ کیسا امر ہوگا۔ بہت ہی مہتم بالشان اور ضروری ہوگا کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور محبوب بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔

دنیا والوں کا اگر کوئی محبوب ہو تو اس کو احکام سے مستثنٰی کر دیتے ہیں مگر حق تعالیٰ کے یہاں یہ قاعدہ نہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ حق تعالیٰ کے محبوب ہیں مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو احکام سے مستثنٰی نہیں کیا گیا خصوصیت اور محبوبیت اگر ظاہر ہوئی تو اس صورت میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور زیادہ احکام لازم کئے گئے۔ تہجد دوسروں پر فرض نہیں سنت ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر

ایک قول کے موافق فرض تھا اور نافلۃً لک سے استدلال کیا گیا ہے کہ یہ تہجد آپ پر دوسروں سے فرض زاید ہے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو اولیاء کے لئے ایک مقام ایسا مانتے ہیں جہاں احکام شرعیہ اُن سے معاف ہوجاتے ہیں یہ بالکل غلط خیال ہے۔ ان لوگوں میں محبوبانِ خدا کو محبوبان دنیا پر قیاس کیا ہے کہ جس طرح دنیا والوں کے محبوب تکالیف اور احکام سے مستثنٰی ہوجاتے ہیں اسی طرح محبوبان خدا بھی مستثنٰی ہوجاتے ہوں گے اور یہ خبر نہیں ہے کہ یہاں محبوب ہی وہ بنتا ہے جو آئندہ بھی دوسروں سے زیادہ احکام بجا لانے والا ہو۔ حق تعالےٰ کی محبت اضطراری نہیں کہ بلاوجہ کسی سے خواہ مخواہ محبت ہوجاوے ان کی محبت اختیاری ہے اور وہ اسی سے محبت کرتے ہیں جو ان کا زیادہ مطیع ہو۔ پس جو چیز محبت کا سبب ہے وہ ہی اگر جاتی رہے گی تو محبوب کہاں رہے گا۔ پھر سب سے زیادہ محبوب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اگر محبوبان خدا احکام سے مستثنٰی ہوا کرتے تو سب سے زیادہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم مستثنٰی ہوتے مگر احادیث واقوال علماء سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر دوسروں سے زیادہ احکام تھے۔

اور جہاں ظاہر میں آپ کے لئے رخصت ہے وہ بھی حقیقت میں عزیمت ہے وہ رخصت اس شخص کے حق میں ہے جس کو حقوق ادا کرنے کا قصد نہ ہو۔ اور جس کو حقوق ادا کرنے کا خیال ہو اور حق تعالےٰ سے عشق ہو اس سے پوچھئے کہ یہ کتنی بڑی مشقت ہے مثلاً مخالفین کا اعتراض ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ حظ نفس کے لئے تعداد ازدواج کیا۔ نو۹ بیبیوں سے نکاح کیا۔ اور افسوس یہ کہ بعض مسلمان بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں گو اعتراضًا نہیں بلکہ اپنے حظوظ نفس کی گنجائش کے لئے۔ چنانچہ بعض لوگ چند نکاح کر کے کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو کیا حرج ہے۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی تو چند نکاح کئے ہیں۔

مگر وہ یاد رکھیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حظ نفس کے لئے چند نکاح ہرگز نہیں کیے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے تعداد ازدواج مصالح دینیہ کے سبب مشروع ہوا مثلاً آپ کی شان تھی شارع کی کہ آپ تمام امت کے لئے احکام الٰہی بیان فرماتے تھے۔ بعض احکام ایسے بھی ہیں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور عورتیں خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ دریافت نہ کرسکتی تھیں اور مردوں کے ذریعہ سے کہاں تک جزئیات کی تحقیق ہوسکتی اس لئے آپ کے لئے احکام کی اشاعت میں تعداد ازدواج کی مصلحت تھی کہ دوسری عورتیں ازدواج کے واسطہ سے سوال بآسانی کرلیا کریں اور جو بات ان کی سمجھ میں نہ آوے اس کو ان ازواج مطہرات کے ذریعہ سے بخوبی سمجھ لیا کریں۔ اب آپ ہی انصاف کریں کہ ہزارہا مسلمان عورتوں کو احکام سمجھانے کے لئے اگر آپ نو سے زیادہ بھی نکاح کرتے تب بھی کم تھا۔

پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تعداد ازدواج میں اعتدال کی تعلیم فرمائی ہے اور خود بھی عدل کے کسی دقیقہ کو نہیں چھوڑا، گو بعض اقوال پر آپ پر واجب بھی نہ تھا علاوہ اس کے نکاح میں دو جانبیں ہیں ایک افراط ایک تفریط۔ افراط یہ کہ باوجود قوت کے نکاح ہی نہ کرے۔ ایک تفریط کہ ضرورت سے زیادہ کرے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے منع فرمایا اور اعتدال کی تعلیم دی کہ جتنی ضرورت ہو اس سے آگے نہ بڑھے۔ اور چار سے زیادہ کسی کو بھی ضرورت نہیں اور شاذ کا اعتبار نہیں اس لئے اس سے زیادہ سب کے لئے حرام ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایک شخص کو ایک نکاح کی ضرورت تھی، اُس نے ایک نکاح کرلیا یہ تو اعتدال ہے اور اگر ایک شخص کو دو یا تین نکاح کی ضرورت ہو اور اس نے ایک پر اکتفار کرلیا تو یہ مجاہدہ ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو

اب سنئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بابت جو ملاحدہ کا اعتراض ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ان کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی قوت کا اندازہ نہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی آدمیوں جیسا سمجھتے ہیں حالانکہ عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ انبیاء علیہم السلام باطنی کمالات کے علاوہ ظاہری اور بشری کمالات میں بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے سو اور ہزار بیبیاں ہونا اہل کتاب میں مشہور ہے۔ اسی طرح ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی قوت بشریہ میں دوسروں سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں تیس مردوں کی، اور ایک روایت میں چالیس مردوں کی قوت تھی۔ پس اگر تیس یا چالیس نکاح بھی کرتے تب بھی اعتدال سے کسی طرح باہر نہ ہوتے کیونکہ آپ کو اس قدر قوت حاصل تھی، پھر جب اتنی قوت پر آپ نے نو بیبیوں پر اکتفا کیا تو یہ مجاہدہ ہوا یا کہ حظ نفس۔

بہرحال یہ صورت اعتدال سے آگے کسی طرح نہ تھی بلکہ اعتدال سے گذر کر مجاہدہ میں داخل تھی۔ پھر ضروری بات ہے کہ نو بیبیاں ہونے سے حقوق بھی آپ کے ذمہ بڑھ گئے۔ خواہ لزوماً یا التزاماً کیونکہ اس میں علماء کا اختلاف بھی ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر عورتوں کی باری مقرر کرنا اور برابری وغیرہ کرنا واجب تھا یا آپ تبرعاً کرتے تھے۔ بہرحال اس میں چاہے اختلاف ہو مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ برابری اور عدل کا پورا پورا لحاظ فرماتے تھے حتیٰ کہ بیماری میں بھی ایک کی باری میں دوسری کے گھر نہ رہتے تھے۔ البتہ مرض وفات میں جب ازواج مطہرات نے دیکھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دن کا بہت انتظار رہتا ہے تو سب نے رضامندی کے ساتھ عرض کیا کہ بس اب آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے گھر میں تشریف رکھیں۔ اور اس حالت میں ہر ایک کے گھر جانے میں آپ کو کلفت پہنچتی ہے۔

اب خیال کیجئے جائے کہ شخص کو حقوق کے ادا کرنے کا اس درجہ خیال ہو اس کے لئے نو بیبیوں کی اجازت محض ظاہر میں ایک رخصت ہے ورنہ حقیقت میں بڑی مشقت ہے۔ حتیٰ کہ بیبیوں میں عدل کرنا بڑی سلطنت کے عدل سے بھی مشکل تر ہے کیونکہ یہاں محض ضابطہ کا تعلق نہیں کہ صرف ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیلے دونوں سے محبت کا تعلق ہے ہر اک کی تکلیف سے دل دکھتا ہے۔ پھر شریعت کی پابندی کا مقتضایہ ہے کہ ظاہری برتاؤ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح ندی جائے ایسی حالت میں عدل کرنا بڑے مرد کا کام ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم عدل کی اس قدر رعایت فرماتے تھے کہ آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد بھی آپ یہ فرمایا کرتے اللھم ھذہ قسمتی فیما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک الٰہی یہ میری تقسیم ہے ان امور میں جو تیرے قبضہ میں ہیں پس مجکو اس چیز میں ملامت نہ فرمایئے جو میرے اختیار سے باہر ہے یعنی قلبی محبت اور رجحان۔ مثلاً میلان زیادہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف زیادہ تھا، تو یہ بات اختیار سے باہر تھی مگر ظاہری برتاؤ میں آپ سب کے ساتھ عدل پورا فرماتے تھے۔

پس اس مشقت پر نظر کر کے وہ رخصت بھی رخصت نہ رہی بلکہ وہ بھی عزیمت تھی اب کس کا منہ ہے کہ اپنے آپ کو احکام سے مستثنےٰ سمجھے اس لئے فرماتے ہیں قل انی امرت کہدیجئے کہ مجکو امر کیا گیا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے۔ اور آپ اس کے مامور ہیں تو وہ کیسا بڑا امر ہوگا۔ آگے فرماتے ہیں۔ ان اعبد اللہ مخلصا لہ الدین اس میں ایک بہت بڑا مسئلہ تصوف کا حل ہو گیا ہے۔

آج کل ایک فرقہ ہے جس نے تمام شریعت کی روح نکال لی ہے اور واقعی روح ہی نکال دی اور اپنی طرف سے دین کو مردہ کر دیا لیکن اللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون خدا اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا اگرچہ یہ دین لوگ ناگواری

ظاہر کرتے ہیں وہ لوگ احکام وعبادات کو بیکار سمجھتے ہیں۔ نماز کا خلاصہ نکالا ہے ذکر کہ بس خدا کی دھن لگی رہنی چاہیئے نماز کی کیا ضرورت ہے۔ زکوٰۃ کا خلاصہ یہ نکالا کہ ہمدردی ہونا چاہئیں روپیہ غریبوں کو دینے کی ضرورت نہیں۔ حج کا خلاصہ یہ نکلا کہ تعلقات قطع کر دینے چاہئیں۔ مکہ مکرمہ جانے کی ضرورت نہیں۔ غرض تمام عبادات میں اخلاق کو اصل سمجھا ہے اور اعمال کو بیکار کر دیا۔ اس آیت میں اُن کا جواب موجود ہے حق تعالیٰ نے اس آیت میں امرت کا مفعول ان عبد کو بنایا ہے اور مخلصا لہ الدین اس کا حال ہے اور حال میں اصل ہی ہے کہ عامل کی قید اور اُس کے تابع ہوتا ہے الا بدلیل مستقل تو اخلاص کو عبادت کا تابع بنایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ عبادات اصل ہیں اور احوال وکیفیات واخلاق ان کے تابع ہیں کہ اب کسی کا کیا منہ ہے کہ احکام وعبادات کو بے کار کہے سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے جا بجا عبادات کی تاکید اور ان کے ترک پر وعید ہے ہاں کسی کو قرآن پر ہی ایمان نہ ہو وہ جو چاہے کہے۔

اخلاص کے معنی لغت میں خالص کرنے کے ہیں اور شریعت میں بھی اس اُس کے معنی وہی ہیں جو درود شرع سے پہلے تھے۔ خالص گھی وہ ہے جس میں کوئی دوسری چیز ملی ہوئی نہ ہو اخلاص عبادت کے معنی بھی یہ ہوئے کہ عبادت کو غیر عبادت سے خالی کیا جائے یعنی کوئی ایسی غرض اس میں ملی ہوئی نہ ہو جس کا حاصل کرنا شرعاً مطلوب نہیں ہے۔ مثلاً نماز سے بزرگ مشہور ہونا زکوٰۃ دینے سے نام آوری اور حج سے حاجی کہلانا مقصود نہ ہو اور یوں کوئی نہ کوئی غرض تو ضرور ہوگی کیونکہ فاعل مختار کا فعل غرض سے خالی نہیں ہوسکتا پس اخلاص کے یہ معنی نہیں کہ رضاء حق اور جنت کی بھی غرض نہ ہو۔ کیونکہ یہ غرض تو مطلوب ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون اس میں رغبت

کرنے والوں کو رغبت کرنا چاہیئے۔ اھ

اس سے پہلے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے جن کی طرف رغبت کرنے کا امر خود قرآن میں موجود ہے۔ وفی الحدیث: اللھم انی اسئلک الجنۃ وما قرب الیھا من قول او عمل۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح دعا کیا کرتے تھے، اے اللہ میں آپ سے جنت کی درخواست کرتا ہوں اور ان اقوال و اعمال کی جو جنت کی طرف نزدیک کردیں۔ معلوم ہوا کہ جنت کی درخواست کرنا سنت ہے۔ اسی لئے میں نے اخلاص کی حقیقت یہ بیان کی تھی کہ عبادت کے ساتھ کوئی ایسی غرض نہ ملائی جائے جس کا حاصل کرنا مطلوب نہیں اور ثواب اور جنت کا اور عذاب سے نجات کا مانگنا مطلوب ہے اس لئے یہ غرض اگر عبادت میں ملی ہوئی ہو تو یہ اخلاص کے منافی نہیں۔

بعض لوگ بے دھڑک کہہ ڈالتے ہیں کہ ہم کو جنت کی پرواہ نہیں، دوزخ کی پرواہ نہیں یہ سخت بے ادبی ہے۔ ان لوگوں کو جنت و دوزخ کی حقیقت معلوم نہیں ورنہ ساری شیخی رکھی رہ جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جنت کی طلب کی ہے اور جہنم سے پناہ مانگی ہے۔ اور بعض اہل حال سے جو اس قسم کے اقوال منقول ہیں وہ غلبہ احوال میں ان سے صادر ہوئے ہیں یہ کوئی ان کے کمال کی دلیل نہیں حالت اکمل وہی ہے جو سنت کے موافق ہو مگر وہ حضرات بوجہ غلبہ حال کے معذور سمجھے جاتے ہیں اس وقت ان کو جنت کی طرف التفات نہ تھا ورنہ جنت ایسی چیز نہیں جس کی کسی کو پرواہ نہ ہو۔ پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اصل مقصود رضائے حق ہے، ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ رضائے حق پر نظر کرتے ہوئے بھی جنت کی درخواست ضروری ہے کیونکہ اول تو وہ محل رضا ہے جنت ہی میں حق تعالےٰ کی رضا کا ظہور ہوگا جب رضا مطلوب ہے تو محل رضا

بھی مطلوب ہونا چاہیئے۔ اذا ثبت الشیء ثبت بلوازمہ ہر شے اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوا کرتی ہے مطلوب کے مقدمات اور وسائل بھی من وجہ مطلوب ہوئے ہیں۔ لہذا رضا کے مطلوب ہونے سے بھی جنت کا مطلوب ہونا لازم آتا ہے پھر اس سے بے پروائی کے کیا معنی۔ دوسرے جب حق تعالےٰ کی رضا اصل مطلوب ہے اور رضا حاصل ہوتی ہے امتثال اوامر سے یعنی احکام کی بجا آوری سے اور میں آیت قرآنی سے بتلا چکا ہوں کہ حق تعالےٰ جنت کی طرف رغبت کرنیکا امر فرماتے ہیں تو جنت کی طرف رغبت کرنے اور اس کی درخواست کرنے سے بھی رضائے حق حاصل ہوگی کیونکہ اس میں بھی ایک حاکم کا امتثال ہے چنانچہ اسی امتثال حکم کی وجہ سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے متعدد دعاؤں میں جنت کی درخواست کی ہے پس یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ عبادات میں جنت اور ثواب کی طرف التفات کرنا اخلاص کے خلاف یا کمال کے منافی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جنت حق تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کے سامنے دنیا کی نعمتیں ہیچ ہیں مگر ہم کو دنیا کی نعمتوں سے بھی استغنا ظاہر کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور ان دنیوی نعمتوں کی قدر اور شکر کا حکم کیا گیا ہے تو خدا کی اتنی بڑی نعمت سے استغنا اور بے پروائی کیونکر جائز ہوگی۔ بس جن بزرگوں سے ایسی باتیں منقول ہیں کہ ہم کو جنت کی پروا نہیں، وہ ان سے غلبۂ حال میں صادر ہوئی ہیں۔ اس وقت ان کو جنت کی طرف التفات نہ تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان عبدیت تو یہ تھی کہ آپ کھانا تناول فرما کر یوں فرمایا کرتے تھے غیر مودع ولا مستغنی عنہ ربنا یعنی میں اس کھانے کو ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں کرتا (دوسرے وقت پھر اس کا محتاج ہونگا اور نہ اے خدا میں اس سے مستغنی ہوں۔ پھر جنت کی نعمتوں سے کون مستغنی

ہوسکتا ہے۔

یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج کل جو مریدوں کی عادت ہے کہ مشائخ کے سامنے جب کوئی ہدیہ پیش کرتے ہیں تو اکثر یوں کہا کرتے ہیں کہ آپ کو اس کی کیا پرواہ ہے یہ تو حقیر اور قلیل چیز ہے یہ محاورہ قابل ترک ہے۔ بخدا اس لفظ کو سنکر میرا تو رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔ مشائخ تو کیا چیز ہیں کہ وہ خدا کی نعمتوں سے مستغنی ہوں اور ان کو خدا کی نعمتوں کی پرواہ نہ ہو آخر وہ بھی انسان ہیں ان کو بھی کھانے پہننے اور روپیہ پیسہ کی احتیاج ہوتی ہے اگر ایک پیشاب بند ہو جاوے اس وقت حقیقت معلوم ہو جائے کہ پیر صاحب دنیا کی چیزوں سے کتنے بے پرواہ ہیں، یہ محض جہالت ہے اور جو مشائخ اس لفظ کو سُن کر خاموش ہو جاتے ہیں ان کی ہمت ہے ایسے الفاظ کبھی شیخ کے لئے استعمال کرنے چاہئیں۔ جو انبیاء علیہم السلام کے واسطے بھی بولنے جائز نہیں۔ انبیاء علیہم السلام بھی خدا کی سب نعمتوں کے محتاج تھے۔

جب حضرت ایوب علیہ السلام کو خدا تعالےٰ نے مرض سے شفا عطا فرمائی ہے وہ غسل کر رہے تھے اسی وقت ان کے اوپر سونے کی ٹڈیوں کی بارش آسمان سے ہوئی۔ وہ ان ٹڈیوں کو فوراً جمع کرنے لگے حق تعالیٰ نے فرمایا۔ افلم اکن اغنیتك کہ کیا میں نے تم کو غنی نہیں کیا۔ انھوں نے عرض کیا بلٰی یارب ولکن لاغنائی عن برکتك کہ خدایا آپ نے بیشک مجھے غنی بنایا ہے لیکن آپ کے تبرک سے تو بے پرواہ نہیں ہوسکتا پس خدا کی نعمتوں سے بے پروائی کسی کو کسی وقت نہیں ہوسکتی تو ہم خدا تعالےٰ کی رضاء کے بھی محتاج ہیں جنت کے بھی محتاج ہیں ثواب کے بھی محتاج ہیں اور یہ وہ مقاصد ہیں جن کا اعمال رئیسہ میں مطلوب ہونا ظاہر ہے۔ ان کی نیت عبادات میں کرنا اخلاص کے خلاف نہیں۔ جب آپ کو اخلاص کی ضرورت

اور اس کی حقیقت معلوم ہوگئی۔

اب یہ معلوم کیجئے کہ حج کا کن چیزوں سے خالص کرنا ضروری ہے۔ سو سُن لیجئے کہ دنیوی اغراض ہیں جن سے حج کا خالص کرنا ضروری ہے دینی کام کے ساتھ دنیوی غرض کا ملنا ایسا ہے جیسے کہ دودھ میں پانی ملا دیا جائے اور کون نہیں جانتا کہ دودھ خالص وہی ہے جس میں پانی نہ ہو۔ اسی طرح خالص عبادت وہی ہے جس میں دنیوی غرض کوئی ملی ہوئی نہ ہو۔ اور دودھ میں پانی ملانے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دودھ میں پانی ملا یا جائے۔ دوسرے یہ کہ پانی میں دودھ ملا یا جائے۔ تیسرے یہ کہ دونوں کو ایک ساتھ کسی دوسرے برتن میں ڈال دیا جائے۔ حج میں آمیزش کی بھی یہی تین صورتیں ہیں۔

۱ یہ کہ حج سے پہلے ہی کوئی خرابی اُس میں ڈال دی جائے۔ ۲ دوسرے یہ کہ حج کرکے اس کو خراب کر دیا جائے۔ ۳ تیسرے یہ کہ حج کے ساتھ ساتھ خرابیاں بھی ہوتی رہیں۔

حج سے پہلے خرابی ڈالنے کی صورت یہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی دنیوی غرض اس کی ساتھ ملائی جائے، مثلاً حاجی کہلانے کی نیت ہو یا مال حرام سے سفر کیا جائے۔ حج کے ساتھ ساتھ خرابیاں ہونے کی صورت یہ ہے کہ سفر حج میں معصیت کرتے ہیں۔ گناہوں سے توبہ نہ کی ہو۔ مثلاً بعض لوگ حج کے سفر میں نماز چھوڑ دیتے ہیں، اور جو کوئی اُن سے کہتا ہے کہ بھائی یہ کیسا حج ہے کہ نماز ہی موقوف کر دی۔ تو کہتے ہیں کہ صاحب ایسی گندی حالت میں نماز کیسے پڑھیں، جہاز کے پائخانہ غلیظ ہوتے ہیں چھینٹیں اڑ کر کپڑوں پر آتی ہیں کپڑوں کا کیا اعتبار جوتوں کا کیا اعتبار خدا فقہا کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے وسوسہ کو اس قدر قطع کیا ہے کہ کوئی کیا قطع کرے گا۔ فقہا فرماتے ہیں کہ جب تک قسم کھا کر یہ نہ کہہ سکے کہ میرا وضو ٹوٹ گیا ہے اس وقت تک وہ باوضو ہے۔ اسی طرح کپڑوں کا

حکم ہے جب تک یقین نہ ہو جائے کہ ان میں ناپاکی لگ گئی ہے اس وقت تک کپڑوں کو پاک سمجھنا چاہیئے۔ خواہ کیسے ہی پاخانے غلیظ ہوں احتیاط کرکے بیٹھو۔ اور احتیاط سے اُٹھو۔ جب تم کو ناپاکی کپڑوں پر نظر نہیں آتی ان کو پاک ہی سمجھو لیجئے شریعت میں کس قدر آسانی ہے اب بھی اگر کوئی نمازیں برباد کرے وہ خود بھگتے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ یہ دو فرقے دین کے محافظ ہیں۔ فقہاء اور صوفیہ اور فقہا کا وجود تو مسلمانوں کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی۔ علماء نے لکھا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے۔ مگر فقہاء کو معلوم ہے کہ خدا کو ان کی ساتھ بھلائی منظور ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین جس کے ساتھ خدا کو بھلائی کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اس کو دین کی سمجھ یعنی فقہ عطا کرتے ہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے وفات کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا، فرمایا مجھ کو حق تعالے کے سامنے پیش کیا گیا تو حق تعالے نے فرمایا کہ اے محمد مانگو کیا مانگتے ہو میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت کر دی جائے جواب ملا کہ اگر ہم تم کو بخشنا نہ چاہتے تو فقہ عطا نہ کرتے ہم نے تم کو فقہ اسی لئے عطا کیا تھا کہ تم کو بخشنا منظور تھا مگر اس سے مامون العاقبۃ ہونا لازم نہیں آتا۔ یعنی یہ نہ سمجھا جاوے کہ فقہاء پر سوء خاتمہ کا اندیشہ بالکل نہیں اس لئے مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کیونکہ حق تعالے اگر فقیہ کو عذاب کرنا چاہیں گے تو فقہ کو اس سے سلب کرلیں گے، کوئی یہ نہ کہے کہ فقہ کیونکر سلب ہو جاوے گا۔ بات یہ ہے کہ فقہ کتابوں کو پڑھ لینے کا نام نہیں فقہ ایک نور ہے جو فقیہ کے دل میں ہوتا ہے جس کی برکت سے اس کو دین کی سمجھ حاصل ہوتی ہے، اور اس نور کو حق تعالے جب چاہیں سلب کرلیں وہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اب تم لاکھ کتابیں پڑھتے پڑھاتے رہو مگر

چونکہ دین کی سمجھ نہیں رہی تم فقیہ نہیں ہو سکتے۔ اور وہ نور فقہ طاعات اور اور تقویٰ سے بڑھتا ہے اور معاصی سے سلب ہو جاتا ہے جو فقیہ مطیع اور متقی نہ ہو وہ کتابوں کا فقیہ ہے حقیقی فقیہ نہیں اور نہ اس کے واسطے وہ بشارت ہے جو حدیث میں مذکور ہے۔ اس لئے خاتمہ سے اطمینان کسی حال میں فقیہ کو بھی نہیں ہو سکتا۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ فقہ دین کی سمجھ کا نام ہے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ فقیہ صوفی ضرور ہو گا۔ ہمارے فقہاء جتنے ہوئے ہیں سب صاحب نسبت اور صاحب معرفت تھے۔ نسبت اور معرفت کے بغیر دین کی سمجھ کامل نہیں ہو سکتی۔

ایسے ہی فقہاء کی شان میں فرمایا گیا ہے فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد۔ کہ ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے جس کو دین کی سمجھ ہو گی وہ شیطان کے فریبوں کو خوب سمجھے گا اور اس کی ایک چال نہ چلنے دے گا۔ اور کورے عابد کو تو شیطان جس طرح چاہے پٹی پڑھا سکتا ہے ہم نے ایک عابد زاہد کو سفر حج میں دیکھا کہ نماز بالکل چھوڑ بیٹھتے تھے شیطان نے ان کو اسی قسم کی پاکی اور ناپاکی کے توہمات میں مبتلا کر دیا تھا۔ فقیہ ان باتوں میں کبھی نہ آئے گا۔ تو حدیث میں جس فقیہ کو ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری بتلایا گیا ہے۔ یہ وہی فقیہ ہے جس کو دین کی سمجھ ہو صرف کتابیں پڑھنے والا فقیہ مراد نہیں۔

حضرات فقہاء شیطان کی ان چالوں کو خوب سمجھتے تھے اسی لئے انھوں نے پاکی اور ناپاکی کے مسائل میں بہت توسع فرمایا ہے اور یہ ان کی وسعت نظر کی دلیل ہے کہ جو باتیں ان کو پیش بھی نہ آئیں تھیں ان کو بھی سوچ سوچ کر بیان کر گئے اور پھر قواعد ایسے بیان کر دیئے جن سے قیامت تک کی جزئیات کا حکم نکالنا آسان ہو گیا۔ ان مسائل کی ضرورت گھر بیٹھے نہیں معلوم ہو سکتی مگر فقہاء ایسے تنگ نظر نہ تھے کہ گھر سے باہر ان کی نظر نہ جائے۔ فقہاء کے پیش نظر

دریا کا طلاطم بھی تھا، وہ اس کے احکام بھی بیان کر گئے ہیں کہ اگر چکر آتا ہو کھڑا نہ ہوسکتا ہو تو نماز بیٹھ کر یا لیٹ کر ہی پڑھ لے۔ اگر دوران سفر کی وجہ سے کپڑوں کے پاک کرنے اور دھونے کی طاقت نہ ہو نہ کوئی رفیق یہ کام کرسکتا ہو نہ زیادہ کپڑے اس کے پاس ہوں تو اُسی ناپاک کپڑے سے نماز پڑھ لے۔ فقہاء نے اس میں بھی کلام کیا ہے کہ اگر جہاز وغیرہ میں چکر نہ بھی ہو تب بھی بیٹھ کر نماز جائز ہے یا نہیں اگرچہ مفتی بہ قول یہی ہے کہ چکر نہ ہو تو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے مگر اس سے حضرات فقہاء کی وسعت نظر تو معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے جزئیات کا بہت احاطہ کیا ہے۔

استنجے کی بابت بھی فقہاء نے خوب تفصیل لکھی ہے کہ کس حالت میں فرض اور واجب ہے اور کس حالت میں سنت ہے۔ حضرت اگر فقہاء کی یہ رخصتیں اور تحقیق نہ ہو جہاز میں تو سب نماز روزے رخصت ہو جاتے یہاں وہم نہیں چل سکتا جہاز میں بڑے بڑے وہمیوں کا وہم رخصت ہو جاتا ہے اور یہاں تو بالعوض رخصت ہوتا ہے اور مدینہ منورہ کے راستہ میں بلا عوض رخصت ہو جاتا ہے سفر مدینہ منورہ کے بعد پھر وہم پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہاں پانی بھی کم ملتا ہے۔ اور راستہ میں پیاس کی بھی شدت ہوتی ہے، بڑے بڑے وہمی وہاں جھک مار کر پانی کم خرچ کرتے ہیں تاکہ پیاسے نہ مرجائیں پھر اس پہ غضب یہ ہوتا ہے کہ حاجی اپنا خون خشک کر کے پانی بچاتا ہے اور بدو مشک کھول کر بہت سا پی جاتا ہے۔

ایک مرتبہ مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے قافلہ میں بدوؤں نے حاجیوں کا پانی پینا شروع کیا۔ مولانا شیخ البدویین کے پاس تشریف لے گئے، ادیب بہت بڑے تھے۔ آپ نے جاکر اس سے کہا کہ ان بدوؤں کو منع کردو کہ ہمارا پانی نہ پئیں ہم کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں ایک جملہ آپ نے یہ بھی فرمایا ھم لایشربون ماءنا بل یشربون وباءنا یہ لوگ ہمارا

پانی نہیں پیتے بلکہ لہو پیتے ہیں شیخ البدوین نے کہا انت فصیحٌ تم بہت فصیح بلیغ ہو۔ اس فصاحت کا یہ اثر ہوا کہ اس نے بدؤں کو روکدیا کہ شیخ کا پانی کوئی نہ پیئے غرض مدینہ منورہ کے راستہ میں تو وہم رہتا ہی نہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ وضو وغیرہ میں پانی زیادہ صرف کرتے ہیں اُن کو پانی برتنے کا طریقہ نہیں آتا ورنہ اگر طریقہ سے وضو کریں تو بہت کم پانی صرف ہوتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وضو وغیرہ میں پانی زیادہ تر بدن سے لگ کر صرف نہیں ہوتا زیادہ حصہ بدن سے لگنے سے پہلے ہی ادھر اُدھر گر جاتا ہے تو اگر اس کا خیال رکھا جائے تو ہر چلو پانی بدن سے اچھی طرح لگ کر زمین میں گرے تو بہت تھوڑے پانی میں بافراغت وضو ہو جاتا ہے۔ تو حج میں ایک کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ نماز ہی کو بہت سے لوگ حذف کر دیتے ہیں۔ ایک معصیت خاص حج کے متعلق زیادہ یہ پیش آتی ہے کہ گھر سے نکل کر لڑنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ حج کی لڑائی مشہور ہے۔ اچھے اچھے دوستوں بلکہ باپ بیٹوں میں بھی لڑائی ہو جاتی ہے اور پیر مرید کا تعلق حالانکہ باپ بیٹے سے بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے مگر ہم نے حج میں پیر مرید کو بھی لڑتے دیکھا ہے مگر کمال یہ کہ پیر پھر بھی ان سے خفا نہ تھے باوجودیکہ شریعت میں سب سے زیادہ حق باپ کا ہے اس کے بعد استاد کا، اس کے بعد پیر کا۔ مگر یہ طبعی بات ہے کہ محبت پیر کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ پیر کا تعلق خالص دینی تعلق ہے۔ دنیا کا اس میں لگاؤ نہیں اور جس تعلق میں دنیا کا لگاؤ نہ ہوگا وہ ضرور مستحکم ہوگا۔ پیر چونکہ خالص دین کی تربیت کرتا ہے اس لئے اس سے زیادہ کوئی علاقہ موثر نہیں مگر ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حج میں پیر اور مرید کا علاقہ بھی لڑائی سے نہیں رک سکتا اب یا تو یہ اس سفر کی خصوصیت ہے یا ان پیر صاحب کو کچھ دنیا اُن سے مطلوب ہوگی اس لئے ان کی وقعت مریدوں کی نظر میں نہ تھی۔ چنانچہ ہمارے قافلہ میں بھی لڑائی شروع ہوگئی ہے

اور اس کے آثار دیکھ کر مجھے سخت رنج ہوتا ہے۔ اور ابھی تو جہاز کا سفر بھی شروع نہیں ہوا۔ بمبئی تو گویا گھر ہی کے مثل ہے جب یہیں یہ باتیں شروع ہوگئیں تو آیندہ کا اور اندیشہ ہے، اس لئے اِسی وقت سے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ گناہوں سے طاعات کا ثواب کم ہوجاتا ہے تو یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ جس ثواب کے لئے روپیہ خرچ کیا جائے، جان پر مشقت برداشت کی جائے اس کے ثواب کو دو چار باتوں میں کم کر دیا جائے۔ میں کئی روز سے ایسے آثار دیکھ رہا ہوں مگر میری عادت نہیں کہ خود کسی کے معاملہ میں دخل دوں میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے اس لئے خود کسی معاملہ میں دخل دینے کو جی نہیں چاہتا یہ خیال ہوتا ہے کہ میرا تو کام نہیں میں کیوں دخل دوں۔ کسی کو لاکھ دفعہ غرض پڑے اپنی اصلاح کا طریقہ دریافت کرے۔ ورنہ میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اپنے آپ تو کسی کو اپنی اصلاح کا قصد نہ ہو اور میں اس کے پیچھے پڑتا پھروں اگر کسی وقت شفقت کا غلبہ ہوتا ہے تو میں خود بھی نرمی سے کہہ دیتا ہوں اور بعض بزرگ ایسے بھی ہیں جن پر شفقت کا غلبہ زیادہ ہے وہ خود اپنے متعلقین کے معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ مجھ پر بھی اگر کسی وقت یہ رنگ غالب ہوتا ہے تو ایسا کرتا ہوں مگر میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے، یہ دونوں مذاق ہیں اور دونوں کی اصل قرآن سے ثابت ہے۔ اس لئے کسی مذاق پر طعن کا کسی کو حق نہیں۔ اگر مجھ سے طریقہ دریافت کیا جائے گا بتلادوں گا ورنہ جیسا کریں گے خود بھگتیں گے حج کے سفر میں زیادہ تر لڑائی جھگڑے اس سے پیش آتے ہیں۔ کہ ایک کو دوسرے سے توقع ہوتی ہے۔ پھر جب اس توقع کے خلاف برتاؤ ہوتا ہے تو جھگڑے پیش آتے ہیں۔ اس ہی لئے فقہا نے لکھا ہے کہ سفر حج میں زاد میں کسی کو شریک نہ کرے اس شرکت کی وجہ سے ہر شریک کو دوسرے سے امداد اور راحت رسانی کی توقع ہوتی ہے اور سفر کی حالت میں بعض دفعہ انسان اپنی بھی

امداد نہیں کر سکتا تو دوسرے کی کیا خاک امداد کرے گا۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص اپنا سامان کھانے پینے کا جُدا رکھے اور انتظام پکانے کا بھی الگ کرے۔ دوسرے کسی سے کچھ توقع نہ رکھے اس کے بعد اگر کسی سے ذرا سی بھی راحت پہنچ جائے گی اس کی قدر ہوگی۔ اور نہ پہونچے گی تو شکایت نہ ہوگی۔ بہر حال ان وجوہ سے یہ قصے حج سے پہلے ہی شروع ہو گئے ہیں ان کی اصلاح بہت ضروری ہے خدا تعالےٰ اس کو دفع کرے یہ بھی ان ہی معاصی میں سے ہے جو حج سے پہلے ہوتی ہیں۔

بعض لوگ ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ رقم کی بابت احتیاط نہیں کرتے۔ رشوت وغیرہ کی رقم لے کر حج کو جاتے ہیں، کبھی اور کوئی حرام کمائی ہوتی ہے حدیث میں آتا ہے رب اشعث اغبر یطیل سفرہ والملبس حرام وماکلہ حرام یرفع یدیہ یدعو اللہ فان یستجاب لہ اھ او کما قال۔ بہت سے پراگندہ بال خستہ حال آدمی جو لمبا سفر کرتے ہیں ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعائیں کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ لباس بھی حرام کا ہے اور غذا بھی حرام ہے پھر ان کی دعا کیونکر قبول ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرام کمائی کے ساتھ دعا قبول نہیں ہوتی اور دعا بھی عبادت ہے۔ تو اسی سے دوسری عبادات کا حال یہی سمجھ لیا جائے کہ اور عبادات بھی حرام مال سے اگر کی جائیں گی قبول نہ ہوں گی۔ پس حرام کمائی کے ساتھ حج بھی قبول نہ ہوگا اس لئے اس کا بہت خیال کرنا چاہیئے کہ زاد راحلہ اور روپیہ وغیرہ حرام مال سے نہ ہو حلال کمائی ہونی چاہیئے۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ آجکل تو اکثر آمدنیاں حرام ہی ہیں پھر کسی کا بھی حج قبول نہ ہوگا سو یہ بالکل غلط ہے، وہی فقہاء جو رحمت عالم ہیں ان سے پوچھو دریافت کرو جو آمدنی اس کے فتوے سے جائز و حلال ہو اس کو حلال سمجھو اور فتوے کی رو سے بہت سی آمدنیاں اب بھی حلال ہیں۔ اس میں زیادہ غلو کرنے اور تقویٰ بھگارنے کی ضرورت نہیں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لا تغلوا فی دینکم دین میں غلو مت کرو۔ یعنی بات بات میں شبہات مت نکالو۔ بال کی کھال نہ کھینچو۔ ظاہر میں تو غلو اچھا معلوم ہوا کرتا ہے انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے یہ تو تقویٰ ہے کہ میں ذرا ذرا بات کی چھان بین کرتا ہوں بعض لوگ عوام کے سامنے ایسی حکایات بیان کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب روزی حلال آئے انھوں نے کہا چند روز پہلے تک تو حلال تھی مگر ایک بار میرے بیل دوسرے کے کھیت میں جا گھسے وہاں کی مٹی ان کے کھریوں کو لگ گئی، پھر وہ میرے کھیت میں مل گئی، پھر اس میں غلہ پیدا ہوا اس لئے حلال نہیں رہا۔ مگر اس غلو کے انجام ابتلاء فی المعصیت ہوجاتا ہے یعنی تھوڑے دنوں میں یہ تقویٰ بھی جاتا رہتا ہے، اور فتویٰ بھی۔ کیونکہ جب ان توہمات کے ساتھ حلال روزی کوئی سمجھ میں نہیں آتی تو شیطان پٹی پڑھا دیتا ہے کہ بس دنیا میں حلال روزی تو میسر نہیں آسکتی۔ اور بدون کھائے پیئے گذران نہیں چل سکتا تو اب حلال و حرام کی فکر ہی فضول ہے، جو آجائے اور جس طرح آجائے کھا لینا چاہیئے۔ ہمیشہ غلو کا یہی انجام ہوتا ہے کیونکہ توہمات کا سلسلہ کم نہیں ہوا کرتا، بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ پھر آخر کار گھبرا کر اس کو بھی چھوڑ دیتا ہے جس کا شریعت نے حکم کیا تھا۔

اسی واسطے فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص گیہوں کا ایک دانہ لئے پھرے کہ یہ کس کا ہے اس کو سزا دینی چاہیئے کیونکہ یہ تقویٰ کا ہیضہ ہے کہ آپ ایک دانہ کو پکارتے ہوئے پھرتے ہیں واقعی فقہاء نے شیطان کے فریبوں کو خوب سمجھا ہے، ظاہر میں تو یہ حکم فقہاء کا گراں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے دانہ کو پڑا پائے تو اس کے پوچھنے میں کیا حرج ہے، مگر فقہا کی نظر انجام پر ہے کہ اس تقوی کی انتہا مصیبت ہے۔

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حرام مال کما کر حج کو جاتے ہوئے دوسرے شخص کے حلال مال سے اس کو بدل لیتے ہیں گویا خدا سے بہانہ کرتے ہیں مگر اس سے کچھ نہیں

ہوتا بدلین کا حکم ایک ہی ہوتا ہے اس بدلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حلال مال بھی حرام ہو جاتا ہے۔ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ فقہاء نے بھی تو ایسا حیلہ لکھا ہے۔

جواب یہ ہے کہ اول تو وہ حیلہ اس طرح نہیں جس طرح تم کرتے ہو کہ حلال و حرام کا ادلہ بدلہ کرتے ہو وہ حیلہ دوسرا ہے۔ دوسرے فقہاء نے وہ حیلہ بھی اس لئے نہیں لکھا کہ اس کے سہارے سے حرام مال کمایا کریں اور اس کو اپنے تصرف میں لایا کریں فقہاء نے وہ حیلہ صرف اس واسطے بیان کیا ہے کہ اگر کسی وقت کسی کے پاس ایسی رقم آجاوے جو کمانے والے نے تو حرام طریقہ سے کمائی ہو مگر اس کے پاس حلال طریقہ سے آئی ہو، مثلاً کسی کو میراث میں رقم مل گئی اور مرنے والا سود خوار رشوت خوار تھا، اب یہ پتہ نہیں کہ یہ ساری میراث سود اور رشوت ہی کی ہے یا بالکل حلال ہے یا دونوں قسم کا روپیہ ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ رشوت کس کس سے لی تھی اس صورت آسانی کے لئے وہ صورت بیان کردی ہے، باقی جس نے خود رشوت لی ہے اور وہ جانتا ہے کہ فلاں سے میں نے رشوت لی ہے اس کو اس حیلہ پر عمل کرنا جائز نہیں بلکہ اس پر واجب ہے کہ جس سے رشوت لی ہے اس کو اس کی رقم واپس کردے اور جس سے سود لیا ہے اس کو سود واپس کردے پھر اس کے بعد دیکھے کہ حلال آمدنی کتنی بچی ہے اگر اس میں حج کرسکے تو حج کو جائے ورنہ اس پر حج فرض ہی نہ ہوگا۔ مگر آجکل تو لوگوں نے سستا نسخہ یاد کرلیا ہے کہ حرام مال خوب کماؤ بعد میں ادلا بدلہ کرکے اس کو حلال کرلیں گے یہ محض خدا تعالےٰ کے ساتھ بہانہ ہے جو کبھی جائز نہیں پھر فقہا نے جو صورت حیلہ کی بیان کی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حیلہ کے بعد گناہ سے بھی بچ جائے گا گناہ پھر بھی گتاہ رہے گا کیونکہ اس حیلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس حرام کی رقم ہو اور وہ کسی دوسرے سے قرض روپیہ لے کر اس سے حج کرکے بعد میں اُس قرض کو اس حرام روپے سے ادا کردے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ اس صورت میں حج صحیح ہوگیا کیونکہ قرض گو انتہاءً معاوضہ ہے مگر ابتداءً تبرع ہے تو گویا اس نے ایسے مال سے حج کیا جو اس کو دوسرے کے پاس سے تبرعاً ملا ہے

اور انتہائے جو مبادلہ تھا سو وہ مبادلہ دیوں میں ہے۔ عین میں نہیں یعنی جب اس نے ادا کیا ہے اس کا دین اس دوسرے کے ذمہ واجب ہو گیا پھر دونوں دین میں مقاصہ ہو گیا اس لئے حرام روپیہ ادا کرنے سے اس روپیہ میں خبث نہ آئے گا جو پہلے قرض لیا گیا تھا۔ اس سے فقہاء کی فہم کا اندازہ ہوتا ہے بھلا خشک محدث ان دقائق کو کہاں سمجھ سکتا ہے لیکن فقہاء کا اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ اس صورت میں حج صحیح ہو جائے گا حج میں کوئی خرابی نہیں یہ مطلب نہیں کہ گناہ نہ ہو گا اس صورت میں یہ شخص دوسری معصیت کا مرتکب ہوا وہ یہ کہ دوسرے شخص کو حرام مال استعمال کے لئے دیا۔ حرام مال کا نہ خود کھانا جائز ہے نہ دوسروں کو کھلانا جائز، حتیٰ کہ کافر کو بھی حرام مال کھلانا جائز نہیں یہاں تک کہ ناپاک چیزوں کا کھلانا جانوروں کو بھی جائز نہیں۔ بعض لوگ ایسا کھانا جس میں کتا بلی منہ ڈال جائے بھنگی کو دیدیتے ہیں یہ ناجائز ہے بلکہ یہ چاہیئے کہ اس سے کہدیں کہ اس چیز کو پھینکدو اس کے بعد اگر وہ خود کھالے یا اپنے گھر لے جاوے یہ اس کا فعل ہے تم خود اس کو استعمال کے لئے مت دو۔ غرض رشوت اور سود کا مال قرض میں دینا بھی جائز نہیں۔

حدیث میں ہے لعن اللہ اکل الربوا وموکلہ خدا لعنت کرے سود کھانے والے پر اور کھلانے والے پر مراد دوسرے کو دینا ہے چونکہ لینا دینا سبب ہو جاتا ہے کھانے پینے کا اس لئے اس کو اکلہ وموکلہ سے تعبیر فرمایا مقصود یہ ہے کہ سود لینے والے اور سود دینے والے دونوں پر لعنت ہے اس میں یہ صورت بھی شامل ہے کہ سود لے کر کسی دوسرے شخص کو وہ روپیہ اپنے قرض میں دیا جائے اس صورت میں اس نے اس کو سود کا روپیہ دیا، ایک گناہ تو یہ ہوا۔ اس سے بڑھ کر ایک اور گناہ کا مرتکب ہوا۔ وہ یہ کہ اکثر لوگ حرام کا روپیہ قرض میں دے کر اپنے آپ کو بری سمجھتے ہیں ان کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا ہے تاکہ اس سے توبہ کریں۔ اور اگر اس دوسرے شخص کو خبر نہیں کی کہ یہ روپیہ

سود اور رشوت سے ہم نے حاصل کیا تھا جو تم کو قرض کے بدلہ میں دے رہے ہیں تو دھوکہ دینے کا تیسرا گناہ اور ہوا۔

خلاصہ یہ کہ حرام کمائی کرنے والے حج کو جاتے ہوئے جس طرح اولا بدلہ کرتے ہیں اس سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ مال جو بدلہ میں لیا جاتا ہے حرام کا حرام ہی رہتا ہے اور جو حیلہ فقہاء نے بیان کیا ہے اس طریقہ سے اگرچہ حج صحیح ہوجاتا ہے مگر ایک گناہ کے بدلے کئی گناہ لازم آجاتے ہیں اس لئے اس کی بہت ضرورت ہے حج کے لئے خالص حلال سفر خرچ لیا کریں۔

ایک کوتاہی حج میں یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگوں کو افتخار اور اشتہار کی عادت ہوتی ہے جہاں بیٹھتے ہیں اپنے حج کے تذکرے کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کو حاجی سمجھیں لوگوں سے فخراً کہتے ہیں کہ ہم نے سفر حج میں اتنا روپیہ خرچ کیا، مکہ معظمہ میں اتنا دیا، مدینہ منورہ میں اتنا خیرات کیا یقول اھلکت مالا لبدا۔ حق تعالے کفار کی مذمت میں فرماتے ہیں کہ کافر خرچ کرکے گاتا پھرا کرتا ہے کہ میں نے مال کے ڈھیر خرچ کر دیئے یہ وہ معاصی ہیں کہ خشک مولوی بھی یہاں تک نہیں پہنچتے حج میں افتخار اور اشتہار اور تعظیم و تکریم کی خواہش نہ ہونی چاہیئے۔ اس میں تواضع و مسکنت ذلت و خواری ہونی چاہیئے۔ یہ سفر سفر آخرت کے مشابہ ہے کہ اپنے گھر بار زمین جائداد وغیرہ کو چھوڑ کر اقرباء سے رخصت ہوکر جاتا ہے اور تھوڑا سا سامان ساتھ لیتا ہے جیسا کہ مردہ سب سامان چھوڑ کر صرف کفن ساتھ لے جاتا ہے بلکہ بعض حاجی بھی اس خیال سے کہ موت ہر ایک کے ساتھ ہے نہ معلوم کس وقت موت آجائے کفن بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور عوام تو اس کو بہت ضروری سمجھتے ہیں مگر افسوس ہے کہ کفن ساتھ لیکر بھی وہ کام نہیں کرتے جو کفن پہننے والے کو کرنے چاہیئں۔ جب کفن ساتھ لیا تھا تو چاہیئے تھا کہ اپنے آپ کو اسی وقت مردہ تصور کرتے اور ساری شیخی اور تکبر کو یہیں چھوڑ جاتے اور پہلے سے زیادہ اعمال آخرت کے لئے کوشش کرتے مگر کچھ نہیں یہ کفن ساتھ لینے کی بھی ایک رسم ہوگئی ہے ورنہ بعض لوگ سفر حج میں پہلے سے گناہ

کرنے لگتے ہیں، نماز چھوڑ دیتے۔ جماعت کا اہتمام تو اچھے اچھے بھی نہیں کرتے اور لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔ اور حج کر کے اپنے کو سب سے افضل سمجھنے لگتے ہیں کیا سفر آخرت کی یہی شان ہونی چاہیئے۔ سفر حج اس اعتبار سے بھی قبر کے مشابہ ہے کہ جس طرح قبروں میں کبھی دو آدمی پاس پاس دفن ہوتے ہیں مگر ہر ایک کا جدا حال ہوتا ہے کوئی راحت میں ہے کوئی عذاب میں اور ایک کو دوسرے کی حال کی خبر نہیں ہوتی اسی طرح حج میں ایک شگفتہ ہے ایک دیگر ہے اور ہر ایک کو اپنی اپنی فکر ہوتی ہے دوسرے کی فکر کسی کو نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ اور جو شخص اس سفر میں دوسروں کی خدمت کرے وہ تو گویا مجاہد فی سبیل اللہ ہے بعض لوگ ایسے بیہودہ ہوتے ہیں کہ حج میں روزانہ کے واقعات قلمبند کرتے ہیں وہاں بھی ان کو مضمون نگاری سوجھتی ہے اگر اس خیال سے کوئی شخص حالات قلمبند کرے کہ دوسروں کو حج آسان ہو جائے گا اس کا مضائقہ نہیں مگر بعض لوگوں کو محض اخبار نویسی اور مضمون نگاری کا شوق ہوتا ہے۔

ہمارے ساتھ ایک ڈپٹی کلکٹر تھے وہ ہندوستان کے اخباروں میں لکھ لکھ کر وہاں کے حالات بھیجتے تھے۔ اور سفر کی تکالیف کو بہت مبالغہ سے لکھتے تھے تاکہ پھر کوئی حج کا نام ہی نہ لے اسی طرح ایک اور صاحب تھے وہ بھی وہاں کی شکایات جمع کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس ایک محضر لکھ کر لائے جس میں وہاں کی تکالیف کو قلمبند کیا تھا کہ اس پر دستخط کر دو۔ میں نے کہا کہ حضرت تصدیق وہ کرے جس کو ان تکالیف کی اطلاع ہو، مجکو تو کوئی تکلیف ہی پیش نہیں آئی پھر کاہے کی تصدیق کروں۔ بس وہ خفا ہو گئے اور کہنے لگے کہ بس ہندوستانیوں میں اتفاق نہیں۔ سو اگر پہلے ہی سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ سفر آخرت کا سفر ہے پھر کوئی بھی کلفت معلوم نہ ہو مگر آجکل تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جیسے گھر میں آرام کے ساتھ بسر کرتے ہیں ویسے ہی حج کے سفر میں رہیں حالانکہ سفر میں گونا مشقت اور تکلیف کا ہونا ضروری ہے۔ دل میں اگر شوق اور محبت ہو تو پھر کوئی تکلیف نہیں رہتی اور جہاں بیت اللہ پر ایک نظر پڑی اسی وقت سب کلفت رفع ہو جاتی ہے اس وقت یاد بھی نہیں آتا کہ اس سے پہلے

کیا کیا پیش آیا تھا۔ پس وہ حال ہوتا ہے جو جنت میں پہنچکر جنتیوں کا ہوگا۔
الحمد للّٰہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب۔ جنتی جنت میں پہنچکر کہیں گے کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے رنج و غم کو دور کر دیا بیشک ہمارا خدا بڑا بخشنے والا قدردان ہے جس نے ہم کو ٹھکانے کے گھر میں پہونچادیا اپنے فضل سے جس میں نہ ہم کو کوئی مشقت معلوم ہوتی ہے نہ کچھ تھکن محسوس ہوتی ہے۔ یہی حال بیت اللہ کو دیکھ کر اہل شوق کا ہوتا ہے۔ بعض لوگ سفر حج میں پریشان ہو جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شوق سے خالی ہیں اور وہ اس کو سفر آخرت نہیں سمجھتے، نیز جو شخص اس کو سفر آخرت سمجھتا ہوگا اس میں دعویٰ اور افتخار بھی نہ ہوگا ؎

فکر خود و رائے خود در مذہب رندی نیست
کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور اپنی فکر محبت کے راستے میں نہیں ہے مذہب عشق میں خودرائی اور خودبینی کفر ہے)
کلفت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے جب سفر میں کوئی بات اپنی شان کے خلاف پیش آتی ہے تو اس سے ناگواری پیدا ہوتی ہے پھر اسی دوسرے سے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اگر ہر شخص اپنے آپ کو مٹادے اور عزت و آبرو کو بالائے طاق رکھ کر اپنے کو سب کا خادم سمجھے تو یہ باتیں پیش ہی نہ آئیں۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ گھر سے چلتے ہیں یہی خیال کر کے کہ ہماری یوں آؤ بھگت ہوگی۔ ہم جب لوٹیں گے لوگ ہم کو حج کی مبارک باد دینے آئیں گے اور جو مبارک باد دینے نہ آئے اس کی شکایت کی جاتی ہے کہ ہم حج کر کے آئے تھے ہمکو مبارک باد بھی نہ دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
ارے بھائی تم نے حج کیا تھا تو کیا کمال کیا۔ تمہارے ذمہ فرض تھا اگر ادا نہ کرتے تو جہنم میں جھونکے جاتے اور نہ معلوم خاتمہ کس حال پر ہوتا۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہو اور وہ پھر بھی حج نہ کرے تو خدا کو پروا نہیں چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ تو اگر تم حج نہ کرتے ان بلاؤں میں گرفتار ہوتے

پھر کسی پر کیا احسان کیا جو دوسروں سے مبارکباد ملنے کے منتظر ہو یاد رکھو اس اشتہار اور افتخار سے سب کی کرائی محنت اکارت ہو جاتی ہے۔ یہ وہ معاصی تھے جو زمانہ حج سے پہلے ہوتے۔ اور زمانہ حج کے قبل سے مراد وہ وقت ہے جو احرام باندھنے سے پہلے ہو باقی حج کے زمانہ میں جو گناہ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ محضورات احرام کا ارتکاب کیا جائے یعنی جو باتیں حج میں ممنوع ہیں اُن کو کیا جائے۔ مثلاً حج میں مردوں کو سر ڈھکنا حرام ہے عورتوں کو چہرہ پر کپڑا ڈالنا ناجائز ہے احرام الرجل فی راسہ واحرام المرأۃ فی وجہھا مگر اس سے یہ استنباط نہیں ہو سکتا کہ پردہ عورتوں کو نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس سے تو اور پردہ کے تاکد پر استدلال ہوتا ہے کہ عورت کو ساری عمر چہرہ کا ڈھانکنا ضروری ہے، صرف حج میں اس کو منہ کھولنا چاہیئے۔ اگر یہ حج کی خصوصیت نہ ہوتی تو احرام المرأۃ فی وجہھا کے معنی کچھ نہیں ہوں گے اگر عورت کو ساری عمر چہرہ کا کھولنا جائز ہوتا تو اس کے کیا معنی کہ عورت کا احرام چہرہ میں ہے۔ اسی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے لئے چہرہ بہت قابل اہتمام ہے جیسا کہ مردوں کو سر ڈھانکنے کا اہتمام ہوتا ہے سو احرام میں ان دونوں کے خلاف حکم دیا گیا کہ مرد سر کھلا رکھیں اور عورتیں چہرہ کھلا رکھیں مگر مطلب اس کا یہ ہے کہ کپڑا چہرہ سے لگے نہیں یہ نہیں کہ اجنبی مردوں کو چہرہ دکھاتی پھریں، بس عورتیں اپنے چہرے پر اس طرح کپڑا لٹکائیں کہ چہرہ سے علیحدہ رہے۔ چنانچہ اس کے لئے ایک پنکھا ایجاد ہوا ہے جس سے چہرہ پر کپڑا نہیں لگتا۔ اس کے علاوہ اور بھی محظورات احرام بہت ہیں جن کو فقہائے مناسک میں بیان کیا ہے اور قافلہ میں جو لوگ اہلِ علم ہیں ان سے وقت پر سب باتیں معلوم ہو جائیں گی اُن سے پوچھتے رہنا چاہیئے۔ پس یہ گناہ حج کے ساتھ ہوتا ہے کہ احرام میں جو چیزیں ممنوع ہیں ان سے پرہیز نہ کیا جاوے۔

ایک معصیت حج کے بعد یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ ریا کرتے ہیں ریا سے اکثر طاعات کے انوار زائل ہو جاتے ہیں ثواب جاتا رہتا ہے۔ اس سے بہت احتیاط چاہیئے۔

اور مستورات تو خصوصاً بہت ریا کرتی ہیں کیونکہ ان کو ساری عمر میں ایک بار حج کے لئے گھر سے نکلنا ہوتا ہے اس کو وہ بہت ہی بڑا کارنامہ سمجھتی ہیں اور حج کے بعد اگر کوئی ان کو حجن نہ کہے اس پر خفا ہوتی ہیں۔ اور وہاں سے آکر سب کے سامنے گاتی ہیں کہ ہم نے سارے مقامات کی زیارت کی ہے اگر کسی غریب نے ایک جگہ کی زیارت نہ کی ہو تو اس سے کہتی ہیں کہ تیرا حج ہی کیا ہوا تو جبل نور پر تو گئی ہی نہیں حالانکہ اصل مقصود عرفات اور بیت اللہ ہے پھر بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم مگر ان کی زیارت تو ہر شخص کرتا ہے اس لئے ان کو کوئی فضیلت میں بیان نہیں کرتا ہاں جبل نور غار ثور اور امیر حمزہ کا مزار سب گناتی ہیں اور بعض لوگ صراحۃً اپنے حاجی ہونے کا اگر ذکر نہیں کرتے تو کسی نہ کسی پیرایہ میں مخاطب کو جتلا دیتے ہیں کہ ہم حاجی ہیں۔ ایک بزرگ کسی کے یہاں مہمان ہوئے تو میزبان نے خادم سے کہا کہ اس صراحی کا پانی لانا جو ہم دوسرے حج میں ساتھ لائے تھے۔ مہمان نے کہا حضرت آپ نے ایک بات میں دونوں حج کا ثواب کھو دیا اس بات میں اس نے جتلا دیا کہ میں نے دو مرتبہ حج کیا ہے۔ یہ ریا نہیں تو اور کیا ہے۔ ریا کے طریقے بہت دقیق ہیں اگر کوئی شخص اپنے نفس کی نگہداشت کرے تو اس کو نفس کے دقائق معلوم ہو سکتے ہیں لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں اکثر لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ حج کے بعد ہر مجلس میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں، حالانکہ مسلمان کا مذہب تو یہ ہونا چاہیئے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کا قصہ نہیں پڑھا ہے ہم سے حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے سوا اور کوئی بات مت پوچھو)

ان قصوں کے لئے اسی کو فرصت ملتی ہے جس کا دل محبت الٰہی سے خالی ہوتا ہے اور جو تذکرہ نمائش و ریا کے لئے ہو تو روکنے کی قابل ہے ہی محققین تو بعض اوقات ایسے تذکرہ کی بھی اجازت نہیں دیتے جو ظاہرا طاعت معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً وہاں کے فضائل و محاسن بیان کرنا جس سے وہاں جانے کی رغبت اور شوق ہو۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

نے لکھا ہے کہ ہر شخص کے سامنے حج کی باتیں کرنا جائز نہیں کیونکہ تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر حج فرض ہے سو ایسے شخص کے سامنے تو ترغیبی مضامین بیان کرنا جائز بلکہ مستحب ہے کہ دلالت علی الخیر ہے۔ دوسرے وہ جن پر نہ فرض اور نہ ممنوع ان کے روبرو بھی بیان کرنا جائز ہے۔ تیسرے وہ جن پر حج فرض نہیں ہے اور ان کو جانا جائز بھی نہیں اس وجہ سے کہ نہ مالی استطاعت ہے اور نہ مشقت پر صبر و تحمل ہو سکے گا ان کے سامنے تشویق اور ترغیب کے قصے اور مضامین بیان کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے ان کو حج کا شوق پیدا ہوگا اور سامان ہے نہیں نہ ظاہری نہ باطنی تو خوامخواہ وہ دقت اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے جس سے ناجائز امور کے ارتکاب کا بھی اندیشہ ہے اس لئے کہ ایسے لوگوں کے سامنے حج کی ترغیب اور تشویق کے مضامین بیان کرنا جائز نہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن پر لوگوں نے امام غزالی کی تکفیر پر فتوے دیئے۔ ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج کی ترغیب سے لوگوں کو منع کرتے ہیں مگر حاشا وکلا ان لوگوں نے امام کے قول کا مطلب ہی نہیں سمجھا وہ حج کی ترغیب سے منع نہیں کرتے بلکہ لوگوں کو ناجائز امور میں مبتلا کرنے سے منع کرتے ہیں کیونکہ نادار غیر صابر لوگوں کو ترغیب دینے کا یہی انجام ہوگا۔

ایک کوتاہی بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حج سے آکر وہاں کی تکالیف کا حال بیان کرتے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں چاہے وہ واقعی کلفتیں ہوں اور اگر واقعی کلفتوں میں اضافہ کر کے بیان کیا جائے تو یہ اس سے بھی بدتر ہے، وہاں کی کلفتیں بیان کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ حج سے رک جاتے ہیں اُس کا سارا وبال ان لوگوں پر رہتا ہے جنھوں نے ان کو بہت ڈرایا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہاں ایسی تکالیف نہیں ہیں جن کا یقینی اثر ہلاکت ہو بلکہ جیسی کلفتیں یہاں گاڑی اور بہلی کے سفر میں پیش آتی ہیں ویسی ہی وہاں اونٹوں کے سفر میں پیش آتی ہیں۔ اگر آدمی احتیاط سے کام لے اور قافلہ سے علیحدہ نہ ہو تو ذرا بھی اندیشہ نہیں۔ اور سریلوں کو کوئی خود ہی اپنی

بے احتیاطی سے ہلاک ہونا چاہے تو اس کا یہاں بھی کوئی انتظام نہیں ہو سکتا بلکہ سچ یہ ہے کہ اونٹوں کا سفر ایسا پر لطف ہوتا ہے کہ اس کے سامنے یہاں کے سفر کچھ بھی نہیں پھر اگر کچھ کلفت پیش بھی آئے گی تو اس میں ثواب کس قدر ہے۔ جب یہاں دنیا کے واسطے سفر کی تکالیف برداشت کی جاتی ہیں تو خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے لئے ذراسی کلفت پیش بھی آجائے تو کیا مضائقہ ہے اور اگر کوئی یہ دعوےٰ کرے کہ اس سفر میں ہلاکت کا خطرہ زیادہ ہے تو یہ بالکل غلط اور مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ ہزارہا آدمی حج کو جاتے ہیں اور یوں بیس پچیس ہزار میں اگر بیس پچیس مر بھی گئے تو اتنے تو یہاں بھی ہر سال مرتے ہیں مردم شماری دیکھ لی جائے کہ پچیس ہزار آدمیوں میں سے یہاں رہ کر کتنے مرتے ہیں اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ سفر حج میں جو لوگ مرتے ہیں ان کی تعداد معمول سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پھر خواہ مخواہ لوگوں کو وہاں کی تکالیف بیان کر کے ڈرانا اور مناع خیر بننا یصدون عن سبیل اللہ میں داخل ہے یا نہیں البتہ اگر یہ کوئی عاقل حکیم شخص وہاں کی تکالیف کا تذکرہ حکمت سے کرے اس کو اس کی اجازت ہے کیونکہ اس کے بیان سے لوگ حج سے نہیں رکیں گے۔ اس کا بیان کرنا

لہ احقر جامع وعظ عرض کرتا ہے کہ اس سال افسوس ہے کہ ہندوستان میں خلافت کمیٹی کے ممبروں نے قربانی کی طرح حج سے بھی بہت لوگوں کو روکا گویا یہ لوگ حج کے بند کرنے کی کوشش کرنے میں یہ لوگ بالکل یصدون عن سبیل اللہ کے مصداق ہیں۔ حالانکہ حج ایک بہت بڑا شعار اسلامی ہے۔ اس مبارک بقعہ میں ہر سال حاجیوں کا جانا فرض کفایہ ہے۔ کسی سال میں اگر حج بالکل نہ ہو تو تمام عالم کے مسلمان گنہگار ہوں گے۔ اتنے بڑے شعار اسلامی سے روکنا اور اس کے بند کرنے میں سعی کرنا یہ کونسی حمایت اسلام ہے جس شخص پر حج فرض ہوا اور وہ بلا حج کئے مر جائے اس پر سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ تو جن لوگوں کو خلافت کمیٹی کے ممبروں نے حج سے روکا ہے اگر ان کا خاتمہ برا ہوا تو سارا وبال ان روکنے والوں کی گردن پر ہوگا اور ایک فریضۂ اسلام اور شعار الٰہی سے روکنے کی وجہ سے خود ان لوگوں پر بھی سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے اس سے توبہ کریں ۱۲ ظفر احمد

اس غرض سے ہوگا کہ ان تکالیف کا اس طرح انتظام کرنا چاہیئے باقی غیر حکیم کے بیان سے لوگ رک جائیں گے۔ ہم نے دیکھا ہے ایسے بے وقوفوں کی وجہ سے بعض لوگ ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ گویا ان کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ تم یقیناً مر ہی جاؤ گے افسوس۔ یاد رکھئے کہ حج کے مقبول ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ دوبارہ پھر وہاں جانے کا شوق دل میں پیدا ہو اور جو وہاں سے آکر پھر دوبارہ جانے سے توبہ کرلے اندیشہ ہے کہ اس کا حج مقبول نہ ہوا ہو۔ اس لئے جہاں تک ہوسکے اس کی کوشش کرے کہ دل میں پھر دوبارہ حج کا شوق پیدا ہو۔ اس کی یہی تدبیر ہے کہ وہاں کے ثواب اور منافع اخروی پر نظر کرے اور یہ سمجھ لے کہ جنت میں جو درجات حج کی وجہ سے نصیب ہوں گے ان کے سامنے یہ تکالیف کیا ہیں ان جیسی ہزار بھی کلفتیں ہوں تو کچھ نہیں اور حج میں علاوہ ثواب آخرت کے دنیا کا بھی تو نفع ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ حج کے بعد ضرور رزق میں فراخی ہو جاتی ہے پھر وسعت اور فراخی رزق کیلئے لوگ کیسی کیسی مشقتیں برداشت کرتے ہیں اگر ذرا سی وہاں بھی تکلیف پیش آگئی تو اس کی وجہ سے پریشان ہونا اور دوسروں کو پریشان کرنا اور حج کی دولت سے محروم کرنا یہ کونسی عقل کی بات ہے۔ نیز حج سے اخلاق کی تہذیب پر خاص اثر پڑتا ہے۔ اور اگر کوئی حاجی اس کے خلاف پایا جاوے تو وہ ایک عارض کے سبب سے ہے۔ وہ یہ کہ علماء محققین نے لکھا ہے کہ حجر اسود میں کسوٹی کی خاصیت ہے یعنی اس میں یہ خاصیت ہے کہ اس کے استلام کے بعد جیسا شخص ہوتا ہے وہ اپنی اصل خلقت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ حج سے پہلے معلوم نہیں ہوتے کہ یہ اندر سے کیسے ہیں، مگر حج کے بعد چھپا رہنا مشکل ہے، اصل حالت ضرور کھل جاتی ہے۔ پس جس کی حالت حج کے بعد پہلے سے اچھی ہو جائے سمجھنا چاہیئے کہ اس کا حج قبول ہوا۔ اور جس کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے اس کے حج قبول نہ ہونے کا اندیشہ ہے۔

شاید اس سے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ پھر حج نہ کرنا چاہیئے تاکہ قلعی نہ کھلے

اس کا جواب یہ ہے کہ حج نہ کرنے میں اس سے زیادہ اندیشہ ہے جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہو اور وہ پھر بھی حج نہ کرے تو خدا تعالیٰ کو پرواہ نہیں ہے خواہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر پس اگر حج نہ کیا تب تو سوء خاتمہ کا اندیشہ زیادہ ہے اور حج کرنے میں تو صرف یہی اندیشہ ہے کہ قلعی کھل جائے گی وہ بھی اس وقت جبکہ اس کے آداب وشرائط کا لحاظ نہ کیا جائے ورنہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ شوق اور محبت کے ساتھ جو حج ادا کیا جاتا ہے اس سے دینداری میں ترقی ہی ہو جاتی ہے۔ پس یہ اشکال فضول ہے حج ضرور کرنا چاہیئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے آداب وشرائط کا پورا لحاظ کرنا چاہیئے۔ اور جو شخص حج میں احتیاط نہیں کرتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے بیمار بد پرہیزی کرتا ہے۔ اور جو احتیاط کے ساتھ حج کرتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی بیمار کو تنقیہ وازالہ کی ضرورت ہے اور وہ پوری تدبیر پر عمل کرتا ہے اور پورا پرہیز کرتا ہے۔ اور اسی سے سب مواد رذیلہ کا تنقیہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حج کے بعد پھر علاج کی اور تدبیر کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ جس طرح مسہل کے بعد ہی تو آئندہ مواد خبیثہ کی پیدا وار نہ ہونے دینے کی اور جو تھوڑا بہت پیدا ہو جاوے اس کے تنقیہ کی ضرورت رہتی ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ حج کے بعد بھی ہمیشہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ مگر حج میں احتیاط ہونا اسی وقت ممکن ہے جب حج سے پہلے نفس کی اصلاح کر لی جائے ورنہ بالخصوص جھگڑے اور فساد کی تو ضروری نوبت آجائے گی۔ نیز نماز وغیرہ میں بھی ممکن ہے کہ سفر کی وجہ سے سستی ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سفر کی تکالیف کی وجہ سے شوق اور محبت میں کمی ہو جائے، اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ حج سے پہلے اصلاح نفس کا اہتمام کیا جائے۔ مگر یہ سمجھ لو کہ نفس کی اصلاح خود اپنے آپ نہیں ہو سکتی اپنی عقل اور فہم اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی کسی مربی کامل سے اس کا طریقہ پوچھو۔

کشتن این کار عقل و ہوش نیست
شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

(نفس کو مغلوب کرنا عقل و ہوش کا کام نہیں کوئی خرگوش کسی تیز کا شکار کب کر سکتا ہے) کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے. اس میں ضرورت ہے عنایت حق و عنایات خاصان حق کی

بے عنایات حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(بے عنایت حق اور خاصان حق اگر فرشتہ بھی ہو جاؤ تو نامۂ اعمال سیاہ ہی رہے گا) طریق اصلاح میں اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی اپنے آپ کو خاصان حق کے سپرد کر دو اور ان کا اتباع اختیار کرو ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(فہم و عقل تیز کرنے سے یہ راستہ طے نہیں ہوتا حق تعالیٰ کا فضل تو عاجزی و شکستگی اور مسکنت کا خریدار ہے)

اس میں اپنے ارادہ اور اختیار کے فنا کرنے کی ضرورت ہے پستی و شکستگی کی حاجت ہے۔ ؎

ہر کجا پستی است آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہاں ہی پہنچتا ہے جہاں مشکل ہوتی ہے وہاں ہی جواب پہنچتا ہے)

ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں درد ہوتا ہے دوا وہاں ہی پہنچتی ہے. جہاں مرض ہوتا ہے وہاں ہی شفا پہنچتی ہے)

طلب اور درد اور شکستگی حاصل کرنا چاہیے۔ اب تو یہ حال ہے کہ جو بزرگ سمجھے جاتے ہیں شکستگی ان میں بھی نہیں۔

ایک صاحب کی حکایت یاد آئی جو ظاہر میں. بزرگ اور نیک سب کچھ تھے۔ ایک بار

وہ یہاں جمعہ کے روز آئے وعظ میں شریک ہوئے مکان ان کا اتنی نزدیک تھا کہ بعد وعظ کے جاتے تو شام تک پہنچ جاتے، چنانچہ اکثر لوگ وعظ سنکر چلے بھی جاتے تھے ان کے ایک عزیز نے اس احتمال سے ان سے پوچھ لیا کہ اگر شام کو یہاں قیام ہو تو میں کھانے کا انتظام کروں بس بزرگ صاحب کہاں تھے خفا ہوگئے یہ بھی کوئی تہذیب ہے کہ آپ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کھانے کا انتظام کیا جاوے یا نہیں۔ تم کو کھانا تیار کرنا چاہیئے تھا، پھر چاہے ہم ٹھہریں یا نہ ٹھہریں۔ خدا کی پناہ اس تکبر کی بھی کوئی انتہا ہے کہ آپ سے بلا پوچھے ہی کھانا تیار کیا جاوے پھر اگر بعد میں آپ لے کہدیا کہ ہم جاتے ہیں تو اس غریب کا سارا پکا پکایا کھانا برباد جائے غرض یہ سب طرارے یہیں چھوڑ دو۔ حج میں تو سب اپنے کمالات کو گم کر دینا چاہیئے۔

عورتوں پر اور بھی تعجب ہے یہ مردوں سے بھی زیادہ حج کا ارادہ کر کے اپنے کو بڑا سمجھنے لگتی ہیں بلکہ آجکل عموماً ویسے بھی عورتوں میں بڑائی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تو یہ مردوں سے خوشامد کراتی ہیں ان کو شرم اور غیرت بھی نہیں آتی کہ مرد رات دن جان کھپا کر ان کے واسطے کما کر لاتے ہیں کیا مردوں کی عنایت کا یہی نتیجہ ہے کہ یہ مردوں کے سر چڑھیں میں سچ کہتا ہوں کہ اگر عورتیں ذرا صبر و تحمل سے کام کیا کریں تو ان کو مردوں سے زیادہ ثواب ملے کیونکہ یہ ضعیف اور کمزور ہیں ضعفار کا تھوڑا سا عمل بھی قوی آدمی کے بہت سے اعمال سے بعض دفعہ بڑھ جاتا ہے مگر عورتوں میں جس قدر ضعف ہے یہ اسی قدر مردوں پہ شیر ہوتی ہیں اور یہ مردوں کا تحمل ہے کہ ان کو سر چڑھا لاتے ہیں ورنہ ان کے سامنے عورتوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ اگر مرد کو غصہ آجائے تو ایک دن میں ان کو درست کر سکتا ہے۔ چنانچہ سخت مزاج لوگ ایسا بھی کر لیتے ہیں۔ بزرگوں نے نقل کیا ہے یغلبن العاقل و یغلبھن الجاھل کہ عاقل مرد پہ تو عورتیں غالب ہو جاتی ہیں مگر جاہل مرد ان پر غالب ہوتا ہے۔ اس کا راز یہی ہے کہ عاقل تحمل سے کام لیتا ہے اور جاہل تحمل نہیں کرتا۔ اس لئے جاہلوں سے یہ خوب درست ہو جاتی ہیں۔

بہرحال عورتوں کو تکبر کرنا بہت نازیبا ہے، ان کو حج میں طرارے سے کام لینا نہ چاہیئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قبل حج ہی اپنے ملکات رذیلہ کو نکالو۔ اور

نفس کی اصلاح کرو۔

اب یہ سوال باقی رہا کہ اب تو حج کو جا رہے ہیں اب قبل حج یہ سہل کیسے ہو تو میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ قبل حج کامل بن جائے کیونکہ کمال ایک دن یا ایک ہفتہ میں حاصل ہونا عادۃً دشوار ہے۔

صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامے
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی پاک و صاف نہیں ہوتا ہے جب تک محبت کا جام نہ پئے گا بہت مجاہدات کے بعد خامی پختگی سے تبدیل ہوئی۔)

میرا مقصود یہ ہے کہ اس وقت سے اس کی فکر میں تو لگ جایئے وہ بھی اثر میں مثل اصلاح ہی کے ہے۔ جیسا قرآن مجید میں یہ حکم نازل ہوا۔ اتقوا اللہ حق تقاتہ کہ خدا تعالٰے سے ایسا ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تو صحابہ کرام گھبرا گئے اور گھبرا کیوں گئے۔ میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ وہ اس واسطے گھبرا گئے کہ صیغۂ امر اصل میں موضوع ہے وجوب کے لئے اور اگرچہ مطلق امر کے واسطے فور ضروری نہیں مگر فور متبادر ضرور ہے۔ ہاں اگر وہ فعل یقینی طور پر تدریجی ہو تو وہاں فور متبادر نہیں ہوتا ورنہ عموماً امر سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ یہ کام ابھی فوراً کیا جائے۔ پس فاتقوا اللہ حق تقاتہ سے صحابہ یہ سمجھے کہ ہم کو اسی وقت کامل تقوٰے اختیار کرنا چاہیئے۔ اس لئے گھبرا گئے تو پھر یہ حکم نازل ہوا۔

فاتقوا اللہ ما استطعتم کہ جتنا مرتبہ تقوٰی کا اس وقت ہو سکے اُتنا اس وقت اختیار کر لو۔ اس میں کوتاہی نہ کرو۔ پھر بتدریج دوسرے مراتب میں بقدر استطاعت ترقی کرتے رہو۔

پس یہ آیت پہلے حکم کے لئے محققین کے نزدیک ناسخ نہیں بلکہ اس کا بیان ہے یعنی مطلوب تو وہی ہے کہ کامل تقوٰی اختیار کرو مگر اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول اول جتنا ہو سکے اس کو پورا کرو۔ اس میں کوتاہی نہ کرو (سر باقی ان شاء اللہ آئندہ)

پھر آہستہ آہستہ ترقی ہوتی جائے گی۔ اور ایک دن ایسا بھی ہوگا کہ تم کامل متقی بن جاؤ گے۔ اور بتدریج اعمال تقوٰی کے اعتبار سے نہیں وہ تو ایک دم سے واجب العمل ہیں بلکہ ضعف و قوت مراتب کے اعتبار سے ہے۔

اب اُس اشکال کا جواب ہو گیا یعنی اسی وقت سے اُن ملکات رذیلہ کے ازالہ کی فکر شروع کر دو بے فکری میں مت رہو۔ اس وقت اگر آپ کے قبضہ میں یہ بات نہیں ہے کہ ملکات رذیلہ کو بالکل زائل کر دیں تو یہ بات تو اختیار میں ہے کہ اس کے مقتضا پر عمل نہ کرو۔ جب بار بار نفس کے تقاضوں کے خلاف عمل کیا جائے گا تو اس کی عادت پڑ جائے گی اور ضبط کی عادت سے ملکات رذیلہ کی قوت مضمحل ہو جائے گی اور اضمحلال سے پھر ان میں اتنی کمزوری ہو جائے گی کہ گویا وہ ملکات ہیں ہی نہیں اس طرح سے آپ ان شاء اللہ تعالےٰ کامل ہو جائیں گے اور اخلاق رذیلہ کی بجائے آپ میں ملکات فاضلہ پیدا ہو جائیں گے۔ لہذا آج کے سفر میں فکر اور سعی ضرور شروع کر دیجئے۔ جب آپ نے اس نیت سے فکر شروع کر دی تو آپ بھی ان ہی لوگوں میں شمار ہوں گے جو کامل متقی ہیں۔ کیونکہ اہل کمال بھی اسی طرح اہلِ کمال بنے ہیں ایک دن میں کوئی کامل نہیں ہو گیا۔

دوسرے یہ کہ کمال کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ اور نہ انسان اس کا مکلف ہے انسان کا کام طلب اور فکر اور سعی ہے اگر طلب کے ساتھ ساری عمر بھی ناقص رہے تو وہ ان شاء اللہ کاملین ہی کے برابر ہوگا۔ بلکہ ممکن ہے کہ بعض باتوں میں کاملین سے بھی بڑھ جائے یعنی مشقت کے ثواب میں، کیونکہ کاملین کو نفس کی مخالفت گراں نہیں ہوتی اور مبتدی کو زیادہ مشقت پیش آتی ہے تو مشقت کا ثواب اس کو زیادہ ہوتا ہے دلیل اس کی یہ حدیث ہے والذی یتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم

فرماتے ہیں کہ جو شخص ماہر قرآن ہے وہ کراما کاتبین کے ساتھ ہوگا اور جو شخص اٹک اٹک کر قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس پر شاق ہوتا ہے اس کے لئے دہرا ثواب ہے پس اس مشقت کے ثواب میں ناقص کامل سے بھی بڑھ جاتا ہے اگرچہ دوسرے فضائل میں کامل بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کیسا حال گذرا۔ فرمایا مغفرت ہوگئی درجات ملے مگر ہمارا ایک پڑوسی تھا جو ہم سے کم عمل کرتا وہ ہم سے بڑھا ہوا رہا کیونکہ وہ صاحب عیال تھا، بال بچوں کی پرورش میں اس کو زیادہ اعمال کا موقعہ نہ ملتا تھا مگر وہ ہمیشہ اسی دھن میں رہتا تھا کہ اگر مجھے فراغت نصیب ہو تو خدا کی یاد میں مشغول رہوں۔ وہ اپنی مشقت اور نیت کی وجہ سے ہم سے بڑھ گیا۔ بس اس طریق میں فکر اور ذہن بڑی چیز ہے۔ اسی سے سب کام بن جاتے ہیں ۔

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دم آخر دمے فارغ مباش

(اس راہ میں تراش اور خراش یعنی اصلاح کی فکر میں لگے رہو آخری سانس تک اپنی اصلاح سے فارغ نہ ہو)

میرے ایک دوست نے ایک منظوم خط لکھا جس میں اس کی شکایت تھی کہ میں کام شروع کرتا ہوں پھر چھوٹ جاتا ہے۔ پھر از سر نو جوڑتا ہوں پھر نظام ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ غرض ایک طویل نظم میں اپنی پریشانی لکھی تھی اور وہ نظم مثنوی کی بحر میں تھی میرا جی چاہا کہ ان کو نظم ہی میں اور اسی وزن میں جواب دوں۔ اس وقت یہ شعر ذہن میں آیا ۔

دوست دارد دوست ایں آشفتگی
کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

(حق تعالیٰ اصلاح کے لئے فکر اور عاجزی اور تمہاری پریشان حالی کو

محبوب رکھتے ہیں اس لئے جس طرح بھی ہو سکے کوشش کئے جاؤ ناکام کوشش بھی بالکل سو رہنے سے بہتر ہے۔)

اور یہی حاصل ہے ان اشعار کا ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دم آخر دمے فارغ مباش

(ترجمہ ہو چکا اوپر دیکھئے)

تا دم آخر دمے آخر بود
کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(کوشش میں لگے رہو ایک دن ضرور ایسا وقت مرنے سے پہلے آوے گا کہ کامیاب ہو جاؤ گے حق تعالیٰ کی نظر عنایت سے)

بس فکر اور دھن میں لگا رہنا چاہیئے ان شاء اللہ تعالیٰ پھر آپ کا حج مردانہ ہو جائے گا جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

حج زیارت کردن خانہ بود
حج رب البیت مردانہ بود

(حج نام ہے خانہ کعبہ کی زیارت کا مگر صاحب خانہ کی زیارت عباد خواص کو عطا ہوتی ہے۔)

اور یہ حج رب البیت ہر شخص پر فرض ہے گو حج البیت بھی اس شخص پر فرض نہ ہو کیونکہ حج رب البیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف چلنا اس کی طلب اور دھن میں لگنا سو اس کے لئے کعبہ اور مکہ مکرمہ بھی شرط نہیں اسی کو عارف مسعود بک فرماتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(اے قوم جو نفلی حج کے لئے کعبہ شریف گئے ہو تم کسی اللہ والے سے اپنے نفس کی اصلاح جو فرض عین ہے کرو تو یہاں ہی واصل باللہ ہو جاؤ۔)

مگر قوم حج رفتہ سے مراد سب حجاج نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن پر حج فرض نہیں اور ابھی تک انھوں نے نفس کی اصلاح بھی نہیں کی اور حج کو جانے سے ان کو بعض دینی مضرتیں پہونچنا بھی محتمل ہے ان کو خطاب فرماتے ہیں کہ تم پر حج تو فرض ہے نہیں اور نفس کی اصلاح فرض ہے تم حج کرنے کہاں چلے تم کو پہلے شیخ کی صحبت میں رہنا چاہیئے تمہارا مطلوب یہاں ہے اور جن پر حج فرض ہے ان کو یہ خطاب نہیں ہو سکتا کہ تم حج کرنے مت جاؤ شیخ کے پاس رہو۔ کیونکہ جس پر حج فرض ہے اس کو خدا کا حکم ہے کہ پہلے حج سے فارغ ہو اس کے لئے بدون حج کے مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا وہ ترک حج کے گناہ کی وجہ سے کمال سے رہ جائے گا کمال یہی ہے کہ جس وقت جو حکم ہو اس کو پورا کیا جائے تو جس پر حج فرض ہے اس کو حج ضرور کرنا چاہیئے پھر کسی شیخ کی صحبت میں وہاں سے آکر رہے لیکن حج کے ساتھ جن احکام کا شریعت نے حکم کیا ہے ان کو بجا لانا بھی ہر حاجی کے ذمہ فرض ہے پس اگر وہ حج سے پہلے کامل نہیں بن سکتے تو کم از کم فکر اور سعی تو ابھی سے شروع کر دیں اس طریقے سے امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اجر میں کاملین کی برابر ہو جاویں گے۔ لیجئے اب تو بہت سہل نسخہ معلوم ہو گیا۔ اب یہی اگر کوئی اپنے حج کو کامل نہ کرے تو وہ جانے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم کی توفیق دے۔ اے اللہ سب حجاج کو حج مردانہ نصیب فرمائے اور سب کی کوشش مقبول ہو اور ان کے لئے جزائے اس حج کو آئندہ اصلاح اور کمال کا ذریعہ بنا دیجئے۔ آمین۔

وصلے اللہ تعالےٰ علیٰ خیر خلقہ محمد سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ○ وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

العبرة بذبح البقرہ

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم اے جناح روڈ

بسم الله الرحمن الرحيم

وعظ مسمّٰی بہ

العبرة بذبح البقرة

ایـن	کہاں ہوا	مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون
متـے	کب ہوا	۱۵ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ بعد نماز جمعہ
کـم	کتنی دیر ہوا	۱ بجے شروع ہو کر ۳ بجے ختم ہوا کل ۲ گھنٹہ ہوا
کیف	کس طرح ہوا	منبر پر بیٹھ کر
لـم	کیوں ہوا	احباب کی درخواست پر کیونکہ عرصے سے خانقاہ میں بیان نہیں ہوا تھا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	مجاہدۂ نفس کی ضرورت اور اس کی حقیقت اور اس کا طریقہ اور آیت ذبح بقرہ سے علم اعتبار کے طور پر اس کا استنباط اور قربانی کے متعلق کچھ بیان
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	سالکین واہل علم کو
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ بمنہ وکرمہ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۵۰ تقریباً
الاشتات	متفرقات	اہل علم بہت محظوظ ہوئے بوجہ جدت و دقت مضامین قابل دید تھے مجاہدہ کی حقیقت منکشف ہو کر طریق آسان نظر آنے لگا۔ متعنا اللہ الفیوضہ و برکاتہ دائماً ابداً

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی

لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ؕ
قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا
مَا تُؤْمَرُوْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ
اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ
لَّنَا مَا هِیَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ؕ وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ○ قَالَ اِنَّهٗ
یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِی الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ
فِیْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ○ وَ اِذْ قَتَلْتُمْ
نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ
بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰی ۙ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ
مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ
وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

(ترجمہ) اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو وہ لوگ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے کیا اوصاف ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو پٹھا ہو دونوں عمروں کے درمیان سو اب کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے۔ کہنے لگے درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ بیان کر دیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں کیونکہ ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے اور ہم ان شاء اللہ ضرور ٹھیک سمجھ جاویں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ ہل چلا ہوا ہو

جس سے زمین جوتی جاتی ہے اور نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کیجا وے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے کہ اب آپ نے پوری بات فرمائی اور پھر اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم ہوتے نہ تھے اور جب تم لوگوں نے ایک آدمی کا خون کر دیا پھر ایک دوسرے پر اس کو ڈالنے لگے اور اللہ تعالےٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو اس طرح حق تعالےٰ مردوں کو زندہ کر دیں گے اور اللہ تعالےٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس موقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو ایسے واقعات کے بعد پھر بھی تمہارے دل سخت ہی رہے تو ان کی مثال پتھر کی سی ہے یا سختی میں ان سے زیادہ اور بعضے پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو شق ہو جاتے ہیں پھر ان سے پانی نکل آتا ہے اور ان ہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو خدا کے خوف سے اوپر سے نیچے کو لڑھک آتے ہیں اور حق تعالےٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں -)

یہ چند آیات ہیں سورہ بقر کی جن سے مجھے ایک ضروری مضمون بیان کرنا ہے بعض احباب نے اس عرصہ میں درخواست کی تھی کہ کچھ بیان کر دیا جائے کسی خاص مضمون کی تو فرمائش نہ تھی بلکہ عام درخواست تھی جس کا منشاء صرف یہ تھا کہ بہت دنوں سے یہاں بیان نہیں ہوا. میں نے اس وقت پختہ وعدہ نہیں کیا بلکہ یہ کہہ دیا تھا کہ کوئی مضمون ذہن میں آگیا تو کچھ عرض کر دوں گا کیونکہ عادت یہی تھی کہ میں تکلف کر کے بیان نہیں کرتا بلکہ از خود اگر کوئی مضمون ذہن میں آجاتا ہے بیان کر دیتا ہوں اور جی بھی یہی چاہتا ہے کہ تکلف کر کے بیان نہ کیا جائے کیونکہ اس سے اثر بھی نہیں ہوتا اور تعب بھی بہت ہوتا ہے اس کے بعد میرا خود بھی جی چاہا کہ کوئی مضمون آجائے تو اچھا ہے کیونکہ درخواست خلوص پر مبنی تھی اس کے پورا ہونے کو میرا خود دل چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک مضمون ذہن میں آگیا جو بہت کام کا مضمون ہے اور عام ضرورت کا ہے۔ پھر جی چاہا کہ کوئی مضمون اس وقت کے مناسب بھی بیان ہو جائے تو اچھا ہو کیونکہ عام

ضرورت سے خاص وقت موجود کی ضرورت اشد ہوتی ہے) چنانچہ بحمد اللہ یہ خیال بھی پورا ہوگیا اور اس کے لئے مجھے دوسرے مضمون کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ پڑی بلکہ پہلے ہی مضمون کی تقریر اس طرح ذہن میں آئی جس میں ضرورت وقت سے میری مراد خصوص یہ وقت حاضر نہیں بلکہ ایک وقت محدود مراد ہے جو کہ ممتد ہے جس میں عید الاضحیٰ اور قربانی کے ایام بھی داخل ہے اور ضرورت وقت سے مراد یہی قربانی کی ضرورت ہے جو عنقریب آنے والی ہے تو یہ مضمون جو اس وقت بیان ہوگا اس میں تین پہلو ہیں ۔

(۱) یہ کہ وہ مضمون ضروری ہے اور عام ضرورت کا ہے ۔

(۲) پہلو یہ ہے کہ وہ مضمون قربانی کے مناسب ہے ۔

(۳) پہلو یہ ہے کہ جو قصہ ان آیات میں مذکور ہے اس کو مضمون عام سے تعلق ہے اور اس کے واسطہ سے قربانی سے بھی تعلق ہے کیونکہ جس چیز سے ایک چیز کو تعلق ہوا کرتا ہے اس کے متعلق کو بھی اس سے تعلق ہوا کرتا ہے پس مضمون عام کو قربانی سے تعلق ہے اور قصہ مذکورہ فی الآیات کو مضمون عام سے تعلق ہے تو قربانی کو بھی اس قصہ سے تعلق ہوگا ۔

اب میں پہلے اس مضمون عام کو بتلانا چاہتا ہوں جو عام ضرورت کا ہے تاکہ تعین مقصود کے بعد انطباق سہل ہوجائے سو وہ مضمون مقصود یہ ہے کہ نفس کشی کی ضرورت ہے یعنی مجاہدہ نفس کی اس کی عام ضرورت ظاہر ہے کیونکہ نفس سب کے ہے ایسا کون ہے جس کے نفس نہیں اور مجاہدہ واصلاح نفس کی بھی سب کو ضرورت ہے ایسا کون ہے جو اصلاح نفس سے مستغنی ہو اور سامعین سے میں اتنی درخواست کرتا ہوں کہ وہ نفس کشی کا لفظ سن کر اس کی تفسیر اپنے ذہن سے کچھ نہ گھڑیں اور نہ اس کی ضرورت ہے بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے ہم کو اپنی رائے کو اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس کی تحقیق عنقریب اپنے موقعہ پر

اسی وقت[له] ہوجائے گی اور یہ میں نے اس لئے کہدیا کہ بعض لوگ نفس کشی اور مجاہدہ کے لفظ سے یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ بس نفس کو خوب بھوکا مارے نہ کھانے کو دے نہ پینے کو نہ اچھا کپڑا پہنے نہ کسی سے ملے جلے نہ کسی سے بات کرے بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دے اور حقوق نفس کو بالکلیہ ترک کر دے نہ لیٹے نہ سو دے رات بھر جاگتا رہا کرے۔ حالانکہ نفس کشی کی یہ تفسیر بالکل غلط ہے اور منشا اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگ اس فن کو حاصل نہیں کرتے (یعنی فن تصوف کو جس میں مجاہدہ و اصلاح نفس سے بحث کی جاتی ہے ۱۲) اور نہ اس کی تحصیل کو ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی ایک فن ہے جیسے فقہ و حدیث ایک فن ہے۔ جس طرح فقہ وغیرہ میں خاص اصطلاحات ہوتی ہیں جن کو تحصیل فن ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے اسی طرح تصوف کی بھی اصطلاحات ہیں جو فقہ وغیرہ کی اصطلاحات سے جدا ہیں۔ ان کی حقیقت بدون تحصیل فن کے واضح نہیں ہوسکتی اور تصوف کی جدا اصطلاحات ہونے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ شریعت سے بھی جدا ہیں۔ نہیں بلکہ فنون مدونہ کی اصطلاحات سے جدا ہونا مراد ہے۔ اور اگر وہ اصطلاحات شریعت سے بھی جدا ہوتیں جب بھی مضائقہ نہ تھا لِاَنَّهٗ لَا مُشَاحَّةَ فِي الْاِصْطِلَاحِ (اصطلاحات مقرر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے) آخر نحو و صرف وغیرہ کی بہت سی اصطلاحات ہیں جن کو شریعت سے کوئی تعلق نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ تصوف کی اصطلاحات دو قسم پر ہیں ایک وہ جو مقاصد کے متعلق ہیں وہ تو شریعت سے الگ نہیں ہیں بلکہ مقاصد میں اصطلاحات تصوف کی حقیقت وہی ہے جو شریعت میں مذکور ہے اور دوسرے وہ اصطلاحات ہیں جو امور زوائد کے متعلق ہیں وہ شریعت سے جدا ہوسکتی ہیں جیسے تجدد امثال توحید وجودی۔ شغل رابطہ وغیرہ مگر مجاہدہ نفس کشی امور زوائد میں سے نہیں ہے بلکہ مقاصد میں سے ہے کیونکہ یہ ماموربہ فی الشرع (شرع میں ان کا حکم کیا گیا ہے) ہے نصوص میں جابجا مجاہدہ کا ذکر ہے۔ کہیں بصورت خبر کہیں بصیغۂ امر

له چنانچہ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا کے بعد مذکور ہے ۱۲ منہ

چنانچہ ارشاد ہے وَمَن جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ (جو شخص مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے مجاہدہ کرتا ہے) وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ (جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب و ثواب یعنی جنت کے راستے دکھادیں گے اور اللہ تعالےٰ کی راہ میں پوری مشقتیں برداشت کرو) وغیرہ وغیرہ پس اس کی تفسیر وہی ہونی چاہیئے جو شریعت نے بتلائی ہے کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ مقاصد میں تصوف کی اصطلاحات شریعت کی اصطلاحات سے جدا نہیں ہیں۔ پس اب اس غلطی کا منشا جہل کے سوا کچھ نہیں لوگوں نے کتابوں میں خاص خاص لوگوں کے مجاہدات کا ذکر دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ بس یہی اس کی حقیقت ہے حالانکہ حقیقت شے اور چیز ہے اور اس کا طریق تحصیل دوسری شے ہے۔ حقیقت ایک ہوا کرتی ہے اور طریق تحصیل مختلف بھی ہو سکتے ہیں (مثلاً بیماری میں پرہیز کرنا مضرات سے ضروری ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ پرہیز کی حقیقت وہی ہے جو فلاں طبیب نے فلاں مریض کو بتلائی تھی کہ ۶ ماہ تک پانی نہ پئے کسی سے میل جول اختلاط نہ کرے اور سوائے دو چپاتیوں کے کچھ نہ کھائے سخت غلطی ہے کیونکہ وہ طریقہ اسی مریض کے ساتھ مخصوص تھا سب کے لئے وہی طریقہ نہیں اور نہ پرہیز کی حقیقت اس طریقہ میں منحصر ہے خوب سمجھ لو ۱۲ جامع)

پس لوگوں نے ایک غلطی تو یہ کی کہ مجاہدہ کی تفسیر اپنی طرف سے گھڑ دی۔ دوسری غلطی یہ کی کہ اس تفسیر مخترع کو نصوص میں جاری کیا اور یہ سمجھے کہ الَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب و ثواب یعنی جنت کے راستے دکھادیں گے) وغیرہ میں یہی مجاہدہ مراد ہے جو ہمارے ذہن میں ہے اور یہ معنی طاقت سے باہر تھے تو کہنے لگے کہ دین پر عمل مشکل ہے چنانچہ یہ بات عام طور پر لوگوں کی زبان پر ہے حالانکہ اس میں تکذیب ہے نصوص صریحہ کی حق تعالےٰ فرماتے ہیں لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا

اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے)
جس میں تصریح ہے کہ دین میں طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی گئی۔ حدیث شریف
میں ہے اَلدِّیْنُ یُسْرٌ کہ دین پر عمل کرنا آسان ہے اور فرماتے ہیں مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ
فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ط خدا نے تم پر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ مگر عوام اس
غلطی کی بنا پر ان نصوص کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دین
آسان ہے بس یوں خیال کرتے ہیں کہ یہ خاص لوگوں کے واسطے آسان ہوگا سب
کے واسطے آسان نہیں، حالانکہ نص میں نفساً عام ہے جس سے معلوم ہوا کہ کسی کو
بھی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی گئی جس میں عام و خاص کا کوئی تفرقہ نہیں۔
نیز مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (تم پر خدا تعالیٰ نے دین میں کچھ تنگی
نہیں کی) میں خطاب سب کو عام ہے۔ مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کیونکہ
وہ لوگ مجاہدہ والا اس کو سمجھتے ہیں جو بیوی بچوں کو چھوڑ دے اور نفس کے ضروری
حقوق کو بھی ادا نہ کرے۔ حالانکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا
مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے
بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے) اور دوسری جگہ
ارشاد ہے وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ
الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ط (اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب
کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ
انبیا علیہ السلام کے بیوی اور بچے بھی ہوتے تھے اور وہ کھاتے پیتے بھی تھے اور
بازار میں ضروریات کے لئے چلتے پھرتے بھی تھے اور ظاہر ہے کہ تمام ضروریات کی
جڑ اولاد و ازواج ہی ہیں ان کے لئے انسان کو سب سامان کرنا پڑتا ہے مگر بایں ہمہ
انبیا علیہم السلام ان سے الگ نہ تھے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ مجاہدہ میں
انبیاء سے زیادہ کامل کوئی نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوگیا کہ مجاہدہ کی یہ حقیقت
ہرگز نہیں کہ بیوی بچوں سے الگ ہوجائے۔

اور ایک بڑی خرابی اس غلطی سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس مجاہدہ مخترع میں اگر کوئی کامیاب ہو جائے تو پھر وہ اپنے کو دوسروں سے اکمل و افضل سمجھنے لگتا ہے اور جو لوگ اس طرح مجاہدہ نہیں کرتے ان کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ اول تو اس امتیاز کا منشا وہ غلطی ہے جو اس نے مجاہدہ کی حقیقت سمجھنے میں کی ہے۔ دوسروں کو اس غلطی میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ مجاہدہ کی حقیقت اس نے صحیح سمجھی پھر بھی اسے اپنے کو افضل و اکمل سمجھنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس کو جو امتیاز حاصل ہے اس کا منشا اس کا کوئی کمال ہے یا دوسروں کا نقص سو ظاہر ہے کہ مجاہدہ شرعاً مامور بہ ہے اور اس کے نزدیک مجاہدہ کی حقیقت وہی ہے جو اس نے اختیار کی تو اس صورت میں اس کا کمال کیا ہوا بلکہ جو کچھ اس نے کیا اپنے نزدیک مامور بہ کو ادا کیا اور مامور بہ کو ادا کر کے اپنے کو صاحب کمال سمجھنا سخت حماقت ہے کیونکہ یہ کوئی کمال نہیں یہ تو ایک ضروری فعل تھا جس کو اس نے ادا کیا باقی دوسروں سے امتیاز اس لئے ہو گیا کہ اور لوگ اس مامور بہ میں کوتاہی کر رہے ہیں تو اگر ہوا تو ان میں نقص ہوا اس میں کیا کمال ہوا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص پانچ وقت کی نماز پڑھ کر اپنے کو صاحب کمال سمجھے کیونکہ اتفاق سے یہ ایسی جماعت میں جا پھنسا ہے جو پانچ کی جگہ صرف دو ہی وقت کی نماز پڑھتے ہیں، حالانکہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا کوئی کمال نہیں یہ تو فی نفسہ ہر شخص پر ضروری ہے اگر اس سے کم کرے گا گنہگار ہوگا مگر امتیاز اس لئے ہو گیا کہ دوسرے لوگ اس واجب میں کوتاہی کر رہے ہیں اور صرف دو ہی وقت کی نماز پڑھتے ہیں، تو اس سے کہا جائے گا کہ تمہارے اس امتیاز کا منشا تمہارا کوئی کمال نہیں بلکہ دوسروں کا نقص اس کا سبب ہو گیا ہے اسی طرح اس مجاہدہ کرنے والے کو سمجھنا چاہئے کہ میری اس امتیاز کا منشا میرا کوئی کمال نہیں بلکہ دوسروں کا نقص اس کا سبب ہے تو اعتقاد کمال تو لغو ٹھیرا۔ رہا اوروں کے نقص کا اعتقاد تو وہ اس کے نزدیک

نقص ہے یہ کہاں سے لازم آگیا کہ واقع میں بھی نقص ہے اور جو امر واقع میں بھی نقص ہو ممکن ہے کہ کوئی دوسرا کمال اس کی تلافی کردے۔ ایک خرابی اس معنیٰ غلط کی یہ ہوئی کہ مجاہدہ کی یہ تفسیر سمجھنے کی وجہ سے ہر شخص اس کے لئے جلدی فارغ نہیں ہوتا بلکہ کوئی پنشن کے انتظار میں رہتا ہے، کوئی لڑکوں کی شادی سے فراغت کا منتظر ہے کہ بس ان کاموں سے فارغ ہوکر پھر دنیا سے الگ ہوجائیں گے۔

خلاصہ یہ کہ ان کے نزدیک گھر کو تالا لگادینا مجاہدہ ہے اسی لئے ایسے وقت کے منتظر رہتے ہیں جس میں گھر کو تالا لگاکر بیٹھنا آسان ہو۔ گویا یہ شخص مجاہدہ اس کو سمجھتا ہے کہ ایسا بن جائے جس کو حدیث میں خالی عن الخیر کہا گیا ہے۔ لَا خَيْرَ فِيْ مَنْ لَا يَأْلَفُ وَلَا يُؤْلَفُ یعنی اس شخص میں خیر نہیں جو نہ دوسروں سے مانوس ہو نہ دوسرے اس سے مانوس ہوں۔ سو حدیث سے معلوم ہوگیا کہ جس کو آجکل مجاہدہ والا سمجھا جاتا ہے۔ اس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم لاخیر فرماتے ہیں۔ کہ اس میں کچھ خیر نہیں تو وہ کمال کہاں ہوا بلکہ نقص ہوا۔ ہاں کسی معالجہ کی ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ مجاہدہ کے معنے اپنی طرف سے نہ گھڑے جائیں بلکہ انتظار کیا جائے اس کے معنے ابھی آتے ہیں اسی طرح نفس کشی کے لفظ سے اس کا ترجمہ کرکے اپنے ذہن میں کوئی حقیقت متعین نہ کریں کیونکہ نفس کشی یہ اصطلاحی لفظ ہے جو فارسی میں ترجمہ ہے مجاہدہ کا مولانا فرماتے ہیں ؎

نفس نتواں کشت الا ظل پیر
دامن آں نفس کش راسخت گیر

(نفس کو بدون پیر کے نہیں مارسکتا اس نفس کش کا دامن مضبوط پکڑلو)

اس شعر سے میرا مقصود حصول مجاہدہ کا طریقہ بتلانا نہیں ہے کیونکہ اس کو تو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس وقت صرف یہ بتلانا ہے کہ نفس کشی اصطلاحی لفظ ہے جو صوفیہ کے کلام میں مجاہدہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر شیخ کو

نفس کش کہا جاتا ہے کہ وہ مجاہدہ کا طریقہ بتلاتا ہے اور عنقریب میں اس کی حقیقت بتلا دوں گا اسی تفسیر سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ مجاہدہ کی ضرورت سب کو ہے اور ہر وقت ہے یعنی اس کی ضرورت عام بھی ہے اور دائمی بھی ہے اور یہاں سے یعنی ضرورت مجاہدہ کے دوام سے بعض سالکین کی غلطی معلوم ہو گئی جو اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ چند روزہ مجاہدہ حسب قاعدہ طے کر کے پھر اپنے کو فارغ سمجھ لیتے ہیں اور آئندہ کو مجاہدہ سے بے فکر ہو جاتے ہیں جس کی ابتدا انہماک فی المباحات (مباح چیزوں میں منہمک ہونا) سے ہوتی ہے کہ اول وہ مباحات میں زیادہ مشغول ہوتے ہیں پھر رفتہ رفتہ مکروہات میں انہماک ہونے لگتا ہے پھر محرمات کا ارتکاب بھی ہونے لگتا ہے اور چونکہ اس شخص کو ایک وقت تک حق تعالیٰ سے تعلق خاص رہ چکا ہے جو پہلے مجاہدہ کا اثر تھا تو اب اس کی یہ حالت زیادہ بُری ہوتی ہے اس میں نکس[1] کا اندیشہ ہے اور اس کی ایسی مثال ہو جاتی ہے جیسے کوئی عاشق مزاج شناس ہو کر محبوب کو ستانے لگے جو شخص مزاج شناس ہی نہیں ہوا اس کی حرکات اس درجہ موجب عتاب نہیں ہوتیں جیسے مزاج شناس کی حرکات موجب عتاب ہوتی ہیں پس عارف جب مکروہات و محرمات کا ارتکاب کرتا ہے اس پر غیر عارف سے زیادہ قہر و غضب ہوتا ہے اور یہی نکس (مردودیت) ہے اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہُ (اللہ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے) اس لئے سالکین کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ مجاہدہ کی ضرورت دائمی ہے۔ یہ چند روزہ کا کام نہیں بلکہ عمر بھر کا کام ہے۔ دیکھئے جس طرح بیماری میں دوا اور پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے بیماری سے صحت کے بعد بھی تو پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ صحت کے بعد زیادہ پرہیز کی ضرورت ہے کیونکہ بیماری میں تو معدہ خراب ہوتا ہے، منہ کا مزا بدلا ہوا ہوتا ہے اس لئے مریض کو انواع و اقسام غذا کی خواہش خود بھی بہت کم ہوتی ہے اور اگر اس نے بد پرہیزی کی بھی تو بہت جلد ضرر کا احساس ہو جاتا ہے اور صحت کے بعد

[1] مردودیت ۱۲

معدہ میں گویا قوت آجاتی ہے۔ بدپرہیزی سے معاً ضرر کا احساس نہیں ہوتا نیز اشتہار بھی ہر چیز کی ہوئی ہے تو اس وقت سنبھال کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ بعض دفعہ صحت کے بعد بھی پھر مرض کا عود ہو جاتا ہے۔ اور اطباء نے لکھا ہے کہ عودِ مرض ابتداءِ مرض سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اسی طرح عارفین نے فرمایا ہے کہ ابتدائی مجاہدہ کے بعد جب نفس اصلاح پذیر ہو جائے تو اس وقت مجاہدہ کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ابتداءِ مجاہدہ میں تو بدپرہیزی کے ضرر کا احساس جلد ہو جاتا ہے نیز اس وقت چونکہ قوائے نفسانیہ میں قوت ہوتی ہے اس لئے نفسانی خواہش کا تقاضا شدت کے ساتھ ہوتا ہے تو نفسانی خواہش پر تلبہ بھی جلد ہو جاتا ہے اور مجاہدہ سے فارغ ہونے کے بعد چونکہ تقاضائے نفس کمزور ہو جاتا ہے اس لئے ہوائے نفس کا احساس دیر میں ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے تو یہ حالت تھی کہ جہاں غیر محرم پر نظر پڑی فوراً احساس ہو گیا کہ اس نظر میں ہوائے نفس ملی ہوئی ہے اس لئے فوراً متنبہ ہو جاتا تھا اور مجاہدہ سے فارغ ہو کر جب غیر محرم پر نظر پڑتی ہے تو فوراً احساس نہیں ہوتا کہ اس میں ہوائے نفس ملی ہوئی ہے کیونکہ اس وقت تقاضائے نفس کمزور ہے۔ اب اس کو سوء نظر میں وہ ہیجان نہیں ہوتا جو پہلے ہوتا تھا اس لئے سالک اس غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس نظر میں ہوائے نفس نہیں ہے پھر وہ اس سے اجتناب کی کوشش بھی نہیں کرتا حتیٰ کہ چند روز میں وہ سوء نظر کا عادی ہو جاتا ہے، نیز ابتداء میں اس کے ضرر کا احساس جلدی ہو جاتا تھا کیونکہ قلب میں کیفیات کا رسوخ نہیں ہوا تھا ذرا سی بے اعتدالی سے کیفیت قلبی میں تغیر محسوس ہوتا تھا۔ مجاہدہ کے بعد چونکہ کیفیات قلبیہ میں رسوخ ہو چکا ہے تو اب بعض اوقات کسی بدپرہیزی اور بے اعتدالی سے ضرر کا احساس جلدی نہیں ہوتا جس سے سالک اس غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس فعل میں ہوائے نفس کو کچھ دخل نہیں ہے ورنہ میری قلبی کیفیت میں ضرور فرق ہوتا پھر وہ اس کو غیر مضر سمجھ کر اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا

اور نفس کو ڈھیل دیدیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفس اس فعل حرام کا عادی ہوجاتا ہے اور اب کسی وقت سالک کو اس کے ضرر کا احساس بھی ہوجائے تو وہ بعض اوقات نفس کے روکنے پر قادر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابتدائے مجاہدہ میں جس طرح تقاضائے نفس شدید تھا ویسے ہی نفس میں قوت کف (رکنا) بھی زیادہ تھی اور مجاہدہ کے بعد جس طرح تقاضائے نفس کمزور ہوگیا ہے اسی طرح بعض مجاہدات سے قوت کف بھی کمزور ہوجاتی ہے کیونکہ مجاہدہ اولیٰ سے تمام قویٰ میں ضعف پیدا ہوجاتا ہے۔ اب آپ کی سمجھ میں آیا کہ فراغ من المجاہدہ (مجاہدہ سے فارغ ہونا) کے بعد مجاہدہ کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے کیونکہ اس وقت ہوائے نفس کا احساس دیر میں ہوتا ہے اس لئے استرسال[له] ہوتا رہتا ہے اور استرسال کے بعد جب ہوائے نفس کا احساس ہوتا ہے تو بعض دفعہ نفس کو روکنے پر قدرت نہیں پاتا کیونکہ اس شخص کی قوت کف کمزور ہوچکی ہے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ شہوت شیخ شہوت شاب سے اشد ہے کیونکہ جوان کا نفس زندہ ہے اس کو شہوت کا احساس بھی جلد ہوتا ہے اور احساس کے بعد اس میں قوت کف بھی زیادہ ہے وہ اپنے نفس کو جلد ہوائے نفسانی سے روک سکتا ہے۔ اور شیخ کا نفس چونکہ مرچکا ہے اس لئے اس کو ہوائے نفس کا احساس جلد نہیں ہوتا بلکہ بہت دیر میں ہوتا ہے تو اس حالت میں استرسال نفس (ڈھیل دینا) زیادہ ہوتا ہے۔ پھر اس ڈھیل کے بعد شیخ کو ہوائے نفس کا جس وقت احساس ہوتا ہے تو اب وہ ضبط پر قادر نہیں ہوتا کیونکہ جس طرح اُس کی قوت شہوت کمزور ہے اسی طرح قوت ضبط بھی کمزور ہے۔ اب وہ لاکھ کوشش کرے کہ کسی طرح نفس کو سوء نظر سے روکوں مگر قدرت نہیں ہوتی۔

اور جوان کی جس طرح شہوت کامل اور زندہ ہے اسی طرح اس کی قوت ضبط

له ڈھیل ۱۲

بھی کامل اور زندہ ہے اسی لئے جوان کو بوڑھے سے زیادہ عفت پر قدرت ہے اور اس کی عفت شیخ کی عفت سے کامل بھی ہوتی ہے کیونکہ نہ اس کو زیادہ استرسال ہوتا ہے اور نہ استرسال کے بعد ضبط دشوار ہوتا ہے۔

پس بڈھوں کو مجاہدہ سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے ان کو جوانوں سے زیادہ پرہیز کی ضرورت ہے۔ یہ مضمون حق تعالےٰ نے بدون اعانت کتب کے قلب میں ڈالا تھا اور بحمد اللہ علم عظیم عطا ہوا جس کی قدر وہی لوگ کریں گے جن کو اس کا تجربہ ہوا ہو ایک بار میں نے یہ مضمون سہارنپور میں بیان کیا تھا، اس وقت ایک بوڑھے میاں وعظ میں موجود تھے وہ اس کو سن کر بہت ہی روئے اس وقت انکے سامنے اپنے استرسال نفس کا نقشہ کھنچ گیا تھا اور وہ سمجھ گئے کہ میں بہت بڑی غلطی میں مبتلا تھا کہ اپنے کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھتا تھا۔ اور اس مرض میں اکثر بوڑھے مبتلا ہیں یہ لوگ اپنے کو مجاہدہ سے مستغنی سمجھتے ہیں حالانکہ بوڑھاپے میں صرف جسم کمزور ہوتا ہے نفس کمزور نہیں ہوتا۔ بوڑھا کچھ کر تو نہیں سکتا مگر لالچ اور حرص اس کو جوانوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے یَشِیْبُ ابْنُ آدَمَ وَیَشِیْبُ فِیْہِ خَصْلَتَانِ اَلْحِرْصُ وَ طُوْلُ الْاَمَلِ یعنی انسان بڑھا ہوجاتا ہے مگر وہ خصلتیں اس میں جوان ہوتی ہیں حرص اور طول امل اس لئے بوڑھوں کو اصلاح نفس کی جوانوں سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ مضمون تو ضمناً آگیا تھا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت رہتی ہے، پس سالکین کان کھول کر سن لیں کہ مجاہدہ کی ضرورت چند روزہ نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت دائمی ہے چند روزہ مجاہدہ کے بعد اگر تم نے بدپرہیزی شروع کی تو یاد رکھو اس کے بعد عود مرض اس شدت کے ساتھ ہوگا کہ ہلاکت کے قریب پہونچادے گا پھر بہت کم ہیں جو اس ورطہ سے نجات پائیں اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؂

اندریں رہ می تراش و می خراش تادم آخر دمے فارغ مباش

تا دمِ آخر دمے آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(یعنی تم کو چاہیئے کہ اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ خراش تراش کرتے رہو اور آخری وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائیگی یعنی اگر طلب میں لگے رہوگے تو کسی وقت ضرور وصول الی اللہ ہو جائیگا)

یعنی اخیر دم تک اس راہ میں تراش و خراش ہی رہنی چاہیئے پس جب سلامتی کے ساتھ موت آجائے گی اس وقت مجاہدہ سے فراغت نصیب ہوگی۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جب مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تو پھر صاحب مجاہدہ و غیر صاحب مجاہدہ میں کیا فرق ہوا۔ اس کا جواب اوپر کی تقریر میں آچکا ہے یعنی دونوں میں وہی فرق ہے جو بیمار کے پرہیز میں اور بیماری سے صحت پانے والے کے پرہیز میں فرق ہوتا ہے کہ پرہیز کی ضرورت بیمار کو بھی ہے اور صحت پانے والے کو بھی مگر ظاہر ہے کہ بیمار کو سخت ضرورت ہے اور اس کا پرہیز بھی سخت ہوتا ہے اور صحت پانے کے بعد گو قدرے پرہیز کی ضرورت رہتی ہے مگر اب اتنا سخت پرہیز نہیں ہوتا جتنا بیماری کی حالت میں تھا تو کیا یہ فرق تھوڑا ہے کہ غیر صاحب مجاہدہ بیمار ہے اور صاحب مجاہدہ تندرست ہے بیمار ہر وقت خطرہ میں ہے اور تندرست خطرہ سے نکل چکا ہے۔ البتہ تندرستی کے بعد جس طرح حکیم کہہ دیا کرتا ہے کہ اب تم کو ہر چیز سے تو پرہیز کی ضرورت نہیں صرف فلاں فلاں اشیاء سے پرہیز رکھنا کیونکہ وہ تمہاری طبیعت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح صاحب مجاہدہ کو یہاں کہا جاتا ہے کہ تم کو بالکل بے فکر نہ ہونا چاہیئے بلکہ تھوڑا بہت پرہیز اب بھی کرنا چاہیئے جو کچھ دشوار پرہیز نہیں ہے بلکہ معمولی اور سہل ہے۔

دوسرا مضمون قربانی کے متعلق ہے اور اس کو مجاہدہ سے خاص تعلق ہے کیونکہ جملہ اعمال میں دو چیزیں ہیں ایک روحِ عمل، دوسری صورتِ عمل بعبارت دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ ہر عمل میں ایک باطن ہے اور ایک ظاہر ہے۔ اب سمجھو کہ قربانی میں بھی

ایک روح یعنی باطن ہے ایک صورت یعنی ظاہر ہے صورت قربانی تو اراقت دم (خون بہانا) ہے اور باطن قربانی مجاہدہ اور نفس کشی ہے۔ مگر یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ باطن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ باطن جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے یہ باطن بدون ظاہر کے معتبر نہیں۔ دوسرا وہ باطن ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید نہیں بلکہ اس کے لئے لازم ہے اس باطن کا تحقق بدون ظاہر خاص کے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ لازم کبھی عام ہوتا ہے تو وہ ملزوم کے بغیر متحقق ہوسکتا ہے اور باطن قسم اول کا تحقق بدون اس کے ظاہر کے نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ظاہر کے ساتھ مقید ہوتا ہے یہاں سے ملاحدہ کا اشکال مندفع ہوگیا۔ جو ظاہر کو مطلقاً لغو اور فضول قرار دے کر ہر عمل میں صرف باطل پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب ہر عمل میں ایک روح ہے اور ایک صورت ہے اور روح ہی مقصود ہے تو اس صورت کا مقصود نہ ہونا لازم آگیا مگر یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ روح کے مقصود ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ صورت ہمیشہ غیر مقصود ہوا کرے بلکہ بعض دفعہ روح مع الصورت مقصود ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ انسان میں ایک روح ہے اور ایک اس کی صورت یعنی جسم ہے روح کا مقصود ہونا تو ظاہر ہے چنانچہ کسی کا بیٹا مرجاوے تو موت کے بعد گو جسم ہمارے سامنے موجود رہتا ہے مگر روح کے فقدان سے مقصود فوت ہوجاتا ہے اب اُس جسم کے بقا سے کچھ تسلی نہیں ہوتی بلکہ اس کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کرکے اپنے سے جدا کردیا جاتا ہے اس سے تو روح کا مقصود ہونا معلوم ہوا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم بالکل مقصود نہ ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح اس قید کے ساتھ مقصود ہے کہ اس جسم کے ساتھ متصل ہو اگر روح ہمارے سامنے موجود ہو مگر جسم کے ساتھ اس کا اتصال نہ ہو تو اس صورت میں بقاء روح سے کچھ خوشی اور تسلی نہیں ہوسکتی چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی روح کو دوسرے جسم میں منتقل کردے اور یہ بات مشق سے حاصل ہوجاتی ہے کیونکہ روح کا بدن کے ساتھ محض تدبیر و تصرف کا تعلق ہے اور حقیقت میں وہ

جسم سے منفصل ہے جو لوگ خاص تصرفات کے عادی ہیں ان کو روح کا جسم سے انفصال محسوس ہوتا ہے یہاں تک کہ مشق کر کے بعض دفعہ ایسا شخص اپنی روح کو حقیقۃً اپنے جسم سے منفصل کر دیتا ہے اور دوسرے جسم میں منتقل کر دیتا ہے تو اگر کوئی شخص ایسی مشق کر کے اپنی روح کو کتے اور بندر کے جسم میں منتقل کر دے اور اس کے باپ کو معلوم ہو جائے کہ اس کتے یا بندر میں میرے بیٹے کی روح ہے تو کیا وہ اس وقت بھی اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرے گا جو جسم اصلی کے اتصال کے وقت کرتا تھا ہرگز نہیں بلکہ اب تو وہ اُس کو اپنا بیٹا کہنا بھی گوارا نہ کرے گا نہ اسکو شفقت و محبت سے پیار کرے گا نہ اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلانا پلانا گوارا کریگا اور اگر کسی کو اسی طرح سے نقل روح میں تردد ہو اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی ہو تو وہ یوں سمجھے کہ جس وقت بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت کو مسخ کیا گیا ہے جن میں بعضے بندر بن گئے تھے اور بعضے سور ہو گئے تھے اور تین دن تک وہ اسی صورت میں رہے اور یہ جو مشہور ہے کہ اس وقت جتنے بندر اور سور ہیں سب انہی کی نسل میں ہیں یہ غلط ہے۔ کیونکہ مسلم شریف کی صحیح حدیث میں ہے کہ وہ لوگ تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے تھے کوئی مسخ شدہ قوم تین دن کے بعد زندہ نہیں رہی اور نہ ان سے کوئی نسل چلی ہے بلکہ اس وقت کے بندر اور سور ان بندروں اور سوروں کی نسل سے ہیں جو بنی اسرائیل کے مسخ سے پہلے موجود تھے کیونکہ ان حیوانات کا وجود پہلے بھی تھا۔

بہرحال حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مسخ کے بعد تین دن تک وہ لوگ زندہ رہے تو اب بتلایئے کہ اس مدت میں روح تو یقیناً وہی تھی جو تین دن پہلے قالب انسان میں تھی مگر اس وقت وہ بندر یا سور کے قالب میں تھی اور یقیناً ان میں بعض صاحب اولاد بھی تھے اہل و عیال بھی رکھتے تھے بعضوں کے باپ دادا بھی زندہ ہوں گے تو کیا کوئی شخص ان کے مسخ ہونے کے بعد روح کے باقی رہنے کو کافی سمجھ سکتا تھا اور کیا کسی کو یہ خوشی ہو سکتی تھی کہ میرا بیٹا زندہ تو ہے گو بندر اور سور کے قالب میں ہے

یا ان کی اولاد اور بیبیاں اس صورت میں اپنے باپ یا شوہر کے زندہ رہنے سے خوش ہو سکتے تھے کہ خیر روح تو موجود ہے گو جسم کیسا ہی ہو ہرگز نہیں بلکہ یقیناً مسخ ہونے کے ساتھ ہی ان میں رونا پیٹنا پڑ گیا ہوگا اور وہ اسی وقت سے ان کو مثل مردہ کے سمجھ چکے ہوں گے ہرگز کسی کو بھی انھیں اپنا باپ یا بیٹا یا شوہر کہنا گوارا نہ ہوا ہوگا (اور اگر کسی کو یہ تردد ہو کہ واقعہ مدت دراز کا ہے نہ معلوم اس وقت کے آدمیوں نے ان بندروں اور سوروں کے ساتھ کیسا معاملہ کیا ہوگا شاید ان لوگوں نے بقاء روح کی وجہ سے ان کے ساتھ آدمیوں ہی کا سا معاملہ کیا ہو تو میں ان ملحدین سے پوچھتا ہوں کہ تم ایمان سے کہو کیا تم کو اپنی اولاد اور بیوی بچوں کا بندر اور سور ہو جانا ناگوارا ہے اور کیا تم بقاء روح کی وجہ سے جو کہ تمہارے نزدیک اصل مقصود ہے اس وقت بھی ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرو گے جو صورت انسانی میں کرتے تھے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کو کوئی انسان ہرگز گوارا نہ کرے گا۔ پھر آخر اس ناگواری کی وجہ کیا ہے جب تمہارے نزدیک محض روح مقصود ہے اور صورت محض لغو و فضول ہے تو یہاں تم اس قاعدہ پر کیوں نہیں چلتے اور اپنا اور اپنے اہل و عیال کا سور بندر بن جانا تمہیں کیوں ناگوار ہے۔ آخر روح تو جب بھی موجود رہے گی ۱۲ جامع)

پھر حیرت ہے مجھے ان ملحدین کی عقل پر کہ انھوں نے اعمال شرعیہ میں مطلقاً روح کو کیونکر کافی سمجھا اور ظاہر کو مطلقاً کیسے فضول قرار دیدیا حالانکہ امور دنیوی میں وہ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کی صورت کو بیکار نہیں سمجھتے بلکہ روح کے ساتھ صورت کو بھی مقصود سمجھتے ہیں۔ دیکھئے گنا چوسنا مقصود ہے مگر اس قید کے ساتھ کہ اس کو منہ میں دبایا جائے اور پوری پوری کا رس تدریجاً چوسا جائے حالانکہ گنے میں ایک ظاہر ہے ایک باطن۔ باطن تو وہ مٹھاس ہے جو اس کے اندر ہے اور ظاہر وہ جسم ہے جس کو پوری پوری کرکے چوسا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے نوکر یا دوست سے کہے کہ میں سہارنپور کا گنا چوسنا چاہتا ہوں اور وہ اس کے سامنے

سہارنپوری کے گنے کی شکر لاکر رکھدے کہ اس کو پھانک لیجئے یہ اسی گنے کی روح ہے جسے آپ چوسنا چاہتے ہیں تو کیا وہ اس کو کافی سمجھے گا اور شکر پھانک لینے کو گنا چوسنے کا قائم مقام سمجھے گا' ہرگز نہیں بلکہ یہ کہے گا کہ مجھے گنا چوسنا اُس کی خاص صورت کے ساتھ مطلوب ہے۔ شکر کا پھانکنا اس مقصود کے قائمقام نہیں ہوسکتا جو لطف گنے کے چوسنے میں ہے وہ گڑ کھانے اور شکر پھانکنے میں کہاں ہے۔ پھر حیرت ہے کہ یہاں تو صورت بھی باطن کے ساتھ مطلوب ہو اور اعمال شرعیہ میں صورت مطلوب نہ ہو پس ملحدین کا یہ کہنا کہ نماز کی روح ذکر اللہ ہے بس قلب میں ذکر اللہ کا ہونا کافی ہے صورت صلوٰۃ کی کچھ ضرورت نہیں اور روزہ کی روح شہوت نفسانی کا توڑنا ہے اگر کسی اور طریقہ سے شہوت نفس شکستہ ہوجائے تو روزہ کا مقصود حاصل ہوگیا صورت صوم کی کچھ ضرورت نہیں۔ زکوٰۃ سے مقصود نفس کو صفت بخل سے پاک کرنا ہے۔ اگر کسی میں طبعی طور پر بخل نہ ہو تو اس کو صورت زکوٰۃ کی ضرورت نہیں۔ یا حج سے مقصود عشق کا حال پیدا کرنا ہے اگر کسی اور طریقہ سے یہ حال پیدا ہوجائے تو پھر حج فرض نہیں یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ہم کہیں گے کہ ان اعمال کی جو تم نے روح بیان کی ہے وہ صورت کے ساتھ مقید ہے اور ان میں روح مع الصورت مطلوب ہے مجرد روح بلا صورت معتبر نہیں (جیسا کہ کھانے کی روح تو بھوک کا دفع کرنا اور پیٹ بھرنا ہے مگر اس کے ساتھ روٹی اور سالن کی صورت بھی مطلوب ہوتی ہے اگر صورت مطلوب نہیں تو پھر ان ملحدین کو گیہوں چبانا اور آٹا پھانک لینا چاہیئے۔ کیونکہ روح اکل تو اس میں بھی موجود ہے ۱۲)

غرض ثابت ہوگیا کہ بعض دفعہ روح مع الصورت مطلوب ہوا کرتی ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک شخص نے نماز کے متعلق کہا کہ اس اٹھک بیٹھک سے کیا ہوتا ہے مقصود تو اور ہی کچھ ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ اسی میں کچھ ہے اور اس کے بغیر تمہارے مراقبے اور مجاہدے سب فضول ہیں اور یہ باطن کی

پہلی قسم ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے یہ باطن بدون ظاہر کے معتبر نہیں اور ایک باطن ان اعمال میں قسم دوم کا ہے مثلاً نماز کے لئے مطلق ذکر جو دوسرے مادہ میں بھی متحقق ہوتا ہے اور روزہ کے لئے مطلق کسر شہوت جو دوسرے مادہ میں بھی متحقق ہوتا ہے اور میں نے باطن کے متعلق یہ تفصیل اور تقسیم اس لئے بیان کردی تاکہ کسی کو اضحیہ کے متعلق میرے اس قول سے کہ اس کا ایک ظاہر ہے ایک باطن ہے یہ وہم نہ پیدا ہو کہ یہ تو وہی بات ہے جو ملحدین کہا کرتے ہیں اس تفصیل سے ان شاء اللہ یہ وہم رفع ہو گیا ہوگا کیونکہ میں نے بتلا دیا کہ میرے نزدیک باطن کی ایک قسم وہ بھی ہے جو ظاہر کے ساتھ مقید ہے اور ملحدین کے نزدیک کوئی قسم ایسی نہیں یہ فرق ہے ان میں اور صوفیہ میں۔

اب سنئے کہ اسی طرح قربانی میں ایک تو صورت ہے یعنی اراقت دم (خون بہانا) یہ قربانی کی صورت ہے گوشت خیرات کرنے کا نام قربانی نہیں گوشت تو چاہے تم سارا کھالو ذرا سا بھی خیرات نہ کرو تو قربانی میں کچھ نقصان نہیں آتا۔ پس قربانی تو خون بہانے کا نام ہے اور یہ اس کا ظاہر ہے۔ اور ایک اس کی روح اور باطن ہے وہ مجاہدہ و نفس کشی ہے کیونکہ یہ شخص مال خرچ کرکے جانور کو خریدتا ہے اور نفس کو اپنی چیز کا ہلاک کرنا گراں ہے تو یہ اپنے نفس کے داعیہ کو دباتا ہے اور اس کے محبوب کو فنا کرکے اس پر زخم لگاتا ہے یہی مجاہدہ ہے اور اس درجہ کا نام اصطلاح میں فنا رہے۔ اس کے آگے ایک اور درجہ ہے وہ یہ کہ قربانی سے مقصود رضائے حق ہے یہ شخص اپنے مال کو فنا کرکے رضائے حق کا طالب ہے ثواب کا قصد کرتا ہے اس کا نام اصطلاح میں بقا ہے کیونکہ مال خرچ کرنے سے نفس میں جو اضمحلال ہوا اور زخم لگا تھا وہ حصول ثواب اور تصور رضائے حق سے مندمل ہو جاتا ہے۔ قربانی کرتے ہوئے جو قلب کو صدمہ اور کلفت ہوئی تھی وہ اب مبدل بسرور و راحت ہو جاتی ہے۔ پس یہ حالت اس

حالت کے مقابلہ میں بقار کے مشابہ ہے پس معلوم ہوا کہ قربانی کی روح فنا و بقار ہے مگر یہ فنار و بقار جو کہ باطن ہے اضحیہ کا یہ بھی دو قسم ہے ایک وہ جو مخصوص ہے قربانی کے ساتھ دوسرا مطلق فنار و بقار جو دوسرے مواد میں بھی متحقق اور ہر عمل میں مطلوب ہے میں نے اوپر اسی کو مجاہدہ کہا ہے اور جس مجاہدہ کا مجھ کو یہاں بیان کرنا مقصود ہے وہ قسم دوم ہے اس کی یعنی مطلق مجاہدہ جس کا تعلق ہر عمل سے عام ہے اور قربانی کے ساتھ اوروں سے زیادہ اس لئے قربانی کی مناسبت محرک ہوئی بیان مجاہدہ کی اب یہ سمجھئے کہ اس فنار و بقار میں جس کی مختصر تعبیر مجاہدہ سے کی گئی ہے اصل مقصود بقار ہے اور فنا اس کے لئے ذریعہ ہے اس بنا پر کہا جاویگا کہ باطن اضحیہ حیٰوۃ نفس ہے مگر حیٰوۃ سے وہ حیٰوۃ طیبہ مراد ہے جو فنار نفس کے بعد حاصل ہوتی ہے یعنی بقار جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً

(جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو پس ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے)

وہ حیٰوۃ ناسوتی مراد نہیں جو فنار سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ حیات ناسوتی ہر شخص کی طیبہ نہیں ہوتی بلکہ بعض کی حیات معیشت ضنک (یعنی تنگ زندگی) ہوتی ہے چنانچہ ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے گھر خیریت ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور کہا تم مجھے کوستے ہو خیریت ہوگی تمہارے یہاں کہ نہ کچھ آگے کو نہ پیچھے کو ہمارے یہاں خیریت کیوں ہوتی کہ ماشاء اللہ بیٹوں، پوتوں بہو بیٹیوں سے گھر بھرا ہوا ہے آج کسی کے سر میں درد ہے، کسی کے پیٹ میں درد ہے، کسی کو بخار آتا ہے، کسی کو دست آرہے ہیں، کسی کے چوٹ لگ گئی ہے تو ہمارے یہاں جب اتنا کنبہ ہے وہاں خیریت کیوں ہونے لگی خیریت تم جیسے کے یہاں ہوگی جس کے اولاد نہ بنیاد سارے گھر میں اکیلے پڑے رہتے ہیں

واقعی دنیا داروں کو چین کہاں مگر وہ ان تعلقات میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ ان کا مذاق بھی بدل جاتا ہے وہ ان تعلقات کو جو حقیقت میں عذاب ہیں راحت سمجھتے ہیں اور راحت کو کلفت۔ چنانچہ اس شخص نے خیریت کے سوال کو کوسنا سمجھا اور صاف کہدیا کہ ہمارے یہاں اللہ نہ کرے جو خیریت ہو' خیریت تمہارے یہاں ہوگی۔ اہل دنیا قیود و علائق میں خود پھنستے جاتے ہیں جس کے ساتھ خدا نے کوئی بھی قید اور تعلق نہ لگایا ہو وہ خود اپنے سر ہزار جھگڑے باندھ لیتا ہے، وہی حال ہے ان کا غم نداری بز بخر (غم نہ رکھے تو بکری خرید) مگر اس وقت تو بوجہ مذاق بدل جانے کے ان کو ان تعلقات و قیود کی کلفت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا گو حقیقت اب بھی معلوم ہے ایسا بے حس کوئی نہیں ہو سکتا جس کو کلفت کا کلفت ہونا بھی معلوم نہ ہو مگر چونکہ زیادت انہماک سے اب ان کی عادت ہوگئی ہے اس لئے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا (جیسے کسی شخص کے دو تین سال تک کھجلی رہے تو عادت کی وجہ سے اس کو کلفت کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا ابتداء میں تھا اب اسے ہر وقت کھجلانے ہی میں مزا آتا ہے مگر حقیقت تو اُسے بھی ضرور معلوم ہے ۱۲ جامع) مگر جب اہل دنیا مرنے لگتے ہیں اس وقت حقائق پوری طرح منکشف ہوتی ہیں اور ان کا عذاب ہونا معلوم ہو جاتا ہے اس وقت تو وہ ان تعلقات سے خوش نظر آتے ہیں اور آزاد لوگوں پر ہنستے ہیں مگر جب پردہ اٹھے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ جن تعلقات سے ہم نے دل لگایا تھا وہ مار آستین تھے۔ بس وہی قصہ ہوگا ؎

کہ باکہ باختہ عشق در شب دیجور

(کس کے ساتھ محبت میں مشغول ہوا اندھیری رات میں)

کوئی شخص اندھیری رات میں کسی عورت سے مشغول ہوا اس وقت تو وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتا رہا کہ میں حسین پری پیکر کو بغل میں لئے ہوئے ہوں مگر جب صبح ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ ساری رات ایک بڑھیا چڑیل کے ساتھ مشغول رہا تھا۔

اب اس کی حسرت قابل دید ہے کہ وہ اپنے اوپر ہزار نفریں کرتا ہے اور رات کے قصہ کو یاد کر کے اُسے خود قے آتی ہے۔ خوب کہا ہے ؎

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ
اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

(غبار ہٹ جانے دو تم کو عنقریب پتہ چل جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

ایک شخص آندھی غبار میں گدھے پر سوار ہے اور کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں، دوسرا شخص متنبہ کرتا ہے کہ کمبخت تو گھوڑے پر سوار نہیں بلکہ گدھے پر سوار ہے مگر وہ ایک نہیں سنتا اور ناصح کو بے وقوف بتلاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اچھا بھائی تو یہی سمجھتا رہ ابھی غبار کھلنے پر تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیری ران کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

اسی طرح جو لوگ تعلقات دنیا میں پھنسکر خوش ہیں اور ان کو راحت سمجھتے ہیں اُن سے عارفین یہی کہتے ہیں "فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ" (غبار ہٹ جانے دو عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا) حق تعالےٰ اہل دنیا کے ان ہی تعلقات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ یعنی اے مخاطب تجھے ان منافقین کے اموال و اولاد (اور دنیوی ترقی و عروج ۱۲) اچھے نہ معلوم ہونے چاہئیں۔ کیونکہ حق تعالےٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں۔ (اور ان کی جان کفر کی حالت میں نکل جائے) واقعی اہلِ دنیا کے لئے تو مال و اولاد عذاب ہی ہے کیونکہ ان کو ان چیزوں سے تعلق اس قدر ہوتا ہے کہ مارے فکر کے رات دن نیند نہیں آتی ہر وقت اسی توڑ جوڑ میں لگے رہتے ہیں کہ آج اتنے روپے ہیں کل کو اتنے ہو جائیں گے۔ فلاں پر اتنا قرض ہے اُس کا اتنا سود آئے گا۔ رات کو سوتے ہیں تو روپیوں کے فکر سے بار بار آنکھ کھل جاتی ہے تو یہ خاک راحت ہے، وبالِ جان ہے

بعضوں کو اولاد سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے ان کے لئے کبھی زمین خریدتے ہیں کبھی باغ لگاتے ہیں کبھی جائداد بڑھاتے ہیں جس میں سیکڑوں مقدمے کرنے پڑتے ہیں، وصول باقی کے لئے رات دن نالشیں ہوتی ہیں گرمی اور برسات میں مصیبت کے ساتھ سفر کرتے ہیں پھر اگر کسی بچہ کا کان گرم ہوگیا تو بھاگے بھاگے پھرتے ہیں نہ کھانے کے نہ پینے کے نہ نماز کے۔ روزہ کے ہر وقت فکر میں گھلے جاتے ہیں مسلمان کو تو خدا پر بھی نظر ہوتی ہے کافر تو ہر وقت بے چین رہتا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم اموال و اولاد سے ان منافقین کو دنیا میں عذاب دینا چاہتے ہیں تو یہ کیا تھوڑا عذاب ہے اور یہ عذاب دنیا میں ہی ہوتا ہے آخرت کا عذاب الگ ہے۔ پس اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا (حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں) میں دنیوی عذاب ہی مراد ہے آخرت کا عذاب مراد نہیں کیونکہ جس کا ذکر دوسرے جملہ میں ہے وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (اور ان کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جائے) یعنی ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ساری عمر انہی تعلقات میں گرفتار رہیں ان سے خلاصی نصیب نہ ہو حتیٰ کہ اس حالت میں ان کو موت آ جاوے اور کافر ہو کر مریں۔ تو کفر کی حالت میں مرنا یہ آخرت کا عذاب ہے۔ اس لئے يُعَذِّبَهُمْ بِهَا (ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں) میں دنیوی عذاب مراد ہونا چاہیئے ورنہ جملہ ثانیہ کو پہلے کی تاکید ماننا پڑے گا اور تاسیس تاکید سے اولیٰ ہے۔ دوسرے اموال و اولاد کا دنیا ہی میں وبال جان ہونا مشاہد ہے یہ بھی اس کو مقتضی ہے کہ اس عذاب کا بھی آیت میں ذکر ہو۔ تیسرے عذاب آخرت کا ذکر تو موت علی الکفر کے بعد ہونا مناسب ہے کیونکہ وہ موت کے بعد ہی ہوگا اور یہاں ذکر موت سے پہلے عذاب کا ذکر ہے تو ظاہر یہی ہے کہ اس سے دنیوی عذاب مراد ہے فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (تم کو اچھے نہ معلوم ہوں ان کے اموال و اولاد کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو دنیا میں عذاب دیں) آیت میں تو

فی الحیٰوۃ الدُّنیا (دنیا کی زندگی میں) کی قید خود ہی مذکور ہے میں نے خوامخواہ اتنی کوشش کی عذاب دنیوی کے مراد لینے میں یہاں تو تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اموال واولاد سے حیوۃ دنیا میں بھی ان کو عذاب دینا چاہتے ہیں مجھے فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنیا کا لفظ یاد نہ رہا عجیب بات ہے حالانکہ بحمد اللہ میں حافظ بھی ہوں مگر خیر کچھ حرج نہیں اس تقریر سے یہ فائدہ ہوا کہ یہ مسئلہ نقلاً و عقلاً دونوں طرح ثابت ہو گیا اگر آیت میں فی الحیٰوۃِ الدُّنیا (دنیا کی زندگی میں) کی قید نہ بھی ہوتی جب بھی دلائل سے یہاں عذاب دنیا کا مراد ہونا ثابت ہوتا تو اس جملہ کے بھول جانے میں بھی فائدہ ہی ہوا کہ حق تعالیٰ نے وہ دلائل قلب میں القا فرما دیئے جن سے اس قید کی ضرورت و حکمت معلوم ہو گئی بہر حال نص سے ثابت ہو گیا کہ یہ تعلقات حقیقت میں عذاب ہیں گو فساد مذاق کی وجہ سے کسی کو اس کا احساس نہ ہو علامہ غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اہل علائق کو مرتے وقت سخت تکلیف ہوتی ہے اور چونکہ مرنے کے بعد بھی روح کو ان چیزوں سے تعلق رہتا ہے جن سے دنیا میں تعلق تھا بلکہ موت کے بعد بوجہ قوت ادراک کے یہ تعلق قوی ہو جاتا ہے تو مفارقت جسم کے بعد روح کو ان علائق کی مفارقت سے ایسی اذیت ہوتی ہے جیسے عذاب جہنم اس کا یہ مطلب نہیں کہ عذاب قبر اور عذاب جہنم کی حقیقت یہی اذیت روحانی ہے جیسا کہ فلاسفہ نے سمجھا ہے بلکہ علامہ غزالیؒ کا مطلب یہ ہے کہ عذاب قبر و عذاب جہنم کے علاوہ اہل علائق کو ان تعلقات کی مفارقت سے بھی سخت اذیت ہوتی ہے اور وہ اذیت عذاب جسمانی سے بدرجہا زائد ہے بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح نعیم جنت اعمال صالحہ و علائق محمودہ کی صورت ہے اسی طرح عذاب قبر و عذاب جہنم اعمال سیئہ و علائق مذمومہ کی صورت ہے لیکن اس سے عذاب جسمانی کی نفی لازم نہیں آتی اور جن لوگوں نے علامہ غزالی کے کلام کا یہ مطلب سمجھا ہے وہ غلطی پر ہیں امام کا یہ مطلب ہرگز نہیں اور اہل اللہ چونکہ آزاد ہوتے ہیں اس لئے ان کی روح اس اذیت سے محفوظ ہے۔ اہل اللہ کو صرف ایک قید ہے یعنی فکر آخرت مگر یہ قید خود لذیذ ہے

جس سے وہ خلاصی نہیں چاہتے وہ قید تو اس کا مصداق ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند
شکارش نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اس کا شکار کمند سے خلاصی نہیں چاہتا)

اور قدسی فرماتے ہیں ؎

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آب حیات
ضاعف اللہ بہ کل زماں عطشی

(اور اس آب حیات سے میرا سیر ہونا مصلحت نہیں ہے اللہ تعالیٰ اس کی ہر زمانہ میں پیاس زیادہ کرے)

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر محبوب کی زلف کی زنجیر کے سوا دو سو زنجیر بھی لاؤ تو میں ان کو توڑ ڈالونگا)

اہل اللہ کو علائق دنیا میں انہماک نہیں ہوتا اور نہ ان کے قلب کو ان سے لگاؤ ہوتا ہے اگر ظاہر میں عارف علائق میں مشغول بھی ہو تو اُس کا قلب اُن سے فارغ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کا امتحان لینا چاہا، کیونکہ ان کے یہاں حشم و خدم اور ساز و سامان بہت کچھ تھا تو اس شخص نے خیال کیا کہ یہ تو بظاہر بہت ہی مشغول ہیں شاہی کارخانہ اور امیرانہ انتظام ہے دیکھو ان کا باطن کیسا ہے۔ تو اس نے ایک دن آکر عرض کیا کہ حضرت میں حج کو جانا چاہتا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ آپ کے ہمراہ چلوں، فرمایا بسم اللہ چلو اور یہ کہکر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اس شخص نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو بہت ہی جلدی تیار ہو گئے اس کارخانہ کا تو کچھ انتظام کر دیجئے۔ فرمایا یہ کارخانہ میرا تھوڑا ہی ہے حق تعالےٰ کا ہے وہ خود انتظام کریں گے میرے اوپر اُن کا کام اٹکا ہوا نہیں ہے جب میں

نہ ہوں گا وہ کسی دوسرے سے یہ کام لے لیں گے۔ اب تو شاہ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں کہنے لگے کہ تھوڑا سا توقف فرمائیے میں ذرا گھر سے کمبل لے آؤں فرمایا بس اسی برتے پہ امتحان لینے آئے تھے، میں نے تو اتنے بڑے کارخانہ پر بھی نظر نہ کی اور تم ایک کمبل سے بھی نظر قطع نہ کر سکے۔ تو بات یہ تھی کہ ان کے دل کو ایک کے سوا کسی سے تعلق نہ تھا اور اس ایک قید کے سوا اُن کو کوئی قید نہ تھی اب لوگ اس قید سے تو آزادی چاہتے ہیں جو لذیذ ہے اور ان قیود کو خریدتے پھرتے ہیں جو مصیبت ہیں شاید یہاں کسی کو شبہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو جب دنیوی اسباب سے تعلق نہیں ہوتا تو چاہیئے ان سے مفارقت سہل ہو پھر ان کا نزع کیوں شدید ہوتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں بہت شدت ہوئی حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع دیکھ کر اس کی تمنا نہیں کرتی اسی طرح بعض اولیاء کو بھی نزع شدید ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے تو بات یہ ہے کہ شدت نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں جس قدر روح کو ناسوت سے تعلق ہوگا اسی قدر نزع میں شدت ہوگی۔ مگر تعلقات دو قسم پر ہیں ایک وہ جو مانع عن الآخرت ہیں جیسے جائداد اور مال وغیرہ کی محبت ان سے جو شدت ہوتی ہے اُس سے تکلیف سخت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ تعلقات ہیں جو آخرت سے مانع نہیں ہیں بلکہ معین آخرت ہیں اور یہ وہی تعلقات ہیں جو اس کے مصداق میں داخل ہے ؎ "اسیرش نہ خواہد خلاصی زبند" (اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا) اس کی تعیین عنقریب آتی ہے۔ ان سے بھی نزع میں شدت ہوتی ہے مگر اس سے روحانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ شدت لذیذ ہوتی ہے کیونکہ اس کا منشا قید لذیذ ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بجز ذات حق کے کسی سے نہیں ہوتا اور اس کا مقتضا سہولت نزع ہے مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد خلق و تربیت طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے اور یہ بدون توجہ الی الخلق کے نہیں ہو سکتی اس لئے ان کو امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ اور

اصلاح وارشاد کے لئے ان سے ایک گونہ تعلق ہوجاتا ہے اور یہ تعلق چونکہ بامرِ حق ہے اس لئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا بلکہ موجبِ اجرا ور سبب ترقی ہے جس سے جس قدر اصلاح وارشاد کا فیض ہوگا اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہوگا چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کے ساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور انبیاء میں بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد سب سے زیادہ یہ خدمت تھی کیونکہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے آپ ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنیوالا نہیں تو آپ کو سب سے زیادہ ارشاد و اصلاح کی فکر و اہتمام تھا اس لئے آپ کو نزع میں شدت زیادہ ہوئی کیونکہ روح کو امت کے ساتھ تعلق تھا اور وصال کے وقت بھی آپ کو اُن کا اہتمام تھا مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوش گوار تھا۔ آپ کے لئے اس میں اجر اور ترقی درجات تھی اس لئے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوئی مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ انبیاءؑ کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد و تبلیغ ہوتی ہے ان کو بھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے مگر ان کو انبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی کیونکہ ان کی ذمہ داری انبیاء کے برابر نہیں ہے اس لئے ان کو مخلوق کے ساتھ اصلاح وارشاد کا تعلق بھی ان سے کم ہوتا ہے اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں ان کو نہ کسی کی فکر ہے نہ کسی سے تعلق ہے۔ ان کا نزع بہت سہل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں۔ بعضے غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں، بعضے ہنستے ہوئے جان دیتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم　　راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحتِ جان طلب کروں اور محبوبِ حقیقی کے پاس جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہوگیا تو خوش و خرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)

(بعینہٖ تکمیل کرالی گئی)

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم
جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وہ وقت آگیا ہے کہ میں عریاں ہوں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں)

ان کی یہ حالت دیکھ کر بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان اولیاء سے افضل ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد ہے کیونکہ وہ موت کے وقت ان کی برابر بے فکر نہیں ہوتے ان کو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کو نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے مگر یہ اعتقاد افضلیت صحیح نہیں بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں جو صاحب ارشاد ہیں کیونکہ ان کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہے اور جو جتنا انبیاء کے مشابہ ہوگا وہ دوسروں سے افضل ہوگا لیکن تم کو اس تجویز کا حق نہیں ہے کہ اپنے لئے صاحب ارشاد ہونے کی تمنا کرو۔ بس بادشاہ کو اختیار ہے کہ تمہارا امتحان لے کر جو عہدہ جس کو چاہے دیدے جس کو چاہے تحصیلدار بنا دے، جس کو چاہے ڈپٹی کلکٹر بنا دے اور اسے یہ بھی اختیار ہے کہ کسی کو کوئی عہدہ بھی نہ دے بلکہ اس کو اپنا مصاحب بنالے محمود غزنوی کو اختیار تھا کہ ایک کو حسن میمندی بنادے اور ایک کو ایاز بناتے۔ حسن میمندی کے سپرد قلمدان وزارت تھا سلطنت میں تصرف کرنے کا بڑا اختیار اُسے دیا گیا تھا اور ایاز کو اختیار کچھ نہ تھا مگر تقرب اتنا تھا کہ حسن میمندی کو باوجود سب اختیارات کے وہ تقرب حاصل نہ تھا بعض دفعہ یہ نوبت آتی تھی کہ محمود سے بات کرنے کی ایاز کے سوا کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی اس وقت میمندی بھی ایاز کی خوشامد کرتا تھا کہ بادشاہ تک یہ بات پہنچا دو حالانکہ

ضروری اطلاع:- خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمایا کریں۔

یہ وہ شخص ہے جسے سلطنت میں کوئی بھی عہدہ حاصل نہیں اور امور سلطنت میں ایک پیسہ کا تصرف بھی اس کے اختیار میں نہیں مگر تقرب کی یہ حالت ہے پس سالک کو اپنے لئے کسی تجویز کا حق نہیں خدا تعالیٰ کے سپرد کردو اپنے آپ کو وہ جو چاہیں کریں خواہ صاحب سلسلہ بنادیں یا درباری بنالیں ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل او اندر دلش انداختند

(جس کسی شخص کو کسی کام کے لئے مقرر کرتے ہیں اسی کی طرف میلان اس کا اس کے دل میں ڈال دیتے ہیں)

سرکاری باغ میں جو درخت بھی ہے عمدہ ہی ہے۔ کوئی درخت آم کا ہے جسے سے مخلوق کو نفع ہوتا ہے اور کوئی درخت گلاب کا ہے جس کے پھولوں کو خاص بادشاہ کی میز پر لاکر رکھا جاتا ہے کسی کو اس کے توڑنے کی اجازت نہیں پھر تم کون ہو جو آم ہی کا درخت بننا چاہو گلاب نہ بننا چاہو اسی باغ میں بلبل بھی ہے جس کا کام بجز نالہ و آہ زاری کے کچھ نہیں مگر سب کے سب اسی باغ کے رہنے والے ہیں ان میں کوئی ناقص نہیں سب کامل ہی ہیں گو حالات مختلف ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(پھول کے کان میں کیا کہدیا ہے کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا کہ گریہ وزاری میں ہے)

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست | ور بجہل آئیم ما زندان اوست
گر بخواب آئیم مستان وئیم | ور بہ بیداری بدستان دئیم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ ان کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان کے مصرت سے عطا ہوا۔ اور اگر جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان کا زندان ہے

یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ مجلس جہل سے نہیں نکلے اگر سو رہیں تو ان ہی کے لیے بیہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں)

ان کو اختیار ہے جس حال میں چاہیں رکھیں۔ جب وہ اپنا بنالیں گے تو ہر حال میں تم ان ہی کے کہلاؤ گے اور جس کو وہ اپنا بنالیتے ہیں وہ ناقص نہیں رہتا وہ کامل ہی ہوتا ہے۔ گو حالات اور مذاق میں تفاوت ہو چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے مذاق و حالات و کیفیات میں بھی باہم تفاوت ہے مگر ان میں کوئی ناقص نہیں سب کامل ہیں گو بعضے اکمل ہوں مگر بعض کی اکملیت کسی کے نقص کو مستلزم نہیں کامل سب ہیں۔ اور یہاں سے میں ایک بات پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ کہ آج کل ایک سیرت نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) شائع ہوئی ہے جس کو تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبولیت حاصل ہے لوگ شوق سے اس کو خریدتے ہیں کیونکہ کاغذ چکنا اور لکھائی عمدہ ہے، ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن بھی ایسا ہی ہوگا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کسی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت ہے۔ کیونکہ کمالات نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس میں بحث ہی نہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر بادشاہ کی سوانح عمری ہے زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر و انتظام ہی کا پہلو دکھلایا گیا ہے اور اگر کسی جگہ اتفاق سے آپ کے کمالات نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر بھی ہے تو غضب یہ کیا ہے کہ دوسرے انبیاءؑ میں نقص نکالا گیا ہے۔ چنانچہ شروع ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات کے جامع تھے اور دیگر انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع نہ تھے کسی میں کوئی صفت تھی کوئی نہ تھی۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ وہ رحم سے خالی تھے اور دلیل میں یہ واقعہ پیش کیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے لئے سخت بد دعا کی تھی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (اے پروردگار زمین پر کفار میں سے کسی بسنے والے کو نہ چھوڑیئے سب کو تباہ کر دیجئے ۱۲ جامع) یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ نبی کو رحم سے خالی کہا جائے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○ رہی دلیل تو اس کا جواب خود نص میں موجود ہے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو سمجھایا۔ غور کیجئے کہ سمجھانے کی بھی کوئی حد اتنی مدت تک ان کی اذیتوں پر صبر کرنا تھوڑی بات ہے ذرا کوئی کہ کے تو دکھلائے نو سو برس تو کیا نو ہی برس ہیں حقیقت معلوم ہو جاتی ہے تو نوح علیہ السلام کا یہ تھوڑا رحم ہے کہ اتنی مدت تک، قوم کی بد حالی اور ایذا رسانی پہ صبر کرتے رہے اور بد دعا نہ فرمائی۔ اس مدت کے بعد اگر وہ از خود بھی بد دعا فرماتے تو اس کو بے رحمی نہیں کہہ سکتے تھے چہ جائیکہ انھوں نے خود بد دعا نہیں فرمائی بلکہ جب ان کو وحی سے معلوم ہو گیا کہ اب ان میں سے کوئی ایمان نہ لائیگا اور ان کی تقدیر میں کفر ہی پر خاتمہ لکھا ہے اس وقت دعا فرمائی۔ بتلایئے جب ایک قوم کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے تو اس وقت ان کا باقی رہنا بہتر ہے یا ہلاک ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی بقا میں کچھ فائدہ نہیں بلکہ اندیشہ فساد ہے کہ یہ دوسروں کو بھی غارت کریں گے۔ اس وقت ان پر بد دعا کرنا بے رحمی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں رحم ہے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی بد دعا میں اس بات کو ظاہر فرما دیا تھا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (خداوندا اگر آپ اُن کو زندہ چھوڑیں گے تو یہ آپ کے دوسرے بندوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور کافر فاجر کے سوا کسی کو نہ جنیں گے) اور یہ بات نوح علیہ السلام نے اپنے قیاس سے نہیں فرمائی بلکہ وحی سے ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب

ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی بھی ایماندار نہ ہوگا وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (اور نوحؑ کے پاس وحی بھیجی گئی کہ سوا ان کے جو ایمان لا چکے ہیں اور کوئی تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لاوے گا سو جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں غم نہ کرو)

تو بتلایئے اس حالت میں اگر نوح علیہ السلام ان کے لئے بددعا نہ فرماتے تو اس کا انجام کیا ہوتا، ظاہر ہے کہ اُس وقت تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی مسلمان بہت ہی کم معدودے چند تھے اور کفار کے متعلق معلوم ہوچکا تھا نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ ان کی اولاد میں کوئی مومن ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا کہ سب ایمان دار ہی ہوں گے بلکہ ان میں بھی ایمان دار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونے والے تھے۔ بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہونے والا تھا۔ اب اگر اُس زمانہ کے کافر غرق نہ کئے جاتے اور ان کی اولاد بھی اس وقت موجود ہوتی تو مسلمانوں کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہوجاتا۔

(احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں، جب تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اس قدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آرہا ہے تو دنیا بھر کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا، خصوصاً جبکہ ان کفار کی اولاد میں مسلمان کوئی نہ ہوتا سب کافر ہی ہوتے اس مقدمہ کے ملانے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بددعا کی ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آجاتی اور ان کو جینا محال ہوجاتا ۱۲)

غرض اس سیرت کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے ایسی سخت بددعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے

مگر اس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا کہ ان کی یہ بد دعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل ہے سراسر رحم تھی ورنہ میاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دوبھر ہو جاتا۔ یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست کا مادہ نہ تھا۔ نہ معلوم اس کے پاس کونسی وحی آگئی تھی (یا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چہرہ دیکھ کر قیافہ سے پہچان لیا تھا کہ ان میں یہ مادہ ہے اور وہ مادہ نہیں ۱۲) کچھ نہیں اس اعتراض کا منشا صرف یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا اس سے ان حضرت نے یہ استنباط کر لیا کہ ان میں یہ مادہ ہی نہ تھا: حالانکہ عدم ظہور شئے ظہور عدم کو مستلزم نہیں بھلا اگر کسی شخص کو زندگی بھر روپیہ تقسیم کرنے کا موقعہ نہ ملے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں سخاوت کا مادہ نہیں ذرا اس کے ہاتھ میں روپیہ دیکر دیکھو اگر پھر بھی وہ سخاوت نہ کرے اس وقت تم کو اس بات کا حق ہے ورنہ دعوےٰ بلا دلیل ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر سلطنت کا موقعہ ہی نہ ملا تو اس سے ان کا تمدن و سیاست سے خالی ہونا کیسے لازم آگیا اور تم نے کیونکر سمجھ لیا کہ ان میں انتظامی قابلیت نہیں یہ بات تو جب چل سکتی تھی کہ ان کو سلطنت کا موقعہ ملتا اور پھر انتظام نہ کر سکتے۔ پس اس شخص کا اعتراض تو لغو ہو گیا۔

اب میں ثابت کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست اور انتظامی قابلیت بدرجہ کمال موجود ہے گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ فِیْکُمْ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ عَدْلًا مُقْسِطًا (اوکما قال) تمہارا کیا حال ہوگا اس وقت جبکہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام تمہارے اندر (آسمان سے) نازل ہو کر آویں گے۔ عادل و منصف ہو کر حکومت کریں گے

تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سے مسرت ظاہر فرمائی ہے جبکہ عیسٰی علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے اور آپ ان کے متعلق عدل و اقساط کی خبر دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ عدل و انصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہوسکتا، عدل وہی کر سکتا ہے جس میں سیاست کا مادہ بدرجہ کمال موجود ہو۔

نیز احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس وقت بہت امن و امان اور خیر و برکت ہوگی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عیسٰی علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے، اگر ان میں فی نفسہ یہ مادہ موجود نہیں تو اس وقت کیونکر سلطنت کا انتظام کریں گے۔ پس معلوم ہوا کہ اس شخص نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے وہ نہایت لغو ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ثابت کرنے کا یہ کونسا طریقہ ہے کہ آپ کے بھائیوں میں نقص نکالا جائے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہوسکتے ہیں۔ یاد رکھو انبیاء علیہم السلام سب کامل ہیں ان میں ناقص کوئی نہیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکمل ہیں تفاضل بین الانبیاء (انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت دینے) سے اسی واسطے منع کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں۔

الغرض انبیاء علیہم السلام کے مذاق باہم مختلف ہیں مگر کامل سب ہیں اور ہر ایک کا مذاق خدا تعالےٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ اسی طرح صوفیہ نے تفاضل بین الاولیاء (اولیاء کرام کے درمیان فضیلت دینے) سے بھی منع کیا ہے کیونکہ اولیاء اللہ بھی سب مقبول ہیں اور جس کا جو مذاق ہے وہ خدا تعالےٰ کو پسند ہے، ان میں بھی باہم تفضیل کا کسی کو حق نہیں کمالات سے خالی کوئی ولی نہیں یہ اور بات ہے کہ کسی کمال سے حق تعالےٰ نے کام لے لیا اور کسی کمال کو

مخفی رکھا اس سے کام نہیں لیا کسی کو صاحب ارشاد بنا دیا اس سے ہدایت خلق کا کام لیا کسی کو صاحب ارشاد نہیں بنایا اسے گم نام رکھا مگر قابلیت ارشاد سے وہ بھی خالی نہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین کے لئے تو سلطنت تجویز کرتے ہیں اور اپنی زندگی میں بعض لوگوں سے یہ فرماتے ہیں کہ اگر میں نہ ملوں تو اس معاملہ کو ابوبکر (رضی اللہ تعالےٰ عنہ) کے پاس لانا وہ فیصلہ کر دیں گے (وغیرہ وغیرہ)

اور حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یَا اَبَا ذَرٍّ اِنِّیْ اُرٰیکَ ضَعِیْفًا وَّ اِنِّیْ اُحِبُّکَ وَاِنِّیْ اُحِبُّ لِنَفْسِکَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِیْ لَا تَفِیْضِیَنَّ بَیْنَ اِثْنَیْنِ وَلَا تَلِیَنَّ مَالَ یَتِیْمٍ (اوکما قال)

(اے ابوذر میں تم کو کمزور دیکھتا ہوں اور تمہارے لئے اور تمہارے نفس کے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے نفس کے لئے پسند کرتا ہوں نہ دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرنا نہ مال یتیم کا ولی بننا)

ان کو دو آدمیوں کے درمیان بھی فیصلہ کرنے سے منع فرماتے ہیں اور مال یتیم کی حفاظت سے روکتے ہیں اور حضرات شیخین کے تمام دنیا کے قضایا کا فیصلہ سپرد فرماتے ہیں تو کیا حضرت ابوذر ناقص تھے، کیا ان میں قوت فیصلہ نہ تھی یا وہ مال یتیم کی حفاظت نہ کر سکتے تھے۔ کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کیونکہ جس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھ لیا ہو اور آپ کی صحبت میں رہا ہو وہ ناقص نہیں رہ سکتا خصوص جس شخص سے آپ کو محبت ہو وہ ناقص رہے ایسا نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی آپ حضرات شیخین سے جو کام لیتے ہیں حضرت ابوذر سے وہ کام نہیں لیتے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صاف فرما دیا ہے اِنِّیْ اُرٰیکَ ضَعِیْفًا کہ میں تم کو ضعیف پاتا ہوں اس لئے آپؐ نے ان کو قضا اور تولیت مال یتیم سے منع فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) میں نقص تھا اور ان میں

قضایا تولیت مال یتیم کا مادہ ہی نہ تھا میں کہتا ہوں کہ ضعف سے نقص لازم نہیں آتا، دیکھو بچہ ضعیف تو ہوتا ہے کہ بالغ کی برابر اس کے اعضاء میں قوت نہیں ہوتی لیکن اگر وہ تام الاعضاء ہے تو اسے ناقص نہیں کہا جا سکتا۔ ناقص وہ ہے جس کے آنکھ نہ ہو یا ہاتھ کٹا ہوا ہو یا پیر سے لنگڑا ہو۔ لیکن جو بچہ تندرست ہو اور اس کے سب اعضاء سالم ہوں ان سے ناقص نہیں کہہ سکتے بلکہ اپنی ذات کے لحاظ سے وہ کامل ہی کہلائے گا۔ گو ضعیف ضرور ہے۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ضعیف فرمانے سے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالے عنہ کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا اگر وہ ناقص ہوتے تو آپ ان کو فقید فرماتے (یعنی فقید القوی) یا فقیر فرماتے مگر آپ تو ضعیف فرماتے ہیں پھر اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالے عنہ میں استعداد قضاء و قابلیت تولیت یتیم نہ تھی۔

دیکھیے محققین کا مذہب ہے کہ ایمان، زیادت و نقص کو قبول نہیں کرتا اور شدت و ضعف کو قبول کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضعف کا مقابل شدت ہے نہ کہ زیادت نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ضعف اور نقص ایک نہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے۔ پس حضرات صحابہ میں زائد و ناقص کوئی نہیں بلکہ سب کامل ہیں اور جو کمالات حضرات شیخین میں تھے وہ ہر صحابی کے اندر مجتمع تھے البتہ شدید و ضعیف کا فرق ضرور ہے۔ اگر حضرت ابوذر رضی اللہ تعالے عنہ میں ان امور کی قابلیت ہی نہ ہوتی تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو ان سے منع فرمانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نہ رسم پرست تھے نہ جاہل تھے اگر ان میں ان کاموں کی قابلیت نہ ہوتی تو وہ خود ہی یہ کام نہ کرتے کیونکہ عدم قابلیت کے ساتھ کسی کام میں ہاتھ ڈالنا یا تو جہالت سے ہوتا ہے کہ اپنی نا قابلیت کی خبر ہی نہ ہو یا رسم پرستی سے ہوتا ہے کہ اپنی نا قابلیت کا علم ہے مگر انکار کرنے میں ہیٹی سمجھتا ہے۔ حضرت ابوذر

ان دونوں باتوں سے منزہ تھے۔ اگر کسی کام کی قابلیت ان میں نہ ہوتی تو وہ ہرگز اس کام کو ہاتھ نہ لگاتے۔ پس حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو منع کرنا اس کی دلیل ہے کہ ان میں قابلیت ضرور تھی مگر آپ نے اس قابلیت سے کام لینا نہیں چاہا بلکہ اِنِّیْ اُرٰیکَ ضَعِیْفًا (میں تم کو ضعیف پاتا ہوں) فرما کر اس قوت کو ممنوع الاستعمال کر دیا (اور ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ اگر بالفرض حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں قابلیت بھی نہ ہوتی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے قضاء و تولیت کا کام لینا چاہتے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کے بعد ان میں معاً قابلیت پیدا ہو جاتی کیونکہ آپ کی شان یہ ہے ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اس کا کہنا خدا کا کہنا ہو وے اگرچہ بندہ کے زبان سے نکلا ہو)

اور حق تعالیٰ کی شان یہ ہے ؎

داد او را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرط قابلیت داد اوست

(اس کے دین کے لئے قابلیت شرط نہیں ہے۔ بلکہ قابلیت کی شرط اس کی داد و دہش ہے)

مگر آپؐ نے ان سے یہ کام لینا چاہا ہی نہیں ۱۲)

اسی کو میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ سالکین کو اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرنا چاہیے حق تعالیٰ جو چاہیں گے تمہارے لئے خود تجویز فرما دیں گے۔ بعض سالکین اپنے لئے مشیخت تجویز کرتے ہیں اور ذکر و شغل سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی وقت شیخ و مقتدا بن کر مخلوق کی اصلاح کریں گے۔ یاد رکھو جس کیلئے ابھی تک شیخ نے مشیخت تجویز نہیں کی اس کے لئے اس کا خیال کرنا بھی گناہ ہے

جیسا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالٰی عنہ کے لئے قضاء بین الاثنین اور تولیت مال یتیم گناہ تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے تجویز نہیں فرمایا تھا اسی لئے سالک کو شیخ کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہونا چاہیئے اگر وہ مستحبات سے بھی منع کرے تو انقیاد و اطاعت ہی کرنا چاہیئے۔ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں مشائخ پر کہ یہ مستحبات سے روکتے ہیں مگر وہ کریں تاویل حضرت ابوذر کے قصہ میں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو قضاء و تولیت مال یتیم سے منع فرمایا حالانکہ قضاء فرض کفایہ ہے اور تولیت مال یتیم بھی جبکہ اس کا حق ادا کر سکتا ہو اور یقیناً حضرت ابوذر اگر کسی یتیم کے مال کی حفاظت کرتے تو ایسی احتیاط سے کرتے جس کی حد نہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرمادیا پھر مشائخ پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے اگر وہ کسی کو روک دیں کہ تم اصلاح خلق اور نفع رسانی مخلوق کا وسوسہ نہ لاؤ۔

اور سنئے جنگ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو تو حکم دیا جہاد کا کہ صف بندی کر کے کفار کا مقابلہ کریں تلواریں چلائیں اور ایک جماعت کو حکم دیا کہ مورچہ پر خاموش بیٹھے رہیں وہاں سے ہرگز نہ ہٹیں اور لڑائی میں شریک نہ ہوں ہاتھ تک نہ ہلائیں گویا ظاہر میں ان کو جہاد سے روک دیا مگر حقیقت میں ان کا یہی جہاد تھا۔ اس جماعت کے لئے میدان میں آکر تلوار چلانا گناہ تھا چنانچہ جنگ احد میں جو فتح کے بعد شکست ہوئی حق تعالٰی نے اس کا ایک سبب یہ بھی بتلایا ہے کہ اس مورچہ والی جماعت نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی اس لئے ہم نے فتح کے بعد تم کو شکست دیدی وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ○ (اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دلخواہ بات دکھادی تھی)

ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہم جہاد میں شریک نہیں ہوئے ہمیں بھی کچھ کرنا چاہیئے اس لئے بعضے مورچہ سے ہٹ کر میدان میں آگئے اور مال غنیمت پر قبضہ کرنے لگے مگر

یہ ان کے لئے گناہ شمار ہوا گو دوسروں کے حق میں بڑا کام تھا مورچہ والوں کے لئے یہی جہاد تھا کہ حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں بٹھلا دیا تھا وہیں چپ چاپ بیٹھے رہتے وہ اس خاموشی ہی میں جہاد والوں کی برابر تھے یہاں سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ ترقی کا مدار اعمال ظاہرہ کی زیادتی پر نہیں بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اعمال ظاہرہ کم کرتے ہیں مگر ان کی ترقی ہوتی جاتی ہے کیونکہ ان کے اعمال باطنہ زیادہ ہوتے ہیں جیسے یہ مورچہ والے بظاہر کچھ نہیں کر رہے تھے مگر ثواب میں جہاد کرنے والوں کے برابر تھے اسی طرح صوفیہ میں ایک جماعت قلندر کہلاتی ہے وہ ظاہر میں فرائض و واجبات کے سوا کچھ زیادہ کام نہیں کرتے مگر برابر ان کی ترقی ہوتی رہتی ہے کیونکہ اعمال باطنہ ان کے زیادہ ہوتے ہیں وہ ہر وقت تفکر اور تدبر میں رہتے ہیں قلب کو خدا تعالیٰ سے مشغول رکھتے ہیں اس لئے برابر ترقی میں رہتے ہیں اسی طرح بعض لوگ صاحب ارشاد نہیں ہوتے ان کا یہ مذاق ہوتا ہے ؎

احمد تو عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کار

دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام محبوب کا دیوانہ ہو سلسلہ ہو یا نہ ہو)

ظاہر میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے فیض تو ہوا ہی نہیں یہ کیسے بزرگ ہیں مگر باطن میں وہ حق تعالیٰ کے ایسے مقرب ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ صاحب ارشاد بھی ایسے مقرب نہیں ہوتے اس لئے سالک کا مذاق عاشقانہ ہونا چاہیئے اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرے کیسی مشیخت کیسا سلسلہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مرید کسی شیخ کی خدمت میں برسوں ذکر و شغل کرتا رہا مگر نفع نہ ہوتا تھا راستہ کھلتا ہی نہ تھا، شیخ سے شکایت کرتا وہ ذکر و شغل میں کچھ ترمیم یا اضافہ کر دیتے جب کسی طرح اس کو نفع نہ ہوا اور شیخ بھی تدبیر کرتے کرتے تھک گئے تو ایک دن انھوں نے مرید سے پوچھا کہ میاں یہ تو بتلاؤ

ذکروشغل سے تمہاری نیت کیا ہے کہنے لگا میری نیت یہ ہے کہ میں اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔ شیخ نے فرمایا کہ یہی چور گھسا ہوا ہے جس نے سارے ذکر کو برباد کر رکھا ہے۔ اس خیال سے توبہ کر تو تو شرک میں میں مبتلا ہے ؎

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　تا راہ بیں نباشی تو کے راہبر شوی

درمکتب حقائق پیش ادیب عشق　　ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(اے بے خبر کوشش کر کہ تو خبردار ہو جائے جب تک راستہ کا دیکھنے والا نہ ہوگا راہبر نہیں بن سکتا ادیب عشق کے سامنے حقائق کے مدرسہ میں اے لڑکے کوشش کر کہ کسی باپ یعنی شیخ بھی بن جائے گا)

زمانہ پسری ہی میں باپ بننے لگے صاحب پہلے بیٹا تو بن لو بعد ہی میں باپ بننے کا خیال کرنا یہ کیا کہ بیٹا بننے سے پہلے ہی باپ بننے لگے اس لئے میں بار بار کہتا ہوں کہ سالکین کے لئے خیال مشیخت گناہ اور سدراہ ہے تم ہرگز اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرو بس تفویض کر دو حضرت حق کے اور حضرت حق کے سپرد کرنا یہ ہے کہ ان کے نائبین کے ہاتھ میں اپنے کو سپرد کر دو کہ وہ جو تصرف تمہارے اندر کریں اس سے راضی رہو جو وہ تجویز کر دیں اس کے خلاف کا وسوسہ نہ لاؤ ؎

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست　　نائب ست و دست او دست خداست

گر خضر در بحر کشتی را شکست　　صد درستی در شکست خضر ہست

(جو جان دیتا ہے اگر وہ جان لیلے روا ہے خدا کا نائب ہے اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ اگر خضر علیہ السلام نے دریا میں کشتی کو توڑ ڈالا تھا مگر واقع میں خضر علیہ السلام کے توڑنے میں سو درستی یعنی حفاظت تھی)

صبر کن در کار خضر اے بے نفاق
تا نگوید خضر رو ہذا فراق

(خضر یعنی مرشد کامل کے افعال پر صبر و سکوت کرتا کہ خضر یوں نہ کہدیں کہ جاؤ ہماری تمہاری جدائی ہے)

اور فرماتے ہیں ؎

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو (جب پیر بنالو ہمہ تن تسلیم بن جاؤ)

مطبع والوں نے اس کو پیرہن لکھدیا ہے جس کا مطلب شاید کوئی یہ سمجھا ہو کہ جب شیخ سے پیرہن (یعنی خرقہ خلافت) مل جائے اس وقت اس کی اطاعت کرو اس کے بغیر اطاعت نہ کرنا واہیات۔ یہ لفظ پیرہن نہیں بلکہ پیر الگ لفظ ہے اور ہیں بمعنی خبردار الگ لفظ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو ۔۔۔ ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو

ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ ۔۔۔ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(جب تم پیر بنالو تو یاد رکھو کہ ہمہ تن تسلیم بن جاؤ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح زیر حکم خضر علیہ السلام چلنا)

تم کو کیا خبر کہ تم کو کیا عہدہ ملنا والا ہے بس تم اپنے کام میں لگو جو عہدہ دینا ہوگا وہ خود دیدیں گے (اور حق تعالےٰ کا دیتا یہ ہے کہ وہ اپنے نائبین کے ہاتھ سے کوئی عہدہ دلوادیں گے خواہ مشیخت ہو یا گمنامی ۱۲) بعض اولیا ایسے بھی ہیں کہ صاحب ارشاد نہیں ہیں مگر ان کی حالت یہ ہوگی۔ اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِی اللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنَ الْمِسْكِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ وَالصِّدِّيْقُوْنَ (اوکما قال) حدیث میں ہے کہ متحابین فی اللہ قیامت کے دن منابر مسک پر بے فکر بیٹھے ہوں گے ان کی اس حالت پر انبیاء و صدیقین کو رشک آئے گا اھ کہ یہ بڑے بے فکر ہیں علماء قشر تو تھک گئے اس کی تفسیر میں لگے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے مگر حقیقت تک نہ پہونچے وہ نہ بتلا سکے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اسی لئے عارف شیرازی ایسے مدارس سے برارت ظاہر کرتے ہیں ؎

از قال و قیل مدرسہ حالے دلم گرفت
(مدرسہ کی قیل و قال سے کسی حال نے میرے دل پر اثر نہیں کیا)

حالے امالہ ہے حالا کا اور حالا مخفف ہے حالاً منصوب کا ؂

از قال و قیل مدرسہ حالے دلم گرفت
یک چند نیز خدمت معشوق و مے کنم
(مدرسہ کی قیل و قال دل گرفتہ نہیں ہوا چندن محبوب اور عشق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں)

قال و قیل مدرسہ سے دل گرفتہ ہونے کا سبب یہی ہے کہ وہاں حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا بلکہ لفظوں ہی کے پھیر میں رہتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدارس بے کار ہیں ہرگز نہیں ان کی بھی ضرورت ہے اور ان کے بعد خانقاہ میں آنے کی بھی ضرورت ہے۔ نہ تنہا مدرسہ کافی ہے نہ تنہا خانقاہ کافی ہے۔ مدرسہ بمنزلہ وضو کے ہے اور خانقاہ بمنزلہ نماز کے ہے تو جو صوفی مدرسہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی نماز بلا وضو پڑھ جائے تو وہ صوفی نہ ہوگا بلکہ صافی ہوگا مگر وہ صافی نہیں جس کے متعلق کہتے ہیں ؂

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے
(یعنی صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے، پختگی مجاہدات کے بعد ہوتی ہے)

بلکہ وہ صافی جس سے برتن اور پتیلیاں صاف کیا کرتے ہیں اور جو عالم مدرسہ سے فارغ ہو کر خانقاہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص وضو کر کے اسی پر قناعت کر لے اور نماز نہ پڑھے تو وہ اس کا مصداق ہے ؂

اَیُّھَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَۃِ
کُلُّ مَا حَصَّلْتُمُوْہُ وَسْوَسَۃ
(مدرسہ والو! جو کچھ مدرسہ میں علم لفظی حاصل کیا وہ وسوسہ تھا)

کیونکہ لفظی اورکتابی علم سے حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا پس خانقاہ بلا مدرسہ کے خانقاہ نہیں خوامخواہ ہے اور مدرسہ بلا خانقاہ کے درس سے مشتق نہیں بلکہ دروس سے مشتق ہے بمعنی مٹنے کے تو وہ مٹانے کے قابل ہے۔ غرض علماء قشر تھک گئے اوران کو پتہ نہ چلا کہ متحابین فی اللہ کا مصداق اس حدیث میں کون لوگ ہیں محققین عرفاء نے پتہ لگالیا یہ بڑے غماز ہیں انھوں نے کہا یہ وہ اولیا ہیں جو صاحب ارشاد نہیں ان کے ذمہ کسی کی اصلاح و تربیت نہ تھی اس لئے قیامت میں یہ بے فکر ہوں گے اور انبیاء علیہم السلام اولیاء اصحاب ارشاد کو اپنے متعلقین کا فکر ہوگا تربیت و تبلیغ کے متعلق حساب کا اندیشہ ہوگا اس لئے وہ پریشانی میں ہوں گے اوران لوگوں کی بےفکری پر غبطہ کریں گے کہ کاش آج ہم بھی ایسے ہی ہوتے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے افضل ہوں کیونکہ تحصیلدار کو دائسرائے کے سامنے جاتے ہوئے بڑا فکر ہوتا ہے جو ایک مزدور چپراسی کو کبھی نہیں ہوتا اور شاید کسی وقت اپنی ذمہ داری اور پریشانی کو دیکھ کر تحصیلدار یہ تمنا کرے کہ کاش میں چپراسی ہوتا تو کیا اس سے حقیقت میں چپراسی تحصیلدار سے افضل ہو گیا اس عہدہ سے ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ تحصیلداری کا عہدہ باوجود اس ذمہ داری کے چپراسی کی سے بدرجہا افضل ہے کیونکہ یہ شخص سرکاری عہدہ دار ہے اور چپراسی کو سرکاری دربار سے وہ تعلق نہیں جو اس کو ہے۔

اور یہیں سے حقیقت منکشف ہوگئی اس حدیث کی اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ وَ اِنِّيْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کبھی میرے دل پر بھی بادل چھا جاتا ہے اور میں اس کی وجہ سے دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں علماء قشر اس کی حقیقت نہ سمجھ سکے انھوں نے کہدیا کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے اور ہم نہیں جانتے کہ یہ غین کیا چیز ہے اور یہ طریقہ اسلم ہے کہ جس بات کی

حقیقت معلوم نہ ہو اس سے سکوت کیا جائے مگر کسی کو معلوم ہو جائے تو اس کے بیان کرنے میں بھی مضائقہ نہیں چنانچہ بہت سی آیات متشابہات میں متاخرین نے مناسب توجیہات بیان کی ہیں جیسے یَدُ اللہِ وَ وَجْهُهُ اللہِ وَ اَمْثَالُهَا (اللہ کا ہاتھ اللہ کا چہرا اور مثل اُن کے) اسی طرح اگر کسی کی سمجھ میں غین کی حقیقت آجائے تو نصوص کے خلاف بھی نہ ہو اور شانِ نبوت کے بھی خلاف نہ ہو تو اس کا بیان کر دینا مذموم نہ ہوگا۔ محققین نے اس کا مطلب سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ منشا پردہ جمال حق کی دو صورتیں ہیں ایک حضور بلا واسطہ (جو مقام فنا میں ہوا کرتا ہے ۱۲) دوسرے حضور بواسطہ (جو مقام بقا میں ہوتا ہے ۱۲) حضور بلا واسطہ تو یہ ہے کہ سوائے حضرت حق کے اور کسی چیز کی طرف اصلا التفات نہ ہو ہر دم خدا تعالیٰ کی طرف بدون کسی واسطہ کے متوجہ رہے (مقام فنا میں یہی حضور غالب ہوتا ہے ۱۲) اور حضور بواسطہ یہ ہے کہ مخلوق کی طرف بھی توجہ والتفات ہو بلکہ مخلوق آئینہ بن جائے رویت جمال الٰہی کے لئے (مقام بقا میں یہی صورت حضور ہوتی ہے ۱۲) تو پہلی صورت کی نظیر یہ ہے کہ کوئی شخص محبوب کو بدون کسی حجاب کے دیکھتا رہے کہ اس کا چہرہ عاشق کے سامنے ہو اور دوسری صورت کی نظیر یہ ہے کہ محبوب عاشق سے کہدے کہ مجھ کو مت گھورو بلکہ سامنے جو آئینہ رکھا ہے اس میں سے میری صورت کو دیکھو اس وقت بھی عاشق کی توجہ محبوب ہی کی طرف ہے مگر رویت بواسطہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس دیدار میں اور پہلے دیدار میں فرق ضرور ہے جو بات بلا واسطہ دیکھنے میں ہے وہ آئینہ سے دیکھنے میں کہاں اسی طرح حضور بلا واسطہ (جو مقام فنا میں ہوتا ہے ۱۲) حضور بواسطہ سے (جو مقام بقا میں ہوتا ہے) اکمل والذ ہے سالک کو اس میں زیادہ لذت آتی ہے کیونکہ اُس میں غیر کی طرف اصلا التفات نہیں ہوتا اور حضور بواسطہ میں گو اس کی نظر بالذات حضرت حق ہی پر ہوتی ہے مگر فی الجملہ واسطہ پر بھی نظر ہوتی ہے اور عاشق پر اتنا واسطہ بھی گراں ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام و اہلِ ارشاد کی طبیعت تو یہی چاہتی ہے کہ ہر وقت حضور بلا واسطہ رہے خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلق محبت حق تعالیٰ سے ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ آپ ہر وقت بلا واسطہ مشاہدہ جمالِ حق میں مشغول رہیں مگر آپ کو خدمت ارشاد میں رکھا گیا ہے مخلوق کو فیض پہنچانے کے لئے مامور کیا گیا ہے جس میں گونہ توجہ مخلوق پر بھی کرنا پڑتی ہے گو یہ توجہ الی الخلق توجہ الی الخالق سے آپ کے لئے مانع نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے اس کو اپنے جمال کا آئینہ بنا دیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کی تو بڑی شان ہے اہل اللہ کو جو آپ کے غلامانِ غلام ہیں یہ بات نصیب ہے کہ کوئی چیز ان کو محبوب سے مشغول نہیں کرتی یہ سب کچھ ہے مگر عشق کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کو بلا واسطہ دیکھا جائے بیچ میں آئینہ کا واسطہ بھی کیوں ہو عشق کی تو یہ شان ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیثِ تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

اسی گرانی کو آپ غین سے تعبیر فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ مخلوق کے واسطہ سے توجہ الی المحبوب کرنے میں میرے دل پر بادل سا چھا جاتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ بلا واسطہ مشاہدہ زیادہ لذیذ اور بے غبار ہوتا ہے گو قرب زیادہ اسی میں ہے کہ مخلوق کے واسطہ سے مشاہدہ کیا جائے کیونکہ اس میں محبوب کی اطاعت ہے عاشق کا دل گو یہ چاہتا ہے کہ محبوب کو بدون کسی واسطہ کے دیکھوں مگر جب محبوب کی مرضی یہ ہے کہ مجھ کو آئینہ میں سے دیکھو تو اس وقت اطاعت اسی میں ہے کہ آئینہ کی طرف منہ کر لیا جائے اور اس میں سے محبوب کی صورت دیکھی جائے گو آئینہ کی طرف منہ کرتے ہوئے عاشق کے دل پر نشتر لگتا ہے

مگر وہ یہ کہتا ہے ؎

میل من سوئے وصال ومیل او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میرا میلان وصال کی طرف ہے اور اس (محبوب) کا میلان فراق کی طرف ہے میں نے اپنی مراد کو چھوڑ دیا تاکہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے)

وصال سے مراد حضور بلا واسطہ ہے اور فراق سے حضور بواسطہ اور عاشق کی طبیعت فطری طور پر پہلی صورت کو چاہتی ہے مگر وہ رضائے محبوب کے لئے دوسری صورت کو اختیار کرتا ہے اسی لئے مقام فنا سے مقام بقاء کی طرف آنا سالک پر طبعاً گراں ہوتا ہے مگر امر الٰہی کی وجہ سے وہ اس کو خوشی سے قبول کرتا ہے۔ اس کی دوسری مثال اس سے واضح تر یہ ہے کہ ایک عاشق محبوب کے سامنے بیٹھا ہوا اس کے چہرہ کو دیکھ رہا ہو تھوڑی دیر کے بعد محبوب امر کرے کہ ذرا بازار سے ہمارے واسطے آم لے آؤ تو بازار جانے میں گو فی الجملہ غیبت ہو گی مگر بتلایئے قرب زیادہ کس صورت میں ہے آیا اطاعت و قرب اس میں ہے کہ فوراً اٹھ کر بازار چلا جائے اور آموں کی تلاش میں مارا مارا پھرے یا یہ کہ وہیں بیٹھا رہے اور محبوب سے کہے کہ حضور مجھے تو اپنا جمال دیکھنے دیجئے یہ کام کسی اور سے لے لیجئے۔ یقیناً ہر عاقل کہے گا کہ اس وقت اس کا بازار جانا ہی موجب قرب ہے۔ اگر یہ عاشق صادق ہے تو اس غیبت کو گوارا کرے گا گو طبعاً اس پر گراں ہے اور یہ کہے گا ؎

أُرِيدُ وِصَالَهُ وَيُرِيدُ هَجْرِي
فَأَتْرُكُ مَا أُرِيدُ لِمَا يُرِيدُ

(میں محبوب کے وصال کا خواہاں ہوں اور وہ ہجر کا خواہاں سو میں نے اپنی خواہش کو اس کی خواہش کی وجہ سے ترک کر دیا۔)

اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ عاشق نہیں بلکہ عاسق ہے فاسق تو نہ کہنا چاہیئے اور

کیونکہ عاشق صادق فاسق نہیں ہوا کرتا۔ اور جو فاسق ہوتے ہیں وہ عاشق نہیں بلکہ معاشق ہیں عشق کے ساتھ کبھی برا خیال آہی نہیں سکتا ہیبت محبوب ان وساوس سے مانع ہو جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق ہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

رجو عشق رنگ و روپ کی وجہ سے ہوتا ہے وہ انجام کار عشق نہیں شرم ندامت ہوتی ہے)

جس عشق میں فسق کا خیال آئے وہ نفس کی شرارت ہے۔ بہر حال قرب زیادہ اس میں ہے کہ جب محبوب عاشق کو اپنے پاس سے اٹھا کر کسی کام میں لگا دے تو اس کام میں لگ جاوے اگر وہ عاشق صادق ہے تو اس وقت بھی محبوب سے غافل نہ ہوگا بلکہ اس کام کو مرآۃ جمال بنالے گا اور یقیناً اس وقت وہ محبوب کی نظر میں زیادہ مقرب ہے کیونکہ محض محبوب کی رضا کے لئے اس نے اس کام میں مشغولی اختیار کی ہے ورنہ اس کی طبیعت کا تقاضا تو کچھ اور ہی تھا یہی حالت ہوتی ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ارشاد خلق میں کہ وہ اس خدمت میں حق تعالٰے کی رضا کے لئے مشغول ہوتے ہیں جس میں مخلوق پر توجہ بھی کرنا پڑتی ہے۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم غین فرماتے ہیں۔ چونکہ عارفین پر یہ حالات گذرتے ہیں اور وہ مقامات فناء و بقاء کا ذوق رکھتے ہیں اس لئے وہ اس غین کو سمجھ گئے علماء ظاہر اول تو اس کو سمجھتے نہیں اور جو کچھ سمجھتے بھی ہیں تو نہ معلوم کہاں کہاں پہنچتے ہیں رکوئی یہ کہتا ہے کہ انبیاء سے گناہ تو نہیں ہوتا مگر زلت کا صدور ہو سکتا ہے یہ غین اسی کا اثر تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مناسب نہیں کیونکہ آپ سے کسی زلت کا صدور عمداً نہیں ہوا بلکہ اگر ہوا بھی ہو تو خطاء اجتہادی سے ہوا جس سے قلب پر غین طاری نہ ہونا چاہیئے کیونکہ خطاء اجتہادی سے قرب میں کمی نہیں ہوتی بلکہ ترقی

ہی ہوتی ہے بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ یہ غین وہ گرانی ہے جو توجہ الی الخلق سے آپ کے قلب پر ہوتی تھی اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر اس سے استغفار کرنے کی کیا ضرورت تھی یہ تو کوئی گناہ کی بات نہیں جواب یہ ہے کہ وہ جو غیبت واقع ہوگئی تھی اس کا تدارک اس حضور بلا واسطہ سے فرماتے تھے اور ہرچند کہ یہ تدارک ہر ذکر سے ہو سکتا تھا مگر وہ غیبت چونکہ صورۃً بُعد تھا اس لئے استغفار سے اس کا تدارک مناسب تھا۔

(اور ایک جواب یہ ہے کہ ہرچند یہ گرانی طبعی ہے جس میں عاشق کا دل مجبور ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو سید العاشقین ہیں اس طبعی گرانی سے بھی استغفار کرتے تھے۔ اور آپ چاہتے تھے کہ جب مجکو توجہ الی الخلق کا امر ہے تو اب مجکو حضور بلا واسطہ کی طرف میلان اور اس حضور بواسطہ سے گرانی کیوں ہو اس لئے آپ استغفار کرتے تھے اور حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے تھے ۱۲ جامع)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے لئے مشیخت وغیرہ کچھ تجویز نہ کرو بعض دفعہ حق تعالیٰ کسی کو صاحب ارشاد نہیں بناتے اور اپنا مقرب بنا لیتے ہیں اور اصل مقصود قرب حق ہی ہے جو صاحب ارشاد ہونے پر موقوف نہیں سو تم اپنے لئے اس کو کیوں تجویز کرتے ہو بس خدا کے سپرد کرو۔

نیز میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو تعلقات شرعاً مطلوب نہیں ہیں وہ عذاب ہیں ایسے تعلقات کے ساتھ حیات طیبہ حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ وہ تو معیشۃ ضنک (روزی تنگ) ہے ان تعلقات کو قطع کرنا چاہیئے اور ان کا قطع کرنا مجاہدہ ہے جو کہ فنا کہلاتا ہے اس کے بعد رضائے حق نصیب ہوتی ہے وہ بقا ہے اور یہی حقیقت ہے قربانی کی اور ہرچند کہ یہ فنا و بقا ہر عمل میں ظاہر ہوتا ہے مگر قربانی میں اس کا ظہور زیادہ ہے اس لئے قربانی سے مجاہدہ کا تعلق ظاہر ہو گیا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مجاہدہ مقصودہ بالبیان جو باطن اضحیہ ہے تو یہ وہ باطن نہیں جو ظاہر کے ساتھ مقید ہو بلکہ یہ وہ باطن ہے جو ظاہر کے لئے لازم

کیونکہ اس مطلق مجاہدہ کا حصول قربانی ہی پر موقوف نہیں بلکہ سب اعمال میں اس کا حصول ہوتا ہے البتہ یہ مجاہدہ لازم اضحیہ ضرور ہے کیونکہ اس عمل پر مجاہدہ کا ترتب ظاہر ہے باقی جو مجاہدہ کہ مخصوص بالاضحیہ ہے اور وہ بھی ایک قسم ہے باطن اضحیہ کی جو کہ بدون اضحیہ کے متحقق نہیں ہو سکتی وہ اس وقت مقصود بالبیان نہیں۔

اب میں اس قصہ کو بیان کرتا ہوں جس کا ذکر اس جگہ ان آیات میں کیا گیا ہے۔ پھر اس کی تطبیق مضمون مجاہدہ پر بیان کروں گا۔ قصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص تھا اس کے وارثوں نے طمع مال میں اس کو قتل کر دیا تھا کہ جلدی سے اس کے مال پر قبضہ ہو جائے قتل کر کے پھر خود ہی خون کے مدعی ہو گئے جب قاتل خود مدعی ہو تو قاتل کا پتہ کون دے۔ اس لئے سب کی رائے ہوئی کہ اس قصہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لیجایا جائے وہ وحی وغیرہ سے قاتل کا پتہ بتلا دیں گے۔ چنانچہ سب لوگ آپ کے پاس آئے آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا تو وہاں سے ایک جانور ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ (جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک بیل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) بقرہ سے خاص گائے مراد نہیں اور نہ اس میں تا رتانیث کے لئے ہے بلکہ تا روحدت کے لئے ہے اور بقرہ گائے بیل دونوں کو عام ہے اور بظاہر اس جگہ بیل ہی مراد ہے کیونکہ آگے اس کی صفت میں یہ بات مذکور ہے لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ کہ وہ کام کاج میں پامال نہ ہو زمین کو جوتتا اور کھیتی کو پانی نہ دیتا ہو اور یہ شان بیل کی ہوتی ہے۔ گائے سے ہل نہیں چلاتے نہ اس سے کھیتی کو پانی دیتے ہیں ہاں اس زمانہ میں اگر گائے سے بھی یہ کام لیا جاتا ہو تو خیر۔ ممکن ہے اس وقت گائیں مضبوط ہوتی ہوں جو بیل کا کام دیتی ہوں جیسے بعض لوگ عورتوں سے

چور مروایا کرتے ہیں بعض عورتیں اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ مردوں کی طرح چور کو مار لیتی ہیں۔ اور جس طرح بعض عورتیں بہادر ہوتی ہیں ایسے ہی بعض مرد عورت ہوتے ہیں۔

لکھنؤ کے ایک شاہزادے بیٹھے ہوئے تھے چھت سے سانپ گرا تو آپ فرماتے ہیں ارے کوئی مردوا ہے۔ کسی نے کہا اور حضور آپ بھی تو ماشاء اللہ مرد ہیں تو بولے واللہ خوب یاد دلایا۔ لاٹھی لانا' پھر نہ معلوم وہ سانپ ان سے مرا بھی یا نہیں مگر آپ ایسے مرد تھے کہ دوسرے کے یاد دلانے سے اپنا مرد ہونا معلوم ہوا۔

غرض ایک جانور کے ذبح کا حکم ہوا جو یا گائے تھی یا بیل تھا اب میں اسکی تذکیر و تانیث کی کہاں تک رعایت کروں' جیسے ایک بنئے نے رعائت کی تھی۔ ایک ہیجڑے نے بنئے کی دکان پر سے مُرمُرے اٹھا کر کھانا شروع کئے تو اب وہ اس سے کہتا ہے میرے تمام مُرمُرے کھا گیا کھا گئی میاں کے ایسی دھول ماروں گا کہ بی بی کی پگڑی وہاں جا کر گرے گی۔ ظالم نے اپنے کلام میں ہیجڑے کے دونوں صفات کی رعایت کی مرد ہونے کی بھی اور عورت ہونے کی بھی کبھی اس کو میاں کہا کبھی بی بی تو میں کہاں تک اس کی رعایت کروں کہ کبھی مذکر کا صیغہ استعمال کروں کبھی مؤنث کا بس میں تو سیدھا بقرہ کہوں گا مگر اس سے عربی کا بقرہ مراد ہوگا اردو کا نہیں۔ شاید آپ کہیں کہ اردو کا بقرہ کیسا تو سنئے۔ ایک بیرسٹر صاحب نے میرٹھ کے ایک مقدمہ میں جو قربانی گاؤ کی متعلق تھا ہندوؤں کی طرف سے دعوے کیا گیا تھا کہ حضور مسلمانوں کے مذہب میں تو بکرے ہی کی قربانی ہے' گائے کی قربانی ہے ہی نہیں۔ گائے تو محض ہندوؤں کے جلانے کو ذبح کرتے ہیں اور دلیل یہ بیان کی کہ دیکھئے جس عید میں قربانی ہوتی ہے اس کا نام ہی بقرعید ہے یعنی بکرے کی عید۔ اس احمق نے یہ سمجھا کہ بقر بکرے کی عربی ہے کاف کو قاف بنا کر بقر کر لیا دیا اردو والوں نے قاف کو کاف

بنا کر بکرا بنا لیا ۱۲)

مسلمانوں کے وکیل نے کہا حضور بس اسی پر فیصلہ ہے عربی لغت منگا کر دیکھ لیا جائے کہ بقر کے معنے گائے کے ہیں یا بکرے کے۔ ایسے عقلاء کی وجہ سے میں نے کہا تھا کہ بقرہ عربی کا مراد ہوگا اردو کا نہیں۔

تو جب بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے آکر قصہ عرض کیا انھوں نے جناب باری سے دعا کی وہاں سے حکم ہوا کہ ایک بقرہ ذبح کرو اور یہ نہیں بتلایا کہ بقرہ ذبح کر لے سے کیا ہوگا قاتل کا پتہ اس سے کیونکہ معلوم ہوگا کیونکہ آقا کو کچھ ضرورت نہیں ہے پوری بات بیان کرنے کی اور اپنے احکام کی علت و حکمت اور غایت بتلانے کی مگر غلام کا ادب یہ ہے کہ چون و چرا نہ کرے جو حکم ہو فوراً بجا لائے اور جتنی بات کہی جائے اس کی جلدی تعمیل کر دے چاہے اس کا فائدہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر بنی اسرائیل نے ایسا نہ کیا وہ چون و چرا میں پڑ گئے حکم کے سنتے ہی نبی پر اعتراض کر دیا۔ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں منشا بنی اسرائیل کی اس غلطی کا یہ ہوا کہ وہ تو قاتل کو دریافت کرنے آئے تھے اور یہاں حکم ہوا ذبح بقرہ کا تو وہ سوچنے لگے کہ سوال و جواب میں جوڑ کیا ہوا ہمیں قاتل کا پتہ پوچھنا تھا اس کا جواب یہ تھا کہ نام بتلا دیتے فلاں ہے یا فلاں یہ بے جوڑ حکم کیسا کہ بقرہ ذبح کرو، یہ تو وہی ہوا مارون گھٹنا پھوٹے آنکھ مگر انھوں نے اپنے اور خداوند تعالیٰ کے تعلق پر نظر نہ کی وہ تو غلام تھے ان کو جوڑ بیجوڑ سے کیا لیتا تھا جو حکم ہوا تھا فوراً تعمیل کر دیتے۔ دیکھئے اگر آپ اپنے نوکر کو حکم دیں کہ حکیم صاحب سے فلاں مرض کے لئے نسخہ لکھوا لاؤ اور وہ نسخہ لکھوا کر لاجس میں شربت بنفشہ اور شیرہ بادام لکھا ہو آقا نسخہ کو دیکھ کر نوکر سے کہے کہ بازار سے ایک آنہ کے کوئلے لے آؤ اور وہ نوکر سوچنے لگے کہ نسخہ میں تو کوئلہ کہیں نہ لکھا تھا یہ نسخہ کو کیا سمجھ گئے مگر وہ خاموش ہو کر چلا گیا اور کوئلے لے آیا پھر آقا نے کہا انگیٹھی اور دیگچی لاؤ اس پر اسے اور حیرت ہوئی کہ نسخہ میں ان چیزوں کا

نہ کرنا تھا مگر اس نے حکم کی تعمیل کی اس کے بعد آقا نے بنفشہ پانی میں ڈال کر انگیٹھی پر رکھا اور کوئلے دھکا کر اسے جوش دیا پھر چھان کر شکر میں قوام کیا پھر ٹھنڈا کر کے بوتل میں بھرا تو اب نوکر کی آنکھیں کھلیں اور وہ سمجھا کہ نسخہ میں جو شربت لکھا تھا اسی کے تیار کرنے کے لئے یہ سب سامان کیا گیا تھا۔ اس نوکر نے شربت تو دیکھا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ اس طرح تیار ہوتا ہے وہ سمجھتا تھا کہ بس شہد کی طرح یہ بھی بنا بنایا آتا ہوگا اس لئے اس کو کوئلوں اور دیگچی کے منگانے سے حیرت ہوئی مگر اخیر میں یہ بات دیکھ کر اپنی خاموشی پر شکر کرتا ہوگا کہ اچھا ہوا میں نے آقا سے کاوش نہ کی ورنہ اس وقت مجھے بہت شرمندہ ہونا پڑتا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ حق تعالٰے حکیم ہے ان کے احکام میں کچھ حکمت ہوگی۔ ہم نہ سمجھیں تو کیا ہے مگر انھوں نے اپنی عقل سے چون و چرا کو دخل دیا یہ خلاف ادب ہے خوب سمجھ لو اول تو انھوں نے ذبح بقرہ کے حکم کو معاذ اللہ اس پر محمول کیا کہ موسیٰ علیہ السّلام ہم سے دل لگی کرتے ہیں یہ نبی کا ادب تھا، بھلا نبی ان سے مسخرہ پن کیوں کرنے لگے تھے اور اگر مزاح کرتے بھی تو اس کے لئے وقت و موقعہ ہوتا ہے یہ کیا موقعہ تھا مزاح کا کہ لوگ تو ایک مقدمہ فیصل کرانے آئیں اور نبی ان سے دل لگی کریں۔ پھر دل لگی بھی اس عنوان سے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً (اللہ تعالٰے تم کو ایک بیل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) خدا تعالٰے کی طرف سے ایک حکم کو منسوب کر کے اگر یہ بھی دل لگی ہو سکتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ معاذ اللہ موسیٰ علیہ السّلام نے خدا تعالٰے کی طرف یہ حکم غلط منسوب کر دیا تھا استغفر اللہ۔ بھلا اس عنوان سے کچھ بھی مزاح کا احتمال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں مگر بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو بیدھڑک کہدیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) موسیٰ علیہ السلام نے لرز کر ڈر کر فرمایا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (نعوذ باللہ جو میں جہالت والوں کا سا کام کروں) بتلا دیا کہ احکام الٰہیہ بیان کرتے ہوئے دل لگی کرنا جہالت ہے اور نبی جہالت سے معصوم ہے

پھر تمہارا اپنے پیغمبر کو ایسی بات کہنا گنوار پن کی دلیل ہے۔ اب ان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ حکم خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے چاہیئے تھا کہ اب دیر نہ کرتے فوراً تعمیل کر دیتے مگر چونکہ ان کو یہ خلجان ہو رہا تھا کہ ذبح بقرہ کو قاتل کے پتہ سے کیا جوڑ ہے۔ اس لئے مختلف خیالات میں پڑ کر متردد ہو گئے اور سوچنے لگے کہ شاید کوئی خاص بقرہ ہوگا جس کو اس کام میں دخل ہوگا۔ اس لئے سوال کیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ط کہنے لگے اے موسیٰ علیہ السلام اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ صاف صاف ہم کو بتلا دیں وہ بقرہ کیا چیز ہے یعنی کیسی ہے۔ مَا هِيَ سے اصطلاح معقول پر سوال مراد نہیں جو سوال حقیقت کے لئے موضوع ہے کیونکہ حقیقت تو ان کو معلوم ہو چکی تھی کہ بقرہ ہے بلکہ مَا هِيَ سے سوال صفات مراد ہے۔ ای ما صفتها (اس کی صفات کیا ہیں) اور محاورات میں مَا ہیَ سے سوال صفات بھی ہوتا ہے یہاں محاورات ہی کے موافق استعمال ہے لوگ غضب کرتے ہیں کہ قرآن مجید کو اصطلاحات فنون حاصل کرلے کے بعد پڑھتے ہیں۔ پھر ان اصطلاحات کو قرآن مجید میں جاری کرتے ہیں جس سے اشکال پڑتا ہے اور خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ بھلا قرآن کریم کو اصطلاحاتِ فنون کا اتباع کس دلیل سے لازم ہے قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت اور محاورات پر سمجھنا چاہیئے اصطلاحات علوم پر منطبق نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ سب اصطلاحات نزول قرآن کے بعد مدون ہوئی ہیں باقی اس کا انکار نہیں کیا جاتا کہ مَا هِيَ (محاورات میں بھی کبھی سوال حقیقت کے لئے آتا ہے مگر اس ہی میں منحصر نہیں۔ سوال کیفیات و صفات کے لئے بھی بہت مستعمل ہے) اور ممکن ہے کہ اس کو سوال عن الماہیۃ پر محمول کر کے کہا جاوے کہ ان لوگوں نے صفات کا سوال مَا ہیَ سے اس لئے کیا ہو کہ اس عجیب بقرہ کے صفات کا مجہول ہونا گویا ان کے ذہن میں خود ذات کا مجہول ہونا تھا وہ یہ سمجھے کہ جس بقرہ کے ذبح کا ہم کو حکم ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے گائے بیلوں کے ساتھ

صرف نام میں شرکت رکھتا ہے اور خواص و کیفیات میں شاید ان سب سے ممتاز ہوگا ۱۲ جامع)

وہاں سے جواب ملا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ (آپ نے یہ فرمایا کہ وہ فرماتے ہیں۔ وہ ایسا بیل ہو نہ بالکل بوڑھا نہ بچہ ہو پٹھا ہو دو عمروں کے درمیان سو اب کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے)

اب ادھر سے بھی تشدد شروع ہوا۔ کیونکہ غلام کا آقا کے حکم میں چون وچرا اور توقف کرنا خلاف ادب ہے جس کی سزا ان کو دی گئی کہ اچھا جب تم ہمارے حکم کو بے جوڑ سمجھتے ہو (کہ اس کو ہمارے سوال سے کچھ ربط نہیں) اور اس لئے بقرہ کے بارہ میں متعجب و متردد ہو کہ شاید کوئی خاص بقرہ ہوگا تو ہم بھی ایسی قیود کا اضافہ کرتے ہیں جن سے تم کو حقیقت نظر آجائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم کسی نوکر سے کہیں کہ بازار سے پانی پینے کا کٹورا خرید لاؤ۔ اس کو چاہیے کہ اس بات کے سنتے ہی حکم کی تعمیل کرے۔ مگر نہیں اب وہ پوچھتا ہے حضور! کتنا بڑا لاؤں، یہ سوال محض لغو ہے کیونکہ پانی پینے کا کٹورا سب جانتے ہیں کتنا بڑا ہوا کرتا ہے۔ مگر اس کی اس کاوش پر کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا ہو جس میں پورا آدھ سیر پانی آتا ہو نہ اس سے زیادہ ہو نہ کم اگر کچھ بھی کم و بیش ہوا تو واپس کر دیں گے۔ لیجئے اب اس کے لئے دن بھر کا دھندا ہو گیا کہ پھرے ٹکریں مارتا ہوا سارے بازار میں۔ اگر وہ سنتے ہی حکم کی تعمیل کر دیتا تو یہ مصیبت نہ اٹھانی پڑتی۔ اسی طرح بنی اسرائیل نے چون وچرا کر کے خود اپنے سر مصیبت دھری ورنہ کوئی سی گائے بیل بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے لَوْ ذَبَحُوْا اَیَّ بَقَرَةٍ اَجْزَا تْهُمْ وَلٰکِنْ شَدَّدُوْا فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (اگر وہ کوئی سا بیل بھی ذبح کر ڈالتے تو ان کو کافی ہوتا لیکن انھوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی ڈال دی) اب ان کے سوال پر یہ قید بڑھائی گئی کہ

وہ بقرہ نہ تو عمر رسیدہ ہو نہ بچہ ہو بلکہ درمیانی عمر کا ہو یہ قید بھی کچھ زیادہ سخت نہ تھی کیونکہ اس شان کے بیل گائے بھی بہت دستیاب ہو سکتے ہیں اور خیر خواہی اور شفقت کے طور پر یہ بھی کہدیا گیا فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ کہ جو کچھ تم کو حکم دیا گیا ہے اس کو کرڈالو۔ اس میں زیادہ کاوش نہ کرو مگر وہ کب ماننے والے تھے ان کو اس صفت سے اور تردد پیدا ہو گیا کہ یہ تو کوئی خاص صفت نہ ہوئی ایسی گائے بیل تو بہت موجود ہیں اس لئے دوبارہ پھر سوال کیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا یعنی ہم کو یہ بھی بتلادیا جائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے وہاں سے رنگ بھی متعین کردیا گیا۔ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ کہ وہ بقرہ زرد رنگ کا ہو جس کی زردی خوب گہری ہو جو اپنے رنگ سے دیکھنے والوں کو خوش کردے ان کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی کیونکہ اس رنگ کی بھی بہت سی گائے بیل تھیں اور وہ لوگ تعیین جزئی کے طالب تھے کہ بس ایسا پتہ نشان بتلادیا جائے جس میں غیر کا احتمال ہی نہ رہے (مثلاً یہ کہدیا جائے کہ وہ گائے یا بیل جو فلاں جنگل میں فلاں کھیت میں ایسے ایسے درخت کے پاس چررہا ہے یا وہ بیل جو فلاں شخص کے پاس ہے وغیرہ وغیرہ ۱۲) اور حق تعالیٰ کی طرف سے جتنی صفات بتلائی گئیں وہ سب صفات کلیہ تھیں اور قاعدہ ہے کہ صفات کلیہ چاہے کتنی ہی ہوں ان سے تعیین نہیں ہوتی احتمال شرکت باقی رہتا ہے جیسے ایک وہمی کا قصہ ہے کہ وہ نمازمیں جب کسی امام کی اقتدا کرتا تو پہلے یہ کہتا کہ اقتدا کرتا ہوں میں اس امام کی جو میرے آگے ہے اس سے بھی تسلی نہ ہوتی تو پھر کہتا کہ جس کا لباس ایسا ہے جس کا یہ نام ہے پھر وہم ہوتا کہ شاید میں نے پہچاننے میں غلطی کی ہو اور اس کا یہ نام نہ ہو تو پھر اس کی کمر میں انگلی چبھو کر کہتا کہ پیچھے اس امام کے۔ تو یہ شخص اس حقیقت کو سمجھا کہ صفات کلیہ سے تعیین نہیں ہوتی تعیین اشارۂ جزئیہ سے ہوتی ہے وہ بھی اس طرح کہ اس پر ہاتھ رکھدیا جائے۔

اسی طرح بنی اسرائیل کو بھی ان صفات سے تسلی نہ ہوئی تو سہ بارہ پھر سوال کیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۝ (کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے اور ہم ان شاء اللہ ضرور ٹھیک سمجھ جائیں گے)

یعنی ایک مرتبہ اور بتلا دیا جائے کہ وہ بقرہ کیسی ہے ان صفات سے تو تعیین نہیں ہوئی بلکہ اس شان کی بہت افراد ہیں جن میں ہم کو تشابہ والتباس ہو رہا ہے ہم متردد ہیں کہ کونسا بقرہ ذبح کریں ایک دفعہ اور وضاحت کر دی جائے ان شاء اللہ ہم راہ پا جائیں گے یعنی سمجھ جائیں گے۔ اس مرتبہ یہ خیر ہوئی کہ ان کے منہ سے ان شاء اللہ نکل گیا۔

حدیث میں آتا ہے وَلَوْ لَمْ يَسْتَثْنُوا لَمَا بُيِّنَ لَهُمْ آخِرَ الْأَبَدِ (او کما قال) یعنی بنی اسرائیل اگر استثناء نہ کرتے (یعنی ان شاء اللہ نہ کہتے) تو قیامت تک ان کو پتہ نہ دیا جاتا مگر ان شاء اللہ کی برکت سے یہ سلسلہ سوالات وجوابات کا جلدی ہی ختم ہو گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۝ (موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہ وہ ہل چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاتی ہے نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جائے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے اب آپ نے پوری بات فرمائی اور اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔) کہ وہ ایسا بقرہ ہے جو کام کاج میں استعمال نہیں کیا گیا نہ زمین کو جوتتا ہے نہ کھیت کو پانی دیتا ہے (اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بقرہ سے بیل مراد ہے) تندرست بدن کا ہے جس پر کوئی داغ اور دھبہ ذرا نہیں مطلب یہ کہ جو جانور کھیتی وغیرہ کے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کے بدن پر جوار کھنے کا

نشان یا مار پیٹ کا نشان ہو جاتا ہے وہ ایسا نہ ہو۔ اب سمجھے کہنے لگے بس اب لائے تم ٹھیک بات۔ یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اخیر میں بھی تو کچھ زیادہ تعیین نہیں ہوئی کیونکہ اس میں بھی تو صفات کلیہ ہی ہیں جزئیات نہیں اور تعیین جزئیات سے ہوتی ہے نہ کلیات سے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر میں استثنار کی برکت سے اُن کے لئے بیان ہو گیا تھا جس سے متبادر یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ وضاحت ہو گئی تھی ۱۲)

حالانکہ بظاہر اب بھی پہلے سے کچھ زیادہ وضاحت نہیں ہوئی جو صفات اخیر میں مذکور ہوئی ہیں اس شان کے بیل بھی بہت ہوتے ہیں تو بات یہ ہے کہ گو تعیین جزئی اب بھی نہیں ہوئی مگر ان کی تسلی اس طرح ہو گئی کہ اُن کے ذہن سے ان شاء اللہ کی برکت سے وہ مقدمات واہیہ نکل گئے اور وہ سمجھ گئے کہ تعیین جزئی ہم کو نہ بتلائی جائے گی اس لئے کاوش فضول ہے یہ کیا تھوڑی برکت ہے ان شاء اللہ کی کہ ان کی فہم درست ہو گئی۔ غرضکہ اس کے بعد جانور کی تلاش ہوئی اور اس قدر گراں قیمت میں ان صفات کا جانور ملا کہ بقرہ کی کھال میں سونا بھر کر دینا پڑا مگر اس گرانی سے بنی اسرائیل گھبرائے نہیں خرید کر ذبح ہی کر دیا۔ حق تعالٰے فرماتے ہیں فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ کہ انھوں نے اس کو ذبح کر دیا اور وہ کرنے والے تھے نہیں۔ یہاں سے ان شاء اللہ کی برکت معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض افعال کی تاثیر ایسی ہوتی ہے جو ظاہر ہو کر رہتی ہے گو محل زیادہ قابل نہ ہو (یعنی فاعل ان افعال کا چاہے کیسا ہی ہو پورا قابل یا کم قابل مگر فعل کا اثر ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے) اور راز اس میں یہ ہے کہ بعض افعال موثر بالخاصہ ہوتے ہیں جیسے بعض ادویہ موثر بالخاصہ ہوتی ہیں کہ خصوصیت مزاج ان کے اثر کو اثر کو نہیں روک سکتی تو جب بنی اسرائیل کے ان شاء اللہ کا یہ اثر ہوا کہ ان کی فہم اس کی برکت سے درست ہو گئی حالانکہ وہ کچھ زیادہ مؤدب بھی نہ تھے ان کا ادب تو اسی سے ظاہر ہے

کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے یہ خطاب کیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ط (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) پھر حکم الٰہی میں چون وچرا کی اور سب سے بڑی ادب کی بات تو وہ تھی جو انھوں نے اخیر میں کہی یعنی اَلْٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ کہ اب لائے ٹھیک بات گویا اس سے پہلے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک نہ تھا اور یہ جملہ اس وقت کہا جب ان شاء اللہ کی برکت سے راہ پر آگئے تھے. فہم درست ہوگئی تھی تو جن کا سمجھ آجانے کے بعد یہ ادب ہے ان کا مؤدب ہونا ظاہر ہے مگر پھر بھی ان شاء اللہ نے اپنا اثر کیا گو قائل زیادہ قابل نہ تھے بلکہ ناقابل تھے. (اور لیجئے حدیث میں آتا ہے کہ یاجوج و ماجوج سد سکندری کو روزانہ چاٹ چاٹ کر ورق کر دیتے ہیں اور شام کے وقت یہ کہکر چلدیتے ہیں کہ بس کل کو آکر توڑ دیں گے، رات کو دیوار پھر ویسی ہو جاتی ہے جیسی تھی۔ تو پھر آکر چاٹتے ہیں روزانہ ان کا یہی شغل ہے یہاں تک کہ اخیر میں ایک دن ان کے منہ سے یہ نکلے گا کہ ان شاء اللہ کل کو آکر توڑ ڈالیں گے۔ ان شاء اللہ کی برکت سے اس رات دیوار اپنی اصلی حالت پر عود نہ کرے گی ویسی ہی ورق جیسی رہے گی جیسے وہ چھوڑ کر جائیں گے اور اگلے دن آکر توڑ ڈالیں گے ۱۲) پس اندازہ کر لیجئے کہ اگر کوئی مخلص باادب ان شاء اللہ کہے گا تو کیا اثر ہوگا۔

اور یہاں سے میں ایک اور مضمون پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جس طرح ان شاء اللہ میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے کام آسان ہو جاتا ہے گو قائل کیسا ہی ہو (کافر ہی کیوں نہ ہو ۱۲) اسی طرح شریعت کے بعض احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی حاصل ہوتی ہے گو فاعل کیسا ہی ہو۔ آجکل ترقی کی پکار بہت ہے، ہر شخص ترقی کا طالب ہے اور دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر بھر آتا ہے اور ان کے لیڈر بار بار اس میں غور کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے مگر اب تک حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا کسی نے کہا کہ یہ لوگ سود لیتے ہیں اس وجہ سے ترقی ہو رہی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اگر اس میں یہ خاصیت

ہوتی تو چاہیئے کہ جو مسلمان سود لیتے ہیں ان کو بھی ترقی ہوتی حالانکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں وہ بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں ہیں بعضے کہتے ہیں کہ شریعت میں چونکہ تجارت کی بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے اس لئے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے مگر یہ بھی غلط ہے کیونکہ معاملات میں حدود شرعیہ کے پابند کتنے تاجر ہیں ذرا مجھے تو بتلاؤ ان شاء اللہ دو چار کے سوا کوئی نہ ملے گا پھر ان مسلمان تاجروں کو ترقی کیوں نہیں ہوتی یہ کون سے ناجائز معاملات کو چھوڑ دیتے ہیں غرض سب کی مشق اسلام پر ہے کہ مذہب ہی ترقی سے مانع ہے چنانچہ بعض کی زبان پر تو یہ لفظ صاف صاف آ گیا اور بعض نے مذہب کو تو کچھ نہیں کہا لیکن مولویوں پر نزلہ اتارا کہ یہ علماء ترقی سے مانع ہیں مگر یہ بھی غلط ہے واللہ ہم تو سب سے زیادہ تمہاری ترقی کے طالب ہیں اور وہ طریقہ تم کو تعلیم کرتے ہیں جس پر چلنے کے واسطے ترقی لازم ہے۔ ایک بار میں نے ایک ایسے جلسہ میں جس میں جنٹلمین بکثرت شریک تھے یہی مضمون بیان کیا تھا میں نے کہا کہ لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں۔ آج میں اس الزام کو دفع کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کروں گا۔ اس پر جنٹلمین چونکے کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان؟ میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے ہیں اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں اس پر اور بھی حیرت ہوئی میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ یعنی ہر قوم کے لئے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے پس ایک دوسرے پر سبقت کرو۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استباق کا حکم دیا ہے جس کے معنے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے ہیں اور یہی حاصل ہے ترقی کا تو ترقی کی ضرورت قرآن سے ثابت ہے بلکہ اِسْتَبِقُوْا (ایک دوسرے پر سبقت کرو) صیغہ امر ہے جس کا مقتضیٰ وجوب ہے تو یوں کہنا چاہیئے کہ قرآن میں ترقی کو واجب فرض کیا گیا ہے۔ تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں وہ ان پر کتنا بڑا افترا کرتے ہیں۔ بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے علماء کی مجال ہے کہ اس سے منع کر سکیں پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

جنٹلمین کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کہیں اس طرح ترقی کرو اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے اس طرح ترقی کرو۔ سو قرآن مجید میں فَاسْتَبِقُوا کے ساتھ الْخَيْرَاتِ کی بھی قید ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔ اب اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہو سکتا ہے آپ یہ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ خواہاں ہیں وہ ترقی فی الخیر ہے یا ترقی فی الشر اگر ترقی فی الخیر ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے منع نہ کریں گے اور اگر ترقی فی الشر ہے تو اس کا مطلوب نہ ہونا بلکہ مذموم ہونا تمام عقلاء کے نزدیک مسلّم ہے ورنہ پھر ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے میں تو ترقی کا طالب ہوں بتلایئے آپ اُسے کیا جواب دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تیری یہ ترقی ترقی محمود نہیں بلکہ ترقی مذموم ہے جو کہ بُرے طریقہ سے حاصل کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ وہی مطلوب ہے جو محمود ہو مذموم نہ ہو پس اب یا تو آپ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے مذموم نہیں یا ہم ثابت کر دیں کہ ترقی محمود وہی ہے جس کی تعلیم ہم دے رہے ہیں اور یہ ترقی مذموم ہے جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔ اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے اور اقرار کر لیا کہ واقعی علماء کو ترقی سے اختلاف نہیں بلکہ اس کے طرق تحصیل سے اختلاف ہے کیونکہ ان طرق کے خلاف شرع ہونے کی وجہ سے اس ترقی کو ترقی فی الشر کا مصداق بنا دیا ہے۔ غرض دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ ان کی ہر حالت کو ترقی میں دخیل سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کبھی ان کی صورت و وضع کو اختیار کرتے ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو، کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی ترقی سے مانع ہے اگر عورتیں آزاد ہوں گی تو علوم و صنعت و حرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کریں گی اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ اٹھائیں گی۔

ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان کی تھی میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفاء کی عورتیں پردہ نشین ہیں جن کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے زیادہ تعداد چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا ہمیشہ سے رواج نہیں ہے اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ ترقی کرلی بس اس کا جواب کچھ نہ تھا وہ میرے منہ کو تکنے لگے یہاں تک مذاق بگڑا ہے کہ بعض لوگ تشبیہات غلط بولنے کو ترقی میں دخیل سمجھتے ہیں۔

ہم نے کانپور کے اسٹیشن پر ایک خانساماں کو سنا کہ وہ ایک شخص سے کہتا ہے "ہم یہ سننا نہیں مانگتا" میں نے کہا کمبخت تجھے اردو غلط بولنے پر کس مصیبت نے مجبور کیا بھلا انگریز تو اس لئے غلط بولتے ہیں کہ ان کو زبان نہیں آتی تجھے کس مصیبت نے گھیرا بس کچھ نہیں صاحب بہادر بننے کا شوق ہے اردو غلط بولنے کو بھی صاحب بہادری میں دخیل سمجھتے ہیں۔ صاحب بہادر بننے پر مجھے ایک اور حکایت یاد آئی مظفر نگر اور میرٹھ کے ضلع میں کچھ چمار عیسائی ہو گئے ہیں عیسائی بننے کے بعد انھیں صاحب بہادر بننے کا شوق ہوا بلکہ یوں کہیے کہ یہی شوق ان کو عیسائیت کی طرف داعی ہوا اب ان کی حالت یہ ہے کہ شام کو پھٹے پرانے بوٹ سوٹ (جو انگریزوں کے یہاں سے اُتارن کے طور پر مل جاتا ہوگا) پہنکر نکلتے ہیں اور سڑک پر ٹہلتے ہیں اور کھانا اس طرح کھاتے ہیں کہ گھڑوں کو اوندھا کر کے ان پر بیٹھ گئے گویا کرسی ہے اور گھڑے کو اوندھا کر کے اس پر بھڑے کی روٹی کے ٹکڑے رکھ لئے یہ میز ہے اور ببول کے کانٹوں سے وہ ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھاتے ہیں کیا دماغ سڑے ہیں۔ انہی چماروں میں سے ایک شخص برسات کے دنوں میں کہیں جا رہا تھا راستہ میں بارش آئی تو قریب ہی نہر کا ڈاک بنگلہ تھا جہاں ظہور علی نام ایک چوکیدار رہا کرتا تھا اس وقت وہ اپنی کوٹھری کے کواڑ بند کر کے سو رہا تھا تو یہ چمار صاحب چوکی پر پہونچے اور ظہور علی کو پکارنا شروع کیا اے جہولی، اے جہولی کواڑ کھول صاحب کھڑے

بھیجیں کہ کھڑے بھیگیں) وہ غریب یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی انگریز دورہ میں ہوگا وہ بھیگ رہا ہوگا بارش سے پناہ لینے یہاں آگیا فوراً گھبرا کر اٹھا اور جلدی سے کیواڑ کھولے دیکھا تو وہاں چمار کے سوا کوئی نہیں پوچھا لیے وہ صاحب کہاں۔ تو کہتا کیا ہے اور ہم ہیں تھیں۔ ظہور علی نے کہا آئیں تجھے صاحب بناؤں اور جوتہ نکال پانچ چھ لگائے تو اس چمار نالائق کا ایسا دماغ سڑا کہ اپنے منہ سے اپنے آپ کو صاحب کہتا تھا۔

اسی طرح اس خانساماں کا دماغ خراب ہوا تھا کہ سیدھی صحیح اردو چھوڑ کر کہتا تھا "ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا" افسوس انگریز تو کوشش کرتے ہیں صحیح اردو بولنے کی اور وہ محض مجبوری کی وجہ سے غلط بولتے ہیں اور ہندوستانی ان کی دیکھا دیکھی صحیح اردو کو چھوڑ کر غلط بولنا اختیار کرتے ہیں بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارے اوپر کیا خدا کی مار پڑی۔ انگریزوں کی کوشش کا تو یہ حال ہے کہ ایک انگریز نے اردو بڑی کوشش سے سیکھی تھی اور اس کو اپنی اردو دانی کا دعوٰی تھا گو اس کا یہ دعوٰے صحیح نہ تھا کیونکہ غیر اہل زبان کبھی دوسری زبان میں اہل زبان کے برابر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اسی انگریز کا واقعہ ہے کہ ایک دن وہ صبح کو اٹھا تو طبیعت خراب تھی کسی ملاقاتی نے پوچھا کہ حضور کا مزاج کیسا ہے۔ کہنے لگا ہماری طبیعت خراب ہے آج رات سے ہم کو لید نہیں ہوئی۔ یہ اردو دانی تھی کہ انسان کے پاخانہ کو بھی لید کہتا تھا۔ واقعی چاہے کیسے ہی کوشش کی جائے دوسری زبان صحیح طور پر کم آتی ہے۔

ایک ایرانی ہندوستان میں آیا تھا اور اردو صاف بولنے لگا تھا اسے بھی اپنی اردو دانی کا دعوٰے تھا، لوگوں نے کہا ہم آپ کے سامنے قصداً آسان آسان باتیں کرتے ہیں جن کو آپ جلدی سمجھ لیتے ہیں اگر ہم اردو کے محاورات آپ کے سامنے بولیں تب معلوم ہو کہ آپ کتنے اردو داں ہیں۔

اس نے کہا واہ ہم سب سمجھ جائیں گے، لوگوں نے کہا اچھا بتلایئے اس جملہ کے کیا معنی ہیں۔ چھبیلی رنگیلی۔ رسیلی۔ تو آپ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ "شش گربہ رنگین رسن گرفت"۔ چھبیلی کو چھ بلی بنایا اور رسیلی کو رسّی لی یعنی چھ رنگین بلیوں نے رسی لی۔ کیا بگاڑا ہے مضمون کو۔

اسی طرح ایک ہندی ایران رہ کر آیا تھا۔ ہندوستان آکر اس نے فارسی دانی کا دعویٰ کیا۔ ایک ایرانی نے سنا اس کو جوش آیا کہ ہندی کو فارسی دانی کا دعویٰ یہ نہیں ہوسکتا وہ اس کا امتحان لینے آیا اور اس سے کہا کہ اپنا کوئی شعر سناؤ۔ اس نے فی البدیہہ ایک شعر تصنیف کیا جو ظاہر میں بہت ہی عمدہ شعر تھا ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے نازنین دیدم
بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے آتشیں دیدم

مگر ایرانی نے سنتے ہی کہا تف یہ نازنین دیدم اور آتشیں دیدم کیسا سیدھا یوں کیوں نہیں کہتے ؎

سیہ چوری بدست آں نگارے
بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے

واقعی زباں داں کی اصلاح کے بعد اب معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شعر نہایت بھدا تھا جس میں فضول الفاظ بھرے ہوئے تھے اور یہ ذوق زبان دان ہی کو حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کو نہیں ہوسکتا وہ ہندوستانی باوجود ایران میں اتنے دن رہنے کے اس ذوق کو حاصل نہ کرسکا۔ غرض دوسری زبان پوری طرح نہیں آسکتی چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے زبان دان کے برابر نہیں ہوسکتا۔ خاصکر اردو زبان تو دوسروں کو آتی ہی نہیں۔ اسی لئے ہندیوں کو قرآن ایسا نہیں آتا جیسا عرب کو، جیسا اردو عرب کو ایسی نہیں آتی جیسی ہندی کو۔

ایک بار مکہ مکرمہ میں اہل عرب نے مولانا رحمت اللہ صاحب مہاجر کے

سامنے ہندیوں پر اعتراض کیا کہ یہ لوگ قرآن بہت غلط پڑھتے ہیں مولانا نے جواب دیا کہ ہندی قرآن اتنا غلط نہیں پڑھتے جتنا آپ اردو غلط بولتے ہیں۔ (مطلب یہ تھا کہ اہلِ عرب کا قرآن صحیح پڑھنا کمال نہیں کیونکہ وہ اہلِ زبان ہیں اور ہندی قرآن غلط پڑھتے ہیں معذور ہیں کیونکہ وہ غیر اہلِ زبان ہیں اور غیر اہلِ زبان کو دوسری زبان پوری طرح نہیں آسکتی، چنانچہ اہلِ عرب کو اردو صحیح نہیں آتی وہ اتنی غلط اردو بولتے ہیں کہ ہندی قرآن مجید اتنا غلط نہیں پڑھتے ۱۲)

اس پر اہلِ عرب نے کہا کہ نہیں، ہم اردو اتنی غلط نہیں بولتے۔ مولانا نے کہا اچھا کہئے ٹٹو، ٹھٹھا۔ تو وہ کہتے ہیں تتو، تتا۔ مولانا ہنسنے لگے کہ یہ اردو ہوئی نہ معلوم آپ کیا بول رہے ہیں۔ بس ہندی قرآن مجید کو ایسا غلط نہیں پڑھتے۔ خیر یہ تو مولانا نے اس وقت جواب دیدیا لیکن مولانا میں حمیت قومی بہت تھی ان کا دل چاہتا تھا کہ ہندیوں پر سے غلطی قرآن کا الزام رفع ہو جائے۔

چنانچہ اسی لئے انھوں نے مدرسہ صولتیہ قائم کیا اور واقعی مولانا اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اس مدرسہ میں بڑے بڑے کامل اساتذہ رہے ہیں۔ انھوں نے اول اپنے مدرسہ میں مصر کے ایک قاری کو جن کا نام ابراہیم سعد تھا مدرس رکھا جو اس فن میں بڑے کامل اور ماہر تھے۔ قاری عبداللہ صاحب نے انھیں سے قرأت سیکھی تھی پھر وہ مدرسہ سے علیحدہ ہوگئے اور قاری عبداللہ صاحب ان کے قائم مقام ہوئے یہ ایسے کامل ہوئے کہ ایک دفعہ کسی نے ابراہیم سعد کے سامنے قاری عبداللہ صاحب کی تعریف کی کہ ہندیوں میں تو قاری عبداللہ صاحب بے نظیر ہیں، تو ابراہیم سعد نے فرمایا بلکہ عرب میں بے نظیر ہیں۔ قاری عبداللہ صاحب کے کمال کے لئے اتنے بڑے ماہر فن کی یہ شہادت بہت بڑی شہادت ہے۔ اور واقعی قاری صاحب قرآن مجید

بے نظیر پڑھتے تھے۔

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ آجکل لوگ اردو غلط بولنے کو بھی ترقی میں دخیل سمجھتے ہیں حالانکہ غیر قوموں کی جو باتیں ترقی میں دخیل ہیں وہ دوسری ہیں وہ انکی خاص صفات ہیں جو انھوں نے آپ ہی کے گھر سے لی ہیں مثلاً منتظم ہونا۔ مستقل مزاج ہونا۔ پابند وقت ہونا۔ متحمل ہونا۔ انجام کو سوچ کر کام کرنا صرف جوش سے کام نہ کرنا ہوش سے کام لیتا۔ آپس میں اتحاد و اتفاق کرنا۔ ایک دوسرے کے راز کو چھپانا اور یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور ان احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے، خواہ کوئی اختیار کرے۔ اب مسلمانوں نے تو ان احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا نہ ان میں اتحاد نہ ان میں اتفاق ہے نہ رازداری کا مادہ ہے نہ انتظام ہے نہ وقت کی پابندی ہے نہ انجام بینی ہے جو کام کرتے ہیں جوش سے کرتے ہیں ہوش سے نہیں کرتے اس لئے ان کو تنزل ہے اور غیر قوموں نے ان کے گھر سے چرا کر ان باتوں پر عمل کرنا شروع کر دیا تو ان احکام کی خاصیت ظاہر ہوئی کہ ان کو ترقی ہونے لگی۔

پھر یہ سرقہ ناقص ہے کیونکہ چور کو گھر کے اندر کی سب چیزیں معلوم نہیں ہوا کرتیں اس کو وہی چیزیں ہاتھ لگتی ہیں جو ظاہر ہوں (یا تالے کنجی میں ہوں) دبے ہوئے خزانے کی اطلاع اسے نہیں ہوا کرتی اس لئے وہ پارس کی پتھری جو آپ کے گھر میں تھی اس کی انھیں خبر نہیں ہوئی یا خبر ہوئی مگر انھوں نے بیکار سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا کیونکہ پارس کی پتھری دیکھنے میں تو پتھر ہی ہوتی ہے اس کی خاصیت جسے معلوم ہو وہی اس کی قدر جان سکتا ہے۔ ناواقف کے نزدیک تو کانچ کا ٹکڑا اور بلور کا پتھر بڑا ہے وہ پارس کی پتھری آپ کے گھر میں کیا ہے۔ ایمان و توحید و اعتقاد رسالت نماز روزہ وغیرہ۔ افسوس آپ کو اپنے گھر کی قدر نہیں اگر آپ میں وہ

صفات ہوتیں جو دوسری قوموں نے آپ سے لے لی ہیں تو بارس کی پتھری
کے ساتھ مل کر آپ کو وہ ترقی ہوتی جو غیر قوموں کو خواب میں بھی کبھی نہ آئی ہوگی
آپ کو وہ عروج حاصل ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا کہ کوئی ان کے
ساتھ آنکھ نہ ملا سکتا تھا مگر آج کل مسلمانوں کو اس ارشادِ الٰہی پر نظر نہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ
وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا ؕ

(تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ
وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرما دے گا جیسا کہ
ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند
کیا ہے ان کو ان کے لئے قوت دے گا اور ان کے اس خوف کے
بعد اس کو مبدل بامن کر دے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں
میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں)

اور یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ان کاموں کو بھی ترقی میں کچھ دخل ہے؟ حالانکہ اس آیت
میں ایمان و عمل صالح پر صاف صاف وعدہ ہے استخلاف فی الارض اور
تمکین کا مگر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نماز روزہ اور ایمان میں
بھی کچھ قوت ہے اور اس سے بھی ترقی ہوتی ہے۔ افسوس جس خزانہ کو چور
نے ناواقف ہو کر یا بے کار سمجھ کر چھوڑا تھا اس کی قیمت و قوت سے خود
گھر والے بھی آج ناواقف ہیں یا بعض کے اعتبار سے یوں کہیے کہ بیکار
ہی سمجھتے ہیں مگر ایسوں کو تو مسلمان بھی نہ کہنا چاہیے یہ کاہے کے مسلمان
جو نماز روزہ کو بیکار سمجھیں مگر ایسے تو دو چار ہی نکلیں گے زیادہ وہی ہیں جو
اپنے خزانہ کی قیمت سے ناواقف اور اس کی طاقت سے بے خبر ہیں۔ اسی
لئے ان اعمال کی بے قدری کرتے ہیں۔ کوئی مسلمانوں کی حالت کا تتبع کرے

تو ان میں ہزاروں ایسے نکلیں گے جن کو کلمہ بھی نہیں آتا اور لاکھوں ایسے ملیں گے جو نماز کو جانتے بھی نہیں کہ کس چیز کا نام ہے اور بہت سے وہ ملیں گے جو کبھی سال میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتے ہیں کبھی جی چاہا جمعہ کو بھی مسجد میں آجاتے ہیں اور جو تھوڑے سے اللہ کے بندے پانچوں وقت کی نماز کے پابند ہیں ان میں بھی قاعدہ کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے والے بہت کم ہیں۔ کسی کا رکوع غلط ہے، کسی کا سجدہ، کسی کا قومہ مفقود ہے، کسی کا جلسہ ایک گڑبڑ کر رکھی ہے تو اب آخر یہ کیا ہے بیقدری ہے یا نہیں اور بخدا یہ بیقدری اسی واسطے ہے کہ نماز کو صرف ثواب کا کام سمجھ رکھا ہے اس کے دنیوی منافع کی ان کو خبر نہیں بلکہ بعض جاہل تو نماز روزہ کو دنیوی ترقی سے مانع سمجھتے ہیں اور اگر ان کو حقیقت معلوم ہو جاتی کہ ان اعمال کو ترقی اور تمکن فی الارض میں بھی دخل ہے تو پھر دیکھئے آپ کہ مسلمان کس شوق سے ان اعمال کو بجا لاتے گو اس نیت سے عمل کرنا اچھا نہیں خلوص کے خلاف ہے طاعات سے ثمرات دنیا کا قصد نہ ہونا چاہئے وہ تو تابع ہیں خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں الغرض ترقی کے اسباب تو آپ کے گھر میں موجود ہیں اور آپ ہی کے گھر سے دوسروں نے چرائے ہیں۔ اور آپ کی یہ حالت ہے کہ دوسروں سے لیتے اور در بدر گدائی کرتے پھرتے ہیں۔ پس وہ حال ہے ؎

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر — تو ہمی جوئی لب نان در بدر
تا بزانوئے میان قعر آب — وز عطش وز جوع گشتستی خراب

یعنی روٹیوں کا ٹوکرا تو سر پر رکھا ہوا ہے اور در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں دریا کے اندر کھڑے ہوئے ہیں اور پیاس کے مارے برا حال ہے۔ اب دیکھئے اسلام میں ایک تعلیم یہ ہے کہ جو شخص خاص مجلس میں ہو مجلس عام نہ ہو تو اس کے پاس بدون اجازت کے نہ جاؤ اور اس میں زنانہ مکان ہی کی تخصیص نہیں بلکہ مردانہ مکان میں بھی اگر کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا

ہو اس کے پاس بھی بدون اجازت کے نہ جانا چاہیئے۔ اور زنانہ مکان میں جس طرح دوسروں کو استیذان کا حکم ہے خود گھر والے کو بھی حکم ہے کہ اپنے گھر میں بدون اطلاع کے نہ جائے ممکن ہے کوئی پردہ دار عورت آئی ہوئی ہو اگر تم بلا اطلاع چلے جاؤ گے اس کا سامنا ہو جائے گا یا ممکن ہے تمہاری ماں بہن ہی کسی وجہ سے ننگی بیٹھی ہو اپنے گھر میں دس دفعہ عورتوں کو ایسا اتفاق پیش آتا ہے اس لئے مردوں کو حکم ہے کہ اپنے گھر میں بھی بدون اطلاع کے نہ جائیں پھر اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ جب تم کسی کے پاس جانا چاہو اور وہ اجازت نہ دے بلکہ یہ کہدے کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا پھر کسی وقت ملوں گا تو اس بات کا برا نہ مانو بلکہ لوٹ آؤ فَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا هُوَ اَزْکٰی لَکُمْ (پس اگر تم سے کہا جائے لوٹ جاؤ تو تم لوٹ آؤ یہ برتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف رکھنے والا ہے)

اور اس میں حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ برتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف رکھنے والا ہے کیونکہ ایسے وقت میں شرماشرمائے اگر کسی نے بلا بھی لیا تو انشراح وانبساط کے ساتھ وہ تم سے نہ ملے گا اس لئے کہ دل تو ملنے کو چاہتا ہی نہ تھا تو یقیناً اس کے قلب پر تمہاری ملاقات سے گرانی ہوگی پھر ممکن ہے کہ اس گرانی کا احساس تم کو بھی ہو جائے تو اس سے تم کو بھی دل دل میں شکایت ہوگی کہ یہ کیسا روکھا آدمی ہے کیسا بدخلق ہے جس پر میرا آنا اتنا گراں ہوا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ جب کوئی یہ کہدے کہ اس وقت میں نہیں مل سکتا فوراً لوٹ آؤ۔ اب اس مسئلہ میں ہم لوگ کتنی کوتاہی کرتے ہیں استیذان کا سبق ہم لوگوں نے بالکل ہی بھلا دیا۔ مگر دوسری قومیں اس پر عامل ہیں کوئی شخص کسی کے کمرہ میں بدون اجازت کے نہیں جا سکتا سو دیکھ لیجیے جو قومیں اس پر عمل کر رہی ہیں ان میں باہم کیسا اتفاق ہے آگے یہ ان کے تکلفات ہیں کہ استیذان کے لئے اپنے پتہ کا کارڈ بھیجتے ہیں۔ ہم کو ان تکلفات کی ضرورت نہیں بس زبانی اجازت

لینا کافی ہے مگر ہمارے یہاں تو یہ حالت ہے کہ چاہے کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو چاہے کوئی سو ہی رہا ہو مگر ان کا سلام و مصافحہ قضا نہ ہو۔

ایک دفعہ سیوہارہ میں مجھے خود یہ واقعہ پیش آیا کہ شب کے سفر سے مجھے تکان زیادہ محسوس ہوا تو جاتے ہی ایک کمرہ میں لیٹ گیا اور سونے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک صاحب تشریف لائے اور بڑے زور سے آکر پوچھا کہ فلاں شخص (میرا نام لے کر) کہاں ہے، لوگوں نے کہا ذرا آہستہ بولو وہ سو رہا ہے۔ کہنے لگے واہ مجھے ان سے ابھی ملنا ہے لوگوں نے بہت منع کیا مگر وہ کب باز آنے والے تھے سیدھے وہیں پہونچے جہاں میں لیٹا تھا اور آکر بڑے زور سے سلام کیا میں جاگ رہا تھا مگر میں نے قصداً آنکھ نہ کھولی کیونکہ اس وقت یہی مصلحت تھی جب اس نے دیکھا کہ سلام سے بھی یہ نہیں جاگا تو میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اور پیشانی پر گھس کر چلدیئے لوگوں نے بُرا بھلا کہا کہ یہ کونسا وقت تھا سلام اور مصافحہ کا۔ تو آپ فرماتے ہیں واہ جی ہم حج کو جارہے ہیں پھر نہ معلوم کب ملنا ہوتا۔ بس اُن کا توجہ ہوا چاہیے دوسرے کا کچھ ہی حال ہوجائے۔ حالانکہ شریعت میں سونے والے کی اس قدر رعایت ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے، حضرت مقداد راوی ہیں کہ ایک بار یہ چند شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان تھے۔ آپ جب رات کو ذرا دیر سے گھر میں تشریف لاتے اور یہ مہمان لیٹے ہوتے تو آپ بہت آہستہ آہستہ تشریف لاتے اور ایسی آواز سے سلام فرماتے کہ جاگنے والا تو سُن لے اور سونے والے کی نیند خراب نہ ہو۔ حالانکہ یہ وہ ذات ہے کہ اگر آپ قتل بھی کردیتے تو صحابہ کرام کو انکار نہ ہوتا بلکہ آپ کے ہاتھ سے خوشی خوشی جان دینا ان کے نزدیک فخر تھا مگر پھر بھی آپ صحابہ کی نیند کی اتنی رعایت فرماتے تھے۔ مگر یہاں یہ حالت ہے کہ ہر وقت مصافحہ ہے۔ چاہے کسی کو تکلیف ہوتی ہو۔

دیوبند کے جلسہ میں بڑا اژدہام تھا ایک بار میں نماز پڑھانے کے لئے مصلے پر پہونچ چکا تھا تو ایک صاحب تیسری صف سے نکلے اور مصلے پر سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور مصافحہ کرکے چھوڑ دیا کہ اب جاؤ، بھلا یہ بھی کوئی آدمیت تھی، اس بھلے مانس کو مصافحہ کا یہی وقت ملا تھا۔ غرض دوسرے کی راحت و تکلیف کا ذرا خیال نہیں۔ اب اگر کوئی انتظام کرنے لگے تو اسے قانون باز، قانون ساز کہتے ہیں۔

چنانچہ میرے یہاں اس قسم کی باتوں پر روک ٹوک اور انتظام بہت ہے جس پر عنایت فرماؤں نے مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں۔ ایک صاحب نے میرے منہ پر کہا کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں، انگریزوں کا سا قانون ہر بات میں انتظام ہر بات میں انتظام۔ افسوس گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں بس اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے حالانکہ اسلام سے زیادہ انتظام کسی نے بھی نہیں کیا ہر کام کا وقت مقرر ہے نماز کا بھی روزہ کا بھی حج کا بھی اور اتنا بڑا انتظام ہے کہ ذرا ایک تاریخ سے حج مؤخر ہو جائے تو پھر سال بھر سے ورے نہیں ہو سکتا تو کیا اس کو بھی انگریزی قانون کہو گے۔ عیادت اور بیمار پرسی کے لئے یہ قانون ہے اِذَا عَادَ اَحَدُکُمُ الْمَرِیْضَ فَلْیُخَفِّفِ الْجُلُوْسَ حدیث شریف میں ہے کہ جب بیمار کی عیادت کیا کرو تو اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا کرو کیونکہ بیمار کو زیادہ ہجوم سے تکلیف ہوتی ہے۔ حضرات فقہاء نے اس حکم کی حقیقت کو سمجھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس چیز سے مریض کو توحش ہو وہ کام نہ کرو جس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ مثلاً کسی کو بدھ کے دن عیادت کرنے سے اعتقاد شر کا ہو تو اس دن عیادت نہ کرو بلکہ دوسرے دن عیادت کرکے اس عقیدہ کی اصلاح کردو کوئی زاہد خشک ہوتا تو یوں کہتا کہ نہیں کہ ایسے شخص کی عیادت بدھ ہی کے دن کرنا چاہیئے تاکہ اس عقیدہ باطلہ کی مخالفت ہو۔ تو اے صاحب پھر وہ عیادت ہی کیا ہوئی مناظرہ ہو گیا۔

عیادت سے مقصود تو مریض کی دلجوئی ہے آپ کی اس مخالفت سے یہ مقصود کہاں حاصل ہوا بلکہ اس کو تو آپ کی صورت دیکھ کر دونی وحشت ہوگی کہ یہ کمبخت بدھ کے دن کہاں آمرا دیکھئے اس کا کیا منحوس اثر ہوتا ہے تو وہ اس سے گھبرا دیگا جیسے ایک بہرا آدمی کسی کی عیادت کو گیا تھا بیمار کو اس کی صورت دیکھتے ہی خفقان شروع ہوگیا کہ یہ کمبخت کہاں آمرا اپنی سب کہے گا میری ایک نہ سنے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ اپنے جی میں مضمون پکا کر لایا تھا کہ میں پوچھوں گا کہ مزاج کیسا ہے وہ کہے گا اچھا ہوں میں کہوں گا الحمد للہ پھر پوچھوں گا علاج کس کا ہے کسی حکیم کا نام لے گا، میں کہوں گا ان کے قدم بہت مبارک ہیں ماشاءاللہ دست شفار کھتے ہیں، ان کا علاج کبھی نہ چھوڑنا۔ پھر کہوں گا نسخہ کیا استعمال میں ہے وہ کچھ بتلائے گا میں کہوں گا انگبین ہے خدا رگ رگ میں پیوست کرے مگر وہاں سارا مضمون برعکس ہوا مریض تو اس کی صورت دیکھ کر ہی پریشان ہوگیا تھا۔ اب جو ان سے پوچھا کہ مزاج کیسا ہے بیمار نے کہا مر رہا ہوں آپ نے کہا الحمد للہ پھر پوچھا علاج کس کا ہے اس نے کہا ملک الموت کا۔ آپ کہتے ہیں خدا ان کے قدم مبارک کرے ماشاءاللہ دست شفار کھتے ہیں اُن کا علاج کبھی نہ چھوڑنا پھر کہا نسخہ کیا پی رہے ہو بیمار نے کہا زہر پی رہا ہوں آپ کہتے ہیں انگبین ہے خدا رگ رگ میں پیوستہ کرے بھلا اس شخص کی عیادت سے کیا نفع ہوا شرعاً ایسے لوگوں کو عیادت نہ کرنا چاہیے بس اگر بہت ہی شوق ہو تو دوسروں کے ساتھ ملے جلے چلے جائیں تاکہ عیادت نہ کرنیکا الزام بھی رفع ہو جائے اور بیمار سے بات چیت بھی نہ کرنا پڑے خوامخواہ اس کا دماغ پریشان کرنے سے کیا نفع۔

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ فقہا، حکماء امت ہیں شریعت کو ان حضرات نے سمجھا ہے۔ بات چیت کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام فرمایا ہے لَا يَتَنَاجَى اِثْنَانِ دُوْنَ الثَّالِثِ حَتّٰى يَأْتِيَ رَابِعٌ (اوکما قال) یعنی جہاں تین آدمی بیٹھے ہوں وہاں دو شخص آہستہ آہستہ باتیں نہ کریں اس سے

تیسرے کی دل شکنی ہوگی کہ مجکو غیر سمجھا یہاں تک کہ چوتھا آجاوے تو اب دو شخص باتیں کر سکتے ہیں کیونکہ تیسرے کو باتوں کا شوق ہوگا تو وہ چوتھے سے کرنے لگے گا پھر اس کو وہ بدگمانی نہ ہوگی احتمال ہوگا کہ شاید اس چوتھے سے اخفا مقصود ہوا ور اس چوتھے کو اس تیسرے پر یہی احتمال ہوگا۔ سبحان اللہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کیسی ذرا ذرا سی باتوں کی رعایت فرمائی ہے اور یہ معجزہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ باوجود اتنے مشاغل کثیرہ کے پھر بھی آپ نے معاشرت کے دقیق سے دقیق امور کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا کہ بدون نبوت کے ایسا ہو سکتا ہے ہرگز نہیں اسی جامعیت تعلیم کو دیکھ کر تو کفار کہا کرتے تھے حضرات صحابہ کرام سے کہ تمہارے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے تم کو ہر بات سکھلائی حتیٰ کہ ہگنا موتنا بھی سکھلا دیا۔ کفار نے تو یہ بات طعن سے کہی تھی مگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ ہاں بیشک حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سکھلایا ہے کہ بول و براز کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ کریں اور داہنے ہاتھ سے اپنے عضو کو نہ چھوئیں اور تین ڈھیلوں سے کم استنجے کے واسطے نہ لیجائیں اور ہڈی اور کوئلہ سے استنجا نہ کریں یہ تعلیم سن کر کفار کی آنکھیں کھل گئیں کہ واقعی بول و براز کے یہ آداب تو بدون تعلیم کے معلوم ہو ہی نہیں سکتے۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے انتظام کا کہ پیشاب و پاخانہ کے لئے بھی آداب مقرر ہیں۔ پاکی اور صفائی کا یہ قانون ہے کہ آپ فرماتے ہیں اِذَا اسْتَيْقَظَ اَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهٖ فَلَا يَغْمِسْ يَدَهٗ فِيْ اِنَائِهٖ فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ اَيْنَ بَاتَتْ يَدُهٗ۔ جب کوئی سو کر اٹھے تو برتن میں ہاتھ نہ ڈالے کیا خبر ہاتھ کہاں کہاں پہونچا ہوگا۔ بھلا یہ انتظام ہی نہیں اور کیا ہے۔ نیز ارشاد ہے نَظِّفُوْا اَفْنِيَتَكُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ اپنے گھر کے سامنے کا میدان صاف رکھا کرو یہود کی طرح نہ بنو وہ صفائی کا اہتمام نہیں کرتے۔ سبحان اللہ جب فنا دار کی صفائی کا اتنا اہتمام ہے تو خود گھر کی صفائی کا اہتمام کیا کچھ ہوگا۔ اور جب گھر کا اتنا اہتمام ہے

تو لباس کی صفائی کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا پھر بدن اور روح کی نظافت کا امر تو کیسا کچھ ہوگا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ (چمن سے میری بہار کو قیاس کرو) اسی سے عاقل سمجھ سکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر کی نظافت کا اتنا خیال ہے تو نظافت باطن کا تو کس درجہ اہتمام ہوگا مگر آج کل مسلمان اپنے گھر کے اس سبق کو ایسا بھولے ہیں کہ اگر کوئی اس زمانہ میں نظافت مکان نظافت لباس و بدن کا اہتمام کرنے لگے تو اس کو عیسائی اور انگریز کہنے لگیں۔

چنانچہ مدراس میں ایک انگریز اسلام لایا ایک روز وہ جامع مسجد میں گیا تو حوض کی نالی میں اس قدر ریت جما ہوا تھا جسے دیکھ کر گھن آتی تھی اس سے نہ رہا گیا اس نے ایک دو لوٹے پانی سے سب دھو دیا اور لوگوں سے کہا کہ صاحبو! ذرا نالی میں سے کبھی کبھی ریت تو صاف کر دیا کرو، دیکھو کیسا برا معلوم ہوتا ہے۔ تو لوگ کیا کہتے ہیں معلوم ہوتا ہے تجھ میں ابھی عیسائیت کا اثر باقی ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بھلا یہ بھی کوئی حرکت ہے کہ نظافت اسلامی کو کوئی دوسری قوم اختیار کر لے تو وہ اسلام سے نکل جائے اور انگریزوں کا کام ہو جائے۔ میں کہاں تک گناؤں شریعت کے انتظام کو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک انتظام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں لَا یَقُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ خَبُثَتْ نَفْسِیْ وَلْیَقُوْلَنَّ لَقِسَتْ نَفْسِیْ (اوکما قال) یعنی اگر جی متلائے تو خبثت نفسی (میرا نفس خبیث ہے) نہ کہو کیونکہ مسلمان کا نفس خبیث نہیں ہوا کرتا بلکہ یوں کہو کہ میرا جی مالش کرتا ہے متلاتا ہے۔ سبحان اللہ آپ نے ہم کو بات کرنے کے بھی طریقے بتلائے ہیں۔ افسوس آج اگر کوئی اس انتظام پر عمل کرنے لگے تو اس کو الزام دیا جاتا ہے کہ اس کے یہاں تو انگریزوں کا سا انتظام ہے۔ ارے ہم انگریزوں کے متبع ہیں یا ان امور میں وہ خود ہمارے متبع ہیں مجھے تو کبھی ان کی معاشرت دیکھنے کا آج تک موقعہ ہی

نہیں ملا جو کچھ میں انتظام کرتا ہوں وہ اپنے گھر کی تعلیم کو دیکھ کر خود تجربہ کرتا ہوں اور چونکہ وہ انتظامات سب کی راحت کے ہوتے ہیں دوسری قوموں نے بھی ہماری کتابوں سے ان کو لے لیا اس لئے بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ جو انتظام میں نے کیا ہے، دوسری قوموں نے بھی اختیار کر رکھا ہے۔ تو اب اگر دوسری قومیں ہمارے اعمال کو لینے لگیں تو کیا ہم اپنے گھر کو چھوڑ دیں یا اسے گرادیں اگر یہی عقل ہے تو ایسی عقل آپ کو ہی مبارک ہو اور یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنے قواعد میں نے اپنے یہاں مقرر کئے ہیں گو وہ میں نے اپنی ہی راحت کے لئے مقرر کئے ہیں میں کسی پر کیوں احسان رکھوں اس لئے میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ قواعد دوسروں کی راحت کے واسطے مقرر کئے ہیں گو بعض احباب کا اعتقاد ہے کہ اس میں ان کی بھی مصالح کی رعایت ہے۔

بہر حال جو کچھ بھی ہو مگر وہ سب قرآن و احادیث سے بلا تکلف اور بدون تاویل کے ثابت ہیں اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ آداب المعاشرت کا دیباچہ دیکھ لے اس میں ان انتظامات کے کلیات کو قرآن و احادیث سے ثابت کر دیا گیا ہے اور جزئیات کا کلیات میں داخل کر لینا اہل علم کو کچھ مشکل نہیں اور اگر کسی کو اس میں خفا رہے تو میں اس کے بیان کے لئے حاضر ہوں۔

تو صاحب دوسری قوموں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے آپ کے گھر سے یہ چند باتیں چرالی ہیں۔ انتظام، پابندیٔ وقت، رازداری، اتحاد و اتفاق وغیرہ وغیرہ اور ان اعمال کی خاصیت ہے کہ جو ان کو اختیار کرتا ہے اُسے ترقی ہو جاتی ہے۔ اس لئے دوسری قوموں کو ترقی ہو رہی ہے اور آپ نے ان اعمال کو ترک کر دیا ہے اس لئے آپ تنزل میں ہیں۔ پھر دوسری قوموں نے جو ان اعمال کو اختیار کیا ہے وہ اختیار ناقص ہے۔ اگر اختیار کامل ہوتا تو وہ نتیجہ ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

ایک خاک آمیز گھونٹ نے تو بچا دیا ہے اگر خالص جام پیتے تو نہ معلوم کہاں پہونچتے یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ بنی اسرائیل حالانکہ کچھ زیادہ مؤدب نہ تھے مگر باایں ہمہ ان کے ان شاء اللہ کہنے کی برکت ظاہر ہوئی اس پر میں نے کہا تھا کہ بعض اعمال میں ایک خاصیت ہوتی ہے جس کا ظہور ہر محل میں ہوتا ہے گو محل کم قابل ہی کیوں نہ ہو اسی پر یہ مضمون متفرع کیا تھا کہ بعض اعمال شرعیہ کو ترقی میں دخل ہے جو انھیں اختیار کرتا ہے اس کو ترقی حاصل ہو جاتی ہے گو کافر ہی اختیار کرے اب میں پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ اس کے بعد حق تعالے فرماتے ہیں۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ۝

اور جب تم نے ایک جان کا خون کر دیا پھر اس کو ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور حق تعالے کو اس بات کا ظاہر کرنا تھا جسے ہم چھپا رہے تھے یہ اس قصہ کی ابتدا ہے جس کو ترتیب میں موخر کیا گیا ہے۔ مفسرین نے اس تقدیم و تاخیر میں بہت سے نکات لکھے ہیں ان سب میں سہل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مقام پر دور سے بنی اسرائیل کی بے عنوانیوں کا ذکر چلا آرہا ہے اور یہاں بھی اس کا بتلانا مقصود ہے اور اس قصہ میں بنی اسرائیل سے دو بے عنوانیاں ہوئی تھیں ایک قتل کر کے اخفا واردات کرنا دوسرے احکام خداوندی میں خواہ مخواہ کی حجتیں نکالنا۔ پہلی بے عنوانی ابتدا ر قصہ میں ہوئی اور دوسری اس کے بعد۔ اگر قصہ کو ترتیب وار بیان کیا جاتا تو ناظرین پہلے جزو کو مقصود سمجھتے اور دوسرے جزو کو تتمیم قصہ پر محمول کرتے اور ترتیب بدلنے سے صاف معلوم ہو گیا کہ دونوں ہی جزو مقصود ہیں اور ہر جزو سے ایک مستقل بے عنوانی پر تنبیہ کرنا منظور ہے دوسرے احکام خداوندی میں حجتیں نکالنا اخفار واردات سے بڑھ کر جرم ہے اس لئے اس کو پہلے بیان کیا گیا تاکہ ناظرین کو تنبیہ ہو جائے تاکہ خدا کے نزدیک قتل وغیرہ کی نسبت احکام میں حجتیں نکالنا زیادہ شدید ہے جس کو عام لوگ معمولی

بات سمجھتے ہیں ۱۲ جامع) اس کے بعد فرماتے ہیں۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (پس ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو اسی طرح حق تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)

پھر ہم نے کہا کہ اس مقتول پر بیل کے کسی عضو کو لگاؤ اس سے وہ زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دے گا اس وقت گر کی بات بتلادی کہ بیل کے ذبح کرنے کا حکم اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے کسی عضو کے مس کرنے سے مقتول زندہ ہو جائیگا پہلے یہ بات نہیں بتلائی کیوں کہ بنی اسرائیل کی اطاعت کا امتحان مقصود تھا، جس میں وہ ناکام ثابت ہوئے مگر جب حجتیں نکالنے کے بعد انھوں نے بقرہ کو ذبح کر دیا اس وقت امتثال امر پر یہ رحمت فرمائی کہ اس حکم کی حکمت بتلائی گئی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس نے زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دیا اور پھر مرگیا یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ مقتول کے قول پر فیصلہ کیونکر ہوا کیونکہ مقتول بھی فی الجملہ مدعی ہوتا ہے اور مدعی کا قول محتاج بینہ یا اقرار مدعیٰ علیہ کا ہے خود حجت نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہاں مقتول کا قول فی نفسہ حجت نہ تھا بلکہ حجت وحی تھی جس سے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ مقتول زندہ ہو کر جو کچھ کہے گا وہ صحیح ہوگا۔

یہ تو قصہ تھا اب میں اس کو منطبق کرنا چاہتا ہوں مقصود پر یعنی مضمون مجاہدہ پر۔ قربانی سے تو مناسبت اس قصہ کے جزو اول ہی کو تھی اس کا بیان تو بوجہ مناسبت زمانہ کے ضروری تھا ہی مگر چونکہ مجھے مجاہدہ سے بھی اس مضمون کی مناسبت بیان کرنا ہے اس لئے میں نے جزو اخیر کو بھی تلاوت کیا مجاہدہ کے مقصود سے اس کو مناسبت ہے اب یہ سمجھو کہ اس وقت میں جو کچھ بیان کروں گا وہ علم اعتبار ہوگا جو کہ تفسیر آیات نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس کو تفسیر سمجھا ہے وہی صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں مگر صوفیہ کی مراد علم اعتبار سے یہ نہیں ہے کہ نصوص کو

ظاہر سے منحرف کریں بلکہ ظاہر کو ظاہر پر رکھ کر پھر بطور قیاس کے امثال قرآنی کو وہ اپنے مقصود پر جاری کرتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کا قیاس ہے جس کی نصوص سے اجازت ہے جیسے فقہی قیاس کی اجازت ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ سورۂ حشر میں قصۂ بنی نضیر کے بیان کے بعد فرماتے ہیں فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ (اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو اس واقعہ سے) تو اب اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کا مطلب کیا ہے، یہی تو مطلب ہے کہ تم اپنے حال کو ان کے حال پر موازنہ کر کے دیکھو اگر تمہارے اندر اُن جیسے اعمال وخصائل ہوں گے تو سمجھ لو کہ یہی معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ اسی طرح عاد وثمود وغیرہ کے قصے بیان فرما کر ارشاد فرمایا ہے لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (البتہ ان کے قصوں میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے) اب بتلایا جائے کہ ان کے قصے میں عبرت کیا ہے یہی تو ہے کہ ان کے اعمال میں غور کر کے اپنے کو اُن سے بچائے یہی صوفیہ نے کیا ہے کہ قصص قرآنیہ کو وہ اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں وہ ان قصوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے (بلکہ ہر چیز کی نظیر اپنے اندر قائم کر کے مشبہ بہ کے احکام کو مشبہ پر جاری کرتے ہیں ۱۲)

مثلاً قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا قصہ فرعون کے ساتھ جا بجا مذکور ہوا ہے اس کی تفسیر صوفیہ کے نزدیک بھی وہی ہے جو کتب تفاسیر میں مذکور ہے موسیٰ علیہ السلام سے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور فرعون سے مراد خاص وہی شخص ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ تھا لیکن صوفیہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ تفسیر آیات کے بعد اس قصہ کو اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی ایک چیز موسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ہے یعنی روح یا عقل اور ایک چیز فرعون کے مشابہ ہے یعنی نفس اور جس طرح فرعون کا غلبہ موسیٰ علیہ السلام پر باعث فساد تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا غالب ہونا فرعون پر موجب صلاح

تھا اسی طرح نفس کا روح پر غالب ہونا موجب فساد ہے اور روح کا نفس پر غالب ہونا موجب صلاح ہے اس کے بعد وہ عام قصے کو روح و نفس کے معاملات پر منطبق کرتے چلے جاتے ہیں اب وہ کہتے ہیں کہ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (فرعون کی طرف جاؤ اس نے سرکشی کی ہے) کے معنی علم اعتبار کے طور پر یہ ہیں اِذْهَبْ اَیُّهَا الرُّوْحُ اِلَی النَّفْسِ اِنَّهٗ طَغٰی (اے روح نفس کی طرف جا اس نے سرکشی کی ہے) تو بتلایئے اس میں شرعاً کیا خرابی ہے۔ اس کی حقیقت قیاس فقہی کے قریب ہے۔ اتنا فرق ہے کہ قیاس کا نتیجہ بواسطہ قیاس مدلول نص ہے اور اعتبار کا نتیجہ مدلول نص نہیں بلکہ مدلول نص کے مشابہ ہے اور اسی فرق کا یہ اثر ہے کہ حکم قیاسی میں تو اگر مستقل نص نہ ہو تب بھی مقیس علیہ سے مقیس میں حکم کو متعدی کر سکتے ہیں اور حکم اعتباری میں اگر مستقل نص نہ ہو تو مشبہ بہ سے مشبہ میں حکم کو متعدی نہیں کر سکتے جیسے حدیث شریف میں ہے لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَیْتًا فِیْهِ كَلْبٌ (اس گھر میں فرشتہ نہیں آتا جس میں کتا ہو) اور اس سے بطور اعتبار یہ کہا گیا ہے کہ لَا تَدْخُلُ الْاَنْوَارُ الْاِلٰهِیَّۃُ قَلْبًا فِیْهِ صِفَاتٌ سَبُعِیَّۃٌ (نہیں ہوتے داخل انوار الٰہی اس دل میں جس میں بہائمی صفات ہوں) تو اگر یہ حکم کسی مستقل دلیل سے ثابت نہ ہو تو محض اس نص سے حکم کا تعدیہ نہیں کر سکتے اس لئے بجائے قیاس کے اگر اس کا نام تشبیہ رکھا جاوے تو مناسب ہے تاکہ خلط نہ ہو اور یہاں سے تسامح ظاہر ہو گیا ہو گا ان فقہاء کا جنھوں نے اقل مدت حیض کے تین دن ہونے پر اقل مدت سفر سے استدلال کیا ہے کہ دونوں حالت عارضی ہیں اور اقل مدت طہر پندرہ دن ہونے پر اقل مدت اقامت سے استدلال کیا ہے کہ دونوں حالت اصلی ہیں سو تشبیہ کو قیاس کہدیا ورنہ یقینی بات ہے کہ اگر مقیس میں مستقل دلیل نہ ہو تو ہرگز اس مقیس علیہ سے حکم مذکور کو متعدی نہیں کر سکتے البتہ اس تشبیہ سے ایک گونہ تائید و تقریب ضرور ہو گئی۔

شاید تم یہ کہو کہ دلائل سے تو علم اعتبار کا صحیح ہونا اور خلاف شرع نہ ہونا معلوم ہوگیا لیکن یہ بتلاؤ کہ اس کا ثبوت کہیں سلف سے بھی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں سلف سے بھی اس قسم کی نظائر منقول ہیں چنانچہ رزین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے جس کو تیسیر الوصول میں نقل کی ہے کہ انھوں نے ایک آیت میں اسی طرح کا مطلب بیان فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَلَمْ یَأْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب ملی تھی پھر ان پر ایک زمانہ گذر گیا پھر ان کے دل سخت ہوگئے اور بہت سے آدمی ان میں کے کافر ہیں)

اس میں تو خشوع کا امر ہے اور قساوت قلب سے بچنے کی تاکید اس کے بعد فرماتے ہیں اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (جان لو کہ حق تعالیٰ زمین کو بعد اس کے مردہ ہونے کے زندہ کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ یَلِیْنُ الْقُلُوْبُ بَعْدَ قَسْوَتِهَا فَیَجْعَلُهَا مُخْبِتَةً مُّنِیْبَةً یُحْیِی الْقُلُوْبَ الْمَیِّتَةَ بِالْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ وَاِلَّا فَقَدْ عُلِمَ اِحْیَاءُ الْاَرْضِ بِالْمَطَرِ مُشَاهَدَةً وَّمَقْصُوْدَةً اِنَّ هٰذَا مَثَلٌ ضَرَبَهُ اللّٰهُ لِعِبَادِهٖ وَیُرِیْدُ اَنَّ قُلُوْبَكُمْ كَالْاَرْضِ فَلَا تَیْئَسُوْا مِنْ قَسَاوَتِهَا فَاِنَّهَا تُحْیِیْ بِالْاَعْمَالِ كَالْاَرْضِ تُحْیِیْ بِالْغَیْثِ (حضرت ابن عباس رضہ نے فرمایا نرم کر دیا دل کو بعد ان کی قساوت کے کہ ان کو مردہ کر دیا تھا زندہ کر دیا مردہ دلوں کو علم و حکمت سے

ورنہ جان لیا تھا زمین کے زندہ ہونے کو بارش سے مشاہدہ سے اور یہ مثال ہے کہ بیان کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اور مراد یہ ہے کہ ان کے دل مثل زمین کے ہیں پس ان کی قساوت سے نا امید مت ہو زندہ کر دیں گے ان کو اعمال سے مثل زمین کے کہ اس کو بارش سے زندہ کرتے ہیں)

یعنی مقصود عبداللہ بن عباسؓ کا یہ ہے کہ (اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا الخ (جان لو کہ حق تعالیٰ زمین کو بعد مردہ ہونے زندہ کر دیتے ہیں) میں حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے ایک مثال بیان فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح زمین خشک ہو جانے کے بعد بارش سے زندہ ہو جاتی ہے اسی طرح قلوب بھی قساوت کے بعد اعمال صالحہ سے زندہ ہو جاتے ہیں پس اگر کسی کے قلب میں معاصی گذشتہ سے قساوت پیدا ہو گئی ہو تو وہ اصلاح سے مایوس نہ ہو کیونکہ زمین کی نظیر تمہارے لئے ہم نے بیان کر دی ہے اس پر اپنے قلوب کو بھی قیاس کر لو۔

تو اب دیکھ لو کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت میں ارض سے قلب مراد لیا اور موت سے قساوت یہی علم اعتبار ہے ورنہ لغۃً ارض کے معنی قلب اور موت کے معنے قساوت کے کہیں نہیں ہیں مگر انھوں نے آیت کو تشبیہ پر محمول کر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں۔ اسی طرح صوفیہ بطور تشبیہ کے کہدیتے ہیں کہ موسیٰ سے مراد روح اور فرعون سے مراد نفس ہے۔ وعلیٰ ھٰذا جب علم اعتبار کی نظیر سلف سے بھی منقول ہے اور قواعد شرع کے بھی وہ خلاف نہیں تو اب کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر میں علم اعتبار کے طور پر اس قصہ کو مضمون مجاہدہ پر منطبق کر کے بیان کر دوں۔ الغرض اس جگہ یہ ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل کو ذبح بقرہ کا امر ہوا تھا اور اہل لطائف علم اعتبار کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ گویا نفس کشی کا امر ہوا تھا۔ گویا بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی گئی ہے اور یہ تشبیہ بہت مناسب ہے کیونکہ گائے بیل بھی بہت حریص ہوتے ہیں کھانے پینے کے اور نفس بھی

بہت حریص ہوتا ہے اس لئے نفس کو بقرہ کہنا تو مناسب ہے لیکن آج کل نفس کو کتا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ شعراء کے کلام میں سگ نفس بکثرت مستعمل ہے مگر یہ واہیات ہے۔ اسی طرح بعض لوگ نفس کو کافر کہتے ہیں یہ اس سے بھی واہیات ہے۔ ہمارا نفس تو الحمد للہ نہ کتا ہے نہ کافر ہے۔ ہاں بقرہ تو ہوگا۔ نہ معلوم لوگ نفس کو کیا سمجھتے ہیں لغت میں تو نفس حقیقت شے کو کہتے ہیں۔ پس نفس زید حقیقت زید ہوئی تو حقیقت میں نفس ہمارا ہی نام ہے ہم سے الگ کوئی چیز تھوڑا ہی ہے تو اپنے کو کتا یا کافر کہنا کیا زیبا ہے اور اگر نفس کوئی مستقل چیز بھی ہو تب بھی اول تو وہ ہمیشہ شریر نہیں ہوتا کہ اس کو کتے سے تشبیہ دی جاوے بلکہ کبھی مطمئنہ ہوتا ہے کبھی لوامہ بھی ہوتا ہے کبھی امارہ ہوتا ہے۔

چنانچہ نصوص میں یہ تینوں صفات مذکور ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ (اور میں اپنے نفس کو بری نہیں بتلاتا نفس تو بری ہی بات بتلاتا ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے)

اور تیسری جگہ ارشاد ہے يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش ہو)

پھر اگر شریر بھی ہو تب بھی مسلمان تو ہے تو مسلمان کو کافر کہنا یا کتے سے تشبیہ دینا کیا مناسب ہے ہاں بقرہ کے ساتھ تشبیہ دینے کا مضائقہ نہیں غرض جس طرح بقرہ کے ذبح کا امر ہوا تھا اسی طرح نفس کو بھی مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیئے بدون مجاہدہ کے کامیابی نہیں ہوتی۔ بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے

بس ویسے ہی کامیاب ہو جائیں چنانچہ مشائخ سے کہتے ہیں کہ اپنے سینہ میں سے کچھ دیدو میں نے اس کے متعلق ایک وعظ میں یہ جواب دیا ہے کہ سینہ میں کیا رکھا ہے بجز بلغم کے مطلب یہ کہ جو بدون مجاہدہ کے تم کو دیا جا سکے وہ تو یہی ہے اور جس چیز کے تم طالب ہو وہ سینہ سے بدون مجاہدہ کے نہیں مل سکتی۔ میرے اس مضمون پر ایک صاحب نے بہت خفا ہو کر مجھے خط میں لکھا کہ تم نے طریق کی بہت بے ادبی کی حالانکہ سینہ ہی میں تو سب کچھ ہے صوفیہ تصریحاً فرماتے ہیں کہ نسبت مع اللہ کی دولت درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنی چاہیے چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مالا بدمنہ میں لکھتے ہیں۔ از سینۂ درویشاں باید جست (درویشوں کے سینہ سے ڈھونڈنا چاہیے) اور تم کہتے ہو کہ سینہ میں کیا رکھا ہے بجز بلغم کے۔ سو میرے پاس اس بات کا جواب تھا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ جو چیز سینہ سے بدون مجاہدہ طالب کے دی جا سکتی ہے وہ تو بلغم کے سوا کچھ نہیں اور جس چیز کو قاضی ثناء اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنی چاہیے میں اس کی نفی نہیں کرتا لیکن وہ مجاہدہ سے ملتی ہے بدون مجاہدہ کے نہیں مل سکتی مگر میں نے کچھ جواب نہیں دیا کیونکہ مجھے اس کے خط سے اندازہ ہو گیا تھا کہ مخاطب بھدی طبیعت کا ہے یہ خطاب کے قابل نہیں اس لئے میں نے حضرت حافظ رحمۃ اللہ تعالےٰ کے ارشاد پر عمل کیا وہ فرماتے ہیں ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار و مستی کی باتیں مت بیان کرو اس کو رنج خود پرستی میں مرنے دو)

اور گو جواب نہ دینے سے انہوں نے مجھ کو عاجز و لاجواب سمجھا ہو گا مگر میں نے اسکی پرواہ نہ کی۔ میں نے عارفین کی تقلید کی ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ صرف طالب کو جواب دیا کرتے ہیں مدعی کو جواب نہیں دیتے چاہے وہ ان پر کتنا ہی اعتراض

کرے اور ان کو جاہل ہی سمجھے بلکہ اگر کوئی ان سے یہ کہے کہ تم کو کچھ نہیں آتا تم کچھ نہیں جانتے تو وہ خوش ہو کر کہتے ہیں کہ ہاں بھائی تم سچ کہتے ہو مجھے کچھ نہیں آتا تم سب لوگوں سے کہدو کہ یہ جاہل ہے اسے کچھ نہیں آتا میں تمھارا ممنون ہوں گا یہ عارف ہی کر سکتا ہے علمار قشر ایسا نہیں کر سکتے ان کو تو اگر کوئی کہدے کہ تم کچھ نہیں جانتے تو فوراً غصہ آجائے اور اثبات کے در پے ہو جائیں مناظرہ پر آمادہ ہو جائیں کہ آؤ بحث کر لو ابھی معلوم ہو جائیگا کون جانتا ہے کون نہیں جانتا مگر عارف سے یہ نہیں ہو سکتا اس کو تو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ کوئی اس کو جاہل ہی سمجھتا رہے کیونکہ اچھا ہوا ایک معتقد کم ہوا پیچھا چھوٹا بلکہ وہ تو بعض دفعہ قصداً ایسی حرکت کرتا ہے جس سے معتقدین کم ہوں اور اس کا راز یہ ہے کہ وہ کیمیا گر ہے اور قاعدہ ہے کہ کیمیا گر یہ نہیں چاہا کرتا کہ لوگوں کو اس کا کیمیا گر ہونا معلوم ہو اور جو کوئی یہ کہدے کہ تجھے کیمیا کچھ بھی نہیں آتی اس سے وہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں بھائی واقعی مجھے کیمیا نہیں آتی تم سب سے یہی کہدو کہ مجھے پریشان نہ کریں اہل قشر کہتے ہیں کہ قصداً ایسی حرکت نہ کرنا چاہیے جس سے معتقد کم ہوں کیونکہ اس سے فیض اصلاح بند ہوتا ہے ہائے وہ اسی چکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح معتقد کم نہ ہوں اور دل میں تاویل کر لی ہے کہ ہمارا مقصود نفع خلق ہے۔ میاں بس جانے دو۔ ساری اصلاح آپ ہی پر تو موقوف ہے۔ بس لوگ آپ کے معتقد نہ ہوں گے تو ان کو کہیں سے فیض ہی نہ ملے گا۔ خدا کے سیکڑوں بندے صاحب ارشاد موجود ہیں تم نے فیض کو اپنے ہی اوپر کیوں منحصر سمجھ لیا ہے یاد رکھو تمہارے معتقد کم ہونے سے فیض بند نہیں ہو سکتا اسی لئے عارف ان تاویلوں پر کبھی توجہ نہیں کرتا بلکہ اس کو تو لوگوں کی بے اعتقادی سے خوشی ہوتی ہے اسے اپنے صاحب فیض ہونے کا وسوسہ بھی نہیں آتا۔ عارفین کا اصلی مذاق تو یہی ہے باقی جب اُن کے گلے ہی مڑھ دیا جائے کسی خدمت کو تو اس وقت وہ مجبور ہو کر اسے انجام دیتے ہیں مگر اس حالت میں بھی وہ ہر وقت اس کے لئے آمادہ ہوتے ہیں کہ

ان کا دنیا میں ایک بھی معتقد نہ رہے اسی لئے کسی کی بے اعتقادی سے ان کو رنج نہیں ہوتا نہ کسی کے جاہل کہنے سے غصہ آتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت اپنے فلاں مرید کو سمجھا دیجئے کہ وہ بے جا حرکتیں نہ کیا کرے ورنہ لوگ آپ سے بھی بد اعتقاد ہو جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میاں تمہارا جی چاہتا ہو بد اعتقاد ہونے کو تو تم ہو جاؤ دوسروں پر بات کیوں رکھتے ہو۔ پھر فرمایا کہ تم نے تو اپنے نزدیک یہ بڑی دھمکی دی کہ لوگ بدگمان ہو جائیں گے اور اگر کسی کو یہی مطلوب ہو کہ سب بد اعتقاد ہو جائیں تو؟ پھر فرمایا کہ واللہ مجھے تو تمہارے اعتقاد ہی نے پریشان کر رکھا ہے۔ بخدا میں چاہتا ہوں کہ سارا عالم مجھے زندیق و ملحد سمجھ کر چھوڑ دے اور میں اکیلا کسی پہاڑ میں بیٹھا ہوا اپنے محبوب میں مشغول ہوں اھ اور یہ حال ہو ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس محبوب سے دل باندھ لیا ہے تو پھر تمام جہان سے آنکھ بند کر لو)

اور اس کا راز یہ ہے کہ ان حضرات پر فنا کا غلبہ ہوتا ہے پھر جو اپنے کو فنا کر چکا وہ معتقدوں کی فوج جمع کرنا کیونکر چاہے گا اس کو تو واقعی مخلوق کے اعتقاد سے پریشانی ہوگی ان کا تو یہ حال ہوتا ہے ؎

تو در و گم شو وصال این ست و بس
گم شدن گم کن کمال این ست و بس

(تم محبوب میں فنا ہو جاؤ بس یہی وصال ہے اور اس فنا ہونے کو بھی بھول جاؤ بس یہی کمال ہے)

تو در و گم شو یہ تو فنا ہے اور گم شدن گم کن یہ فناء الفنا ہے کہ ایسا فنا ہو کہ اپنی فنا کی بھی خبر نہ ہو اور یہ مبالغہ شاعری نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے لوگ اس کو

شاعری مبالغہ سمجھے ہوں گے مگر میرے پاس ایک نظیر موجود ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ فناء کے لئے فناء الفناء لازم ہے وہ فناء ہی نہیں ہے جس میں اپنے فانی ہونے کی بھی خبر ہو دیکھئے نائم وہ ہے جس کو اپنی نوم کی بھی خبر نہ ہو اگر نائم کو اپنی نوم کی خبر ہوا ور وہ اتنی بات جانتا ہو کہ میں سو رہا ہوں تو وہ نائم نہیں ہے بیدار ہے نیند تو اسی کا نام ہے کہ سونے والے کو یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں سو رہا ہوں اسی طرح فناء وہی ہے جس میں اپنی فنا کی بھی خبر نہ ہوا ور جو شخص اپنے کو فانی سمجھتا ہے وہ فانی نہیں ہے بیدار ہے بلکہ مدعی ہے تو جس پر یہ حال غالب ہو فناء الفناء کا وہ بھلا معتقدین کی زیادتی سے کیا خوش ہو سکتا ہے وہ تو اس سے ہی خوش ہوگا کہ کوئی بھی اس کو نہ پہچانے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر چار حرفوں کی تہمت نہ لگی ہوتی تو میں ایسا اپنے کو غائب کرتا کہ کوئی یہ بھی نہ جانتا کہ میں دنیا میں پیدا بھی ہوا ہوں اھ مگر اس غائب نہ کر سکنے پر بھی آپ کی یہ حالت تھی کہ ایسی وضع سے رہتے تھے کہ دیکھ کر کوئی نہ پہچانتا تھا کہ یہ کوئی عالم ہیں۔ بس ایک لنگی گاڑھے کی کندھے پر ڈالے ہوئے رہا کرتے تھے۔ غدر میں مولانا کے پیچھے پولیس پھرتی تھی مگر کسی نے بھی آپ کو نہ پہچانا ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ مولانا مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے پولیس آئی اور خود مولانا ہی سے پوچھا کہ تم کو معلوم ہے کہ مولوی محمد قاسم صاحب کہاں ہیں تو آپ ذرا سا اپنی جگہ سے کھسک کر فرماتے ہیں کہ ابھی تو یہاں تھے، پولیس چلی گئی۔ سفر میں جب کبھی جاتے تو ساتھیوں کو نام بتلانے کی ممانعت تھی کہ میرا نام کسی سے ظاہر نہ کرنا۔ اور اگر کوئی آپ سے دریافت کرتا کہ آپ کا نام کیا ہے تو فرماتے میرا نام خورشید حسن ہے یہ مولانا کا شاید کسی تصرف سے تاریخی نام تھا مگر اسے کوئی جانتا بھی نہ تھا، مشہور نام محمد قاسم تھا وہ نہیں بتلایا کرتے تھے اگر کوئی وطن کا نام پوچھتا تو فرماتے اللہ آباد۔ ایک بار کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وطن تو نانوتہ ہے اللہ آباد کیسے ہو گیا۔ فرمایا نانوتہ

بھی تو خدا ہی نے آباد کیا ہے۔ بتلا دیا کہ معنی لغوی کے اعتبار سے وہ بھی الہ آباد ہے سبحان اللہ کیسا اخفاء حال تھا مگر باوجود اس اخفاء کے چھپے تھوڑا ہی رہتے تھے آخر عشاق نے پہچان ہی لیا طالبوں نے تاڑ ہی لیا پھر ایسے مشہور ہوئے کہ دنیا میں نام روشن ہے، بھلا آفتاب کہیں چھپ سکتا ہے۔ جب شاہجہانپور میں مباحثہ ہوا ہے مسلمانوں کا اور آریوں اور عیسائیوں کا تو مسلمانوں نے مولانا کو بھی بلایا تھا، مولانا تشریف لے گئے مگر وقت سے کچھ ہی پہلے پہونچے تھے اس لئے آپ سیدھے میدان مناظرہ میں تشریف لے گئے، صورت سے کسی نے بھی نہ پہچانا کہ یہ کوئی عالم ہیں۔ ایک نیلی لنگی موٹی سی سر پر ڈال رکھی تھی اس شان سے آپ پہونچے۔ لوگ سمجھے کہ کوئی معمولی آدمی ہیں مگر آپ کا سادہ حسن تکلف والوں کے حسن سے بڑھا ہوا تھا، بڑے بڑے جبے عمامے والے مولوی آپ کے حسن خداداد کے سامنے گرد تھے کیونکہ ؎

حُسْنُ الْحَضَارَةِ مَجْلُوْبٌ بِتَطْرِيَةٍ
وَفِي الْبَدَاوَةِ حُسْنٌ غَيْرُ مَجْلُوْبٍ

(شہریوں کا حسن بناوٹی ہوتا ہے اور دیہاتیوں کا حُسن خداداد ہے)

اور آپ کی یہ شان تھی ؎

دل فریبان بناتی ہمہ زیور بستند
دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

(دل فریبان بناتی زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے)

حسن خداداد کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت تھی عمامہ کی اور کیا ضرورت ہے جبہ کی ؎

حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را

غرض جب آپ تقریر کے لئے اٹھے ہیں اور تقریر فرمائی ہے تو تمام جلسہ محو حیرت تھا اس وقت مسلمانوں کے جان میں جان آئی اور مولانا کے تشریف نہ لانے کے خیال سے جو رنج ہو رہا تھا مبدل بخوشی ہوگیا۔ آپ کی تقریر میں ایسی خداداد شوکت تھی

کہ اسی زمانہ میں ایک ہندو نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ کہ شاہجہاں پور کے مناظرہ میں ایک نیلی لنگی والا چھوٹے قد کا مولوی سب سے جیت گیا حالانکہ اس ہندو نے شاید مولانا کی تقریر کا ایک لفظ بھی نہ سمجھا ہوگا مگر اتنی بات وہ بھی سمجھ گیا کہ یہ سب سے جیت گئے کیونکہ علوم و حقائق میں ایک نور اور ایک شوکت ہوتی ہے جو باطل میں کبھی نہیں ہو سکتی۔ حقائق کو سن کر ہر شخص کو اس کا غلبہ نظر آجاتا ہے گو وہ سمجھا بھی نہ ہو۔

صاحبو! یہ ہیں اصلی کمالات اور اس کا نام ہے علم۔ عمامہ اور جبہ پہننے سے تھوڑا ہی عالم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ بھاگلپور میں علماء کا اجتماع ہوا تھا مولوی انور شاہ صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ جلسہ میں پہلے بڑے بڑے عمامے اور جبے والے مولوی موجود تھے مگر ایک ہندو نے مولوی انور شاہ صاحب کو دیکھ کر کہا کہ یہ شخص اس مجمع میں سب سے بڑا عالم معلوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ نہ جبہ پہنے ہوئے تھے نہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ معمولی لباس میں تھے گویا اپنی طرف سے تو انھوں نے اپنے کو چھپانا چاہا تھا مگر علم و عمل کا نور کہاں چھپتا ہے وہ تو چہرہ سے عیاں ہوتا ہے۔ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں) سچ ہے ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی
نیک بیں باشی اگر اہل دلی
(ولی میں نور حق ظاہر ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو نیک بیں ہو)

اور اردو میں کسی نے ترجمہ کیا ہے ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور
(جو شخص انکساری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکا درجہ بلند کرتے ہیں)

مٹانے والوں کی شہرت ہو ہی جاتی ہے۔ حدیث میں وعدہ ہے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ۔ (جو شخص انکساری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتے ہیں) اور جو شخص اپنے کو بڑھانا چاہتا ہے حق تعالیٰ اس کو گرا دیتے ہیں اسی حدیث سے لازم آتا ہے کہ مَنْ تَکَبَّرَ وَضَعَہُ اللّٰہُ (جو شخص اپنے کو بڑھاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پست کر دیتے ہیں) پس اگر کسی کو شہرت ہی مطلوب ہو تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ فنا اختیار کرے اور طلب شہرت کو دل سے نکال دے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

یعنی دیکھو عنقا نے اپنے آپ کو غائب کر دیا تو اس کا کیسا نام ہوا اسی طرح تم فنا اختیار کرو تو حق تعالیٰ تم کو رفعت و شہرت عطا کریں گے طلب شہرت سے شہرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ (یہاں پہونچکر حضرت مولانا نے کاتب وعظ سے دریافت فرمایا کہ یہ مضمون کس بات پر چلا تھا۔ احقر نے عرض کیا کہ حضرت حاجی صاحب کی حکایت بیان ہو رہی تھی کہ آپ سے کسی نے عرض کیا کہ اپنے فلاں مرید کو سمجھا دیجئے ورنہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے الخ۔ فرمایا اس سے پہلے کیا بیان ہو رہا تھا، میں نے عرض کیا اس سے پہلے یہ مضمون تھا کہ نفس کو بقرہ سے تشبیہ دی گئی ہے تو جس طرح اُس کے ذبح کا امر ہوا تھا اس کو بھی مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیئے۔ فرمایا اس مضمون کے بعد اور حاجی صاحب کی حکایت سے پہلے درمیان میں کیا مضمون تھا وہ مضمون اس وقت نوٹ ہونے سے رہ گیا تھا۔ ختم وعظ پر یاد آیا تو نوٹ کیا گیا اس موقعہ پر میں نہ بتلا سکا چونکہ سلسلہ کا ربط اسی سے تھا اس لئے دیر تک حضرت سوچتے رہے کئی منٹ تک سوچنے کے بعد بھی جب یاد نہ آیا تو فرمایا کہ خیر یاد نہیں آتا تو نہ سہی اور ربط فوت ہو جائے تو کچھ حرج بھی نہیں کیا محبوب کی زلف ہمیشہ مسلسل ہی ہوا کرتی ہے۔

کبھی زلف[۱] پریشان بھی تو ہوتی ہے اور کیا موتی سب منظوم ہی ہوتے ہیں در منثور بھی تو ہوتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت نے تقریر شروع فرمائی جو عنقریب آتی ہے جس کا ربط احقر بیان کر دینا چاہتا ہے۔ یہ مضمون اس پر شروع ہوا تھا کہ جو چیز بزرگوں کے سینہ سے طلب کی جاتی ہے وہ بدون مجاہدہ کے حاصل نہیں ہوتی بدون مجاہدہ کے جو چیز سینہ سے حاصل ہو سکتی ہے وہ تو بلغم کے سوا کچھ نہیں اس پر فرمایا تھا کہ میں نے ایک وعظ میں یہی بات لکھدی ہے کہ سینہ میں بلغم کے سوا کیا رکھا ہے۔ اس کو دیکھ کر ایک صاحب مجھ پر بہت خفا ہوئے اور انھوں نے مجھے خط لکھا کہ تم نے طریق کی بہت بے ادبی کی۔ سینہ ہی سے تو سب کچھ ملتا ہے۔ پھر فرمایا کہ میں گو اس شخص کو جواب دے سکتا تھا مگر میں نے جواب نہیں دیا اور حضرت حافظ کے ارشاد پر عمل کیا ؎ با مدعی مگوئید الخ گو جواب نہ دینے سے وہ مجھے عاجز و لاجواب سمجھا ہوگا مگر میں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اس پر عارفین کے مذاق کا ذکر چلا تھا کہ وہ مدعی کو جواب نہیں دیا کرتے اور اگر کوئی ان کو جاہل سمجھے تو اس سے خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا ایک معتقد تو کم ہوا۔ اور یہ سارا بیان اس پر چلا تھا کہ اس آیت میں ذبح بقرہ کا امر ہوا ہے جس سے اہل لطائف نے نفس مراد لیا ہے کہ اس کو مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہئے۔ کیونکہ بدون مجاہدہ کے کامیابی نہیں ہوتی۔ بعض لوگ بدون مجاہدہ کے کامیاب ہونا چاہتے ہیں اور مشائخ سے کہتے ہیں کہ اپنے سینہ سے کچھ دیدو یہ ان کی غلطی ہے ۱۲ جامع)

بہرحال آیت میں بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی گئی ہے جس طرح بقرہ کے ذبح کا حکم ہے نفس کے ذبح کا بھی حکم ہے مگر بقرہ کا ذبح چھری سے ہوتا ہے اور نفس کا ذبح مجاہدہ سے ہوتا ہے۔ کوئی صاحب ذبح نفس کے ظاہری معنی

---

[۱] کما قال شاعر ؎ قبا وا کردہ و کاکل پریشاں کردہ می آید
بہ بیں ایں بے سر و ساماں چہ ساماں کردہ می آید
(قبا کھولے ہوئے کاکل بکھرے ہوئے آتا ہے دیکھو اس بے سر و سامانی میں کس سر و سامان کے ساتھ آتا ہے)

نہ سمجھ جائیں کہ بس لگیں خود کشی کرنے بلکہ ذبح نفس کے معنی مجاہدہ کے ہیں جس کی حقیقت عنقریب ظاہر ہو جائے گی۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انبیاء علیہم السّلام کے سنن میں سے ہے گائے کا ذبح کرنا اور بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو گائے کے گوشت سے رغبت بھی تھی۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں وارد ہے فَجَآءَ بِعِجۡلٍ حَنِیۡذٍ کہ وہ اپنے مہمانوں کے سامنے بچھڑے کا گوشت بھنا ہوا لائے۔ اور ظاہر ہے کہ مہمان کے لئے وہی چیز لاتے ہیں جو اپنی مرغوب ہوتی ہے۔ اب آجکل لوگ کہتے ہیں کہ گائے کا گوشت سودا پیدا کرتا ہے، ہاں صاحب اب پیدا کرنے لگا ہوگا۔ (یعنی جب سے کہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد و اتفاق کا خیال پیدا ہوا ۱۲ جامع) پہلے تو کبھی اس نے سودا نہ پیدا کیا یعنی اس ضرر کا کبھی ذکر نہ کیا گیا۔ پھر میں کہتا ہوں کہ وہ کونسی چیز ہے جو سودا صفرا پیدا نہیں کرتی۔ انسان میں صفرا، بلغم، سودا اور خون کے سوا اور ہے کیا اور ہر خوردنی چیز ان میں سے کسی نہ کسی کو ضرور مضر ہوتی ہے، کوئی دوا یا غذا ایسی نہیں جو بہمہ وجوہ نافع ہو اور کسی خلط انسانی کو مضر نہ ہو۔ کتب طب اٹھا کر دیکھو ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نقصان ضرور ہے۔ دودھ کی بہت تعریف کی جاتی ہے ذرا طب کی کتابوں میں دیکھو کہ اس کے نقصانات کس درجہ لکھے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ گائے کے گوشت کے قریب ہی قریب مضر نکلے گا تو یہ سب بہانے ہیں جو آجکل تراشے گئے ہیں پہلے ان کا کوئی نام بھی نہ لیتا تھا۔

غرض ابراہیم علیہ السّلام کے قصہ میں قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام گائے کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ پس ہمارے واسطے ذبح بقرہ کے لئے یہ دلیل کافی ہے پہلے زمانہ میں سواری کا زیادہ کام اونٹ سے لیا جاتا تھا بیلوں سے سواری کا کام نہ لیا جاتا تھا پس یہ تو کھیتی کے کام آتا تھا یا کھانے کے کام میں آتا تھا اور واقعی سواری کے لئے اونٹ ہی موزوں ہے کیونکہ وہ

بڑا قانع جانور ہے۔ تھوڑی سی غذا اس کے لئے کافی ہے اور ایک دن پانی پی کر کئی کئی دن تک پانی سے صبر کر سکتا ہے۔ پھر اس کی غذا بھی کچھ گراں نہیں درختوں کے پتوں پر اکتفا کر لیتا ہے اور بیل تو ہاؤ ہپ ہے اس کے لئے تو چارہ کا گٹھڑ ہونا چاہیئے پھر دانہ الگ چاہیئے اس لئے سواری میں اس سے اونٹ کی برابر راحت نہیں مل سکتی علاوہ اس کے اونٹ میں بیل سے قوت بھی زیادہ ہے۔ جتنا بوجھ وہ لے جا سکتا ہے بیل نہیں لے جا سکتا۔ اس لئے پہلے زمانہ میں بیل سے سواری کا کام نہ لیتے تھے بس یہ تو کھانے ہی کے کام میں آتا تھا یا کھیتی میں چلتا تھا اور تماشا ہے کہ جیسے عرب کے اندر قناعت کا مادہ بہت زیادہ ہے تو وہاں کے جانوروں میں بھی یہ صفت موجود ہے۔ چنانچہ اونٹ کو زمین عرب سے خصوصیت ہے تو اس میں سب جانوروں سے زیادہ قناعت ہے۔ اور ہندوستان کے لوگوں میں حرص کا مادہ زیادہ ہے تو یہاں کے جانوروں میں بھی اسی صفت کا غلبہ ہے چنانچہ بیل اور گائے کو زمین ہندوستان سے خصوصیت ہے تو دیکھ لیجئے اس میں کتنی حرص ہے کہ ہر وقت اس کا منہ ہی چلتا رہتا ہے جیسے خود ہم ہیں۔

سرسید نے غضب کیا ہے کہ عرب کی مذمت لکھتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ اس قوم میں کینہ بہت ہے حتّٰی کہ وہاں کے جانوروں میں بھی اس صفت کا غلبہ ہے چنانچہ شتر کینہ مشہور ہے مولوی محمد علی صاحب نے سرسید کی تفسیر کے رد میں ایک کتاب آکبرہان بہت ہی عمدہ لکھی ہے۔ بڑی قابلیت سے جواب دیا ہے انھوں نے اس اعتراض کا بھی بڑا عمدہ جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ اول تو جانوروں کے اخلاق سے انسانوں کے اخلاق پر استدلال کرنا یہ عجیب طریقہ استدلال ہے پھر ہم سید صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شتر کینہ جو مشہور ہے یہ عرب کا محاورہ ہے یا فارس کا ظاہر ہے کہ یہ عرب کا محاورہ نہیں فارس کا ہے تو اس سے بہت سے بہت یہ لازم آیا کہ فارس کے اونٹوں میں کینہ ہوتا ہوگا۔ عرب کے اونٹوں میں اس صفت کا ہونا کیسے لازم آیا۔ (بقیہ حاشیہ)

اور اگر مان لیا جائے کہ عرب کے اونٹوں میں بھی یہ صفت ہے تو آپ نے اس کے ایک عیب کو تو دیکھ لیا اس کی دوسری خوبیوں کو بھی تو بیان کیا ہوتا ؎

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

(شراب کے تمام عیب تو تم نے بیان کر دیئے اس کے ہنر بھی بیان کرو)

اونٹ میں اگر ایک عیب کینہ کا ہے تو ہزار باتیں مدح کی ہیں اُس میں تحمل وجفا کشی بہت ہے، قناعت کا مادہ بہت ہے عرب کے اونٹ مطیع و منقاد بہت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ جہاں کسی نے اونٹ پر سوار ہونے کے لئے اس کی گردن کو جُھکایا وہ فوراً گردن کو زمین پر رکھ دیتا ہے پھر سوار کے پاؤں رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ اس کو اس طرح اٹھاتا ہے کہ سوار نہایت سہولت سے پشت پر پہنچ جاتا ہے۔ لوگ کثرت سے اسی طرح چڑھتے اُترتے ہیں۔ اونٹ کی لمبی گردن سیڑھی کا کام دیتی ہے۔ تو اگر اس کے ایک عیب سے عرب کے ایک عیب پر استدلال کیا گیا ہے تو اس کی ان خوبیوں سے بھی تو اہل عرب کی خوبیوں پر استدلال کیا ہوتا۔ پھر عرب میں جہاں اونٹ ہیں وہاں گھوڑے بھی تو ہیں جن کی اصالت ونجابت وشرافت ضرب المثل ہے کہ وہاں کے گھوڑے مالک کے ساتھ ایسے وفادار ہوتے ہیں جس کو سب جانتے ہیں (لڑائی میں جہاں عربی گھوڑا دیکھتا ہے کہ میرا مالک زخمی ہو کر گرا چاہتا ہے تو وہ اس وقت دشمن پر حملہ کر کے اور مالک کے پاس سے لوگوں کو ہٹا کر میدان سے اس کو لے بھاگتا ہے ۱۲) اگر یہی طریقۂ استدلال ہے تو گھوڑوں کی ان صفات حمیدہ سے بھی تو اہلِ عرب کے کمالات پر استدلال کرنا چاہئے تھا۔ مگر کچھ نہیں آجکل لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ اہلِ عرب کی جہالت و وحشت کو بہت ہی غلط اور بدنما بھدے عنوان سے بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال ثابت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایسے جاہلوں کی اصلاح کی ایسے وحشیوں کو

متمدن بنایا ان لوگوں کی نیت تو اچھی ہے مگر عنوان نہایت بُرا ہے۔ اول تو بات اتنی کہنا چاہیئے جتنی اصلیت ہو اہل عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جہالت و وحشت ضرور تھی مگر نہ اتنی جتنی یہ لوگ بیان کرتے ہیں پھر جتنی جہالت تھی اُس کے ساتھ ان کے کمالات و صفات حمیدہ کو بھی تو بیان کرنا چاہیئے جو اُن میں خود زمانہ جہالت میں تھیں۔ اہل عرب میں ہمیشہ سے شجاعت کا جوہر موجود تھا زبان کے بڑے پکّے تھے جھوٹ بولنا جانتے ہی نہ تھے وفا عہد اُن کی ضرب المثل ہے خیانت سے بہت ہی نفرت کرتے تھے مہمان نواز اور سخی نمبر اول کے تھے اور ایک بات تو ان میں ایسی تھی جو دنیا کی کسی قوم میں بھی نہ تھی وہ یہ کہ جب وہ دشمنوں کے ساتھ اپنے مقابلہ اور لڑائی کا ذکر کرتے ہیں تو دشمن کی شجاعت و بہادری کا دل کھول کر تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ ایسے بہادر، ایسے کریم، ایسے دلیر تھے حتیٰ کہ کبھی مقابلہ میں اپنا پسپا ہونا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ غرض دشمنوں کی تعریف کرنا یہ اہلِ عرب کی خاص صفت ہے اس پہلو کو بھی بیان کرنا چاہیئے تاکہ ناظرین و سامعین کو اہلِ عرب سے نفرت نہ ہو ان کی نظروں میں یہ قوم ذلیل نہ ہو مسلمان کا دل اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل و حقیر کرے اور اس طرح اُن کا ذکر کرے جس سے قلوب میں اُن سے نفرت پیدا ہو۔ جیسا سر سید نے کیا ہے اس لئے مولانا محمد علی صاحب کو غصہ آیا اور اُس کا خوب جواب دیا۔ خدا تعالےٰ اُن کو جزائے خیر دے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ نفس کو بقرہ کے ساتھ تشبیہ دینا بہت ہی مناسب ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ ط

یعنی حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ وہ بقرہ (جس کے ذبح کا حکم ہوا ہے) نہ تو بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچّہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو دونوں عمروں کے اوسط میں۔ لغت میں فارض کے معنی منقطع العمر ہیں یعنی جس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ قطع کر لیا ہو فرض کے معنی قطع ہیں

تو فارض کے معنی بہت بوڑھے کے ہوئے اور بکر کہتے ہیں اس نر یا مادہ کو جو دوسرے سے جفت نہ ہوا ہو اور جانور عادۃً جوانی سے پہلے ہی بکر رہتا ہے جوان ہونے کے بعد بکر نہیں رہتا پس بکر کے معنی یہاں بچہ کے ہیں۔ جو ابھی تک جوان نہ ہوا ہو مطلب یہ ہوا کہ وہ بقرہ نہ بچہ ہو نہ بوڑھا ہو بلکہ ان دونوں عمروں کے درمیان ہو جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ جوان ہو کیونکہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان جوانی ہی کا درجہ ہے۔ اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ علم اعتبار کے طور پر بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی جاتی ہے تو اس صفت کو بھی نفس پر جاری کرنا چاہیئے جس سے اشارۃً یہ ثابت ہوا کہ جوانی میں مجاہدۂ نفس کی زیادہ فضلیت ہے کیونکہ اس وقت غلبۂ قوت نفس کے سبب مجاہدہ شاق ہوتا ہے۔ وَالْاَجْرُ بِحَسْبِ الْمَشَقَّةِ (یعنی ثواب اعمال کا مشقّت کے موافق ہے) جس عمل میں زیادہ مشقت ہو وہ اُس سے افضل ہے جس میں مشقت کم ہو۔ نیز قوت بدن کے سبب عمل بھی زیادہ ہے اور ظاہر ہے کہ کثرت عمل موجب ہوگا کثرت ثواب کا اور اس سے لازم یہ آتا ہے کہ بچپن اور بڑھاپے میں مجاہدہ کرنا جوانی کے مجاہدہ کی برابر نہ ہو مگر یہاں ایک سوال وجواب ضروری ہے وہ یہ کہ جوانی کے مجاہدہ میں دو درجے ہیں ایک یہ کہ جوانی میں مجاہدہ کرتے ہوئے کام زیادہ کیا یا مقاومت نفس میں مشقت زیادہ برداشت کرنا پڑی اور اتنا کام اور اتنی مشقت بچپن اور بڑھاپے میں نہ کرنا پڑی اس صورت میں تو جوانی کے مجاہدہ کا بچپن کے اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے افضل ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس وقت عمل اکثر واشد ہوا تو قرب واجر بھی زیادہ ہوگا۔ اور ایک درجہ یہ ہے کہ جوانی میں بحالت مجاہدہ عمل زیادہ نہیں کیا مشقت زیادہ ہوئی بلکہ اتفاق سے کسی محل میں عمل و مشقت اُتنی ہی کرنا پڑی جتنی بچپن یا بڑھاپے کے مجاہدہ میں ہوتی تو کیا اس صورت میں بھی جوانی کا مجاہدہ بچپن اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے افضل ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں جوانی اور بڑھاپے کا مجاہدہ برابر ہو کیونکہ مجاہدۂ

شباب کی فضیلت بوجہ شدت وکثرت عمل کے تھی اور وہ اس صورت میں مفقود ہے مگر یہ اس نفس سے مدلول بالا بالا عتبار کے خلاف ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ جوانی کا مجاہدہ مطلقاً افضل ہے خواہ اس میں مشقت وعمل زمانہ شیخوخت وصبا کے برابر ہو یا زیادہ ہو اور اس مدلول اعتباری کی تائید بعض احادیث کے اطلاق سے بھی ہوتی ہے جو عنقریب آتی ہے۔ وشاب نشأ فی عبادۃ اللہ (اور جوان جس نے شروع کی جوانی اپنے پروردگار کی عبادت میں) اگرچہ اُس میں بھی احتمال معلل بالمشقۃ ہونے کا ہوسکتا ہے لیکن اطلاق لفظ پر اور بعض عبادات کے خالی عن المشقۃ ہونے پر نظر کرنے سے اس مدلول اعتباری کی تائید کو راجح کہا جاسکتا ہے اور اس صورت میں اس پر ایک سخت اشکال ہوگا وہ یہ کہ اس صورت میں صرف شباب کی وجہ سے بدون زیادت عمل کے قرب واجر کا زیادہ ہونا لازم آتا ہے اور شباب امر غیر اختیاری ہے تو لازم آیا کہ ایک امر غیر اختیاری کی وجہ سے اجر و قرب زیادہ ہوگیا حالانکہ صوفیہ کا قول ہے کہ قرب میں امور غیر اختیاریہ کو دخل نہیں یہ اشکال اس کی ایک نظیر میں کہ وہاں یہ حکم یقینی ہے مجھے برسوں رہا اور وہ نظیر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اولیاء سے مطلقاً افضل ہیں خواہ انبیاء کے اعمال اولیاء سے زیادہ ہوں یا برابر ہوں یا کم ہوں تو یقیناً وجہ افضلیت محض نبوت ہے اور ظاہر ہے کہ نبوت امر غیر اختیاری ہے یہاں بھی وہی اشکال ہے کہ امر غیر اختیاری کو زیادت قرب میں دخل ہوا حالانکہ صوفیہ کی تصریح ہے کہ امور غیر اختیاری کو قرب میں دخل نہیں یہ اشکال کئی سال تک حل نہ ہوا اور نہ میں نے کسی سے پوچھا چاہے کوئی اس کو میرا تکبر ہی سمجھے مگر میں نے کسی کی طرف اس لئے رجوع نہیں کیا کہ مجھے حل کی امید نہ تھی اور وجہ امید نہ ہونے کی یہ تھی کہ لوگ آج کل علوم تصوف کو فضول سمجھتے ہیں گو اعمال واشغال کا اہتمام تو کسی قدر ہے مگر علوم سے بہت ہی بے التفاتی ہے جس درجہ میں دیگر فنون کو حاصل کرنے اور پڑھنے پڑھانے ہیں اس طرح اس کی طرف توجہ نہیں ہے اس لئے اشکالات تصوف کی وقعت اور

اُن کے حل کی طرف التفات بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا اس لئے میں نے کسی سے رجوع نہ کیا ہاں حق تعالٰی کی طرف رجوع کرتا رہا چنانچہ بحمد للہ کئی سال کے بعد یہ اشکال رفع ہوا۔ حل اس کا یہ ہوا کہ قول اکابر میں ایک ذرا سی قید محذوف ہے وہ جو یہ فرماتے ہیں کہ قرب میں امور غیر اختیاریہ کو دخل نہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ قرب ماموربہ میں ان امور کو دخل نہیں پس ان کے کلام میں ماموربہ کی قید گو مذکور نہیں مگر مراد ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب ماموربہ جس کی تفصیل کا انسان مکلف ہے اس میں تو صرف امور اختیاریہ ہی کو دخل ہے غیر اختیاری امور کو کچھ دخل نہیں ورنہ مامور کا غیر اختیاری شے پر موقوف ہونا لازم آئے گا۔ اور یہ نص کے خلاف ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالٰی کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے)۔ دوسرے قرب موہوب جس کی تحصیل کا بندہ کو مکلف نہیں کیا گیا بلکہ وہ وہب حق سے حاصل ہوتا ہے اور امور غیر اختیاریہ میں قرب موہوب میں داخل ہو سکتا ہے کیونکہ یہ قرب ہی خود اختیاری نہیں بلکہ غیر اختیاری ہے تو غیر اختیاری میں کسی غیر اختیاری کا دخیل ہونا مستبعد نہیں پس اب اشکال جاتا رہا کیونکہ نبوت سے جو قرب ہوتا ہے وہ قرب غیر ماموربہ یعنی وہبی ہے تو اس میں نبوت کو دخل ہو سکتا ہے جو کہ امر غیر اختیاری ہے۔ اسی طرح جوانی کا مجاہدہ بچپن اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے مطلقاً افضل ہونے میں بھی کچھ اشکال نہیں بلکہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ گو جوانی کے مجاہدہ میں مشقت و عمل زیادہ بھی نہ ہو جب بھی وہ زمانہ صبا و کہولت کے مجاہدہ سے افضل ہے جیسا کہ اس مقام پر اعتبار نص کا بھی مقتضا ہے۔ دوسرے ایک حدیث سے بھی جس میں چند شخصوں کے لئے قیامت میں ظل عرش کی بشارت وارد ہے یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ اس کا ایک جملہ یہ ہے وَشَابٌّ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ رَبِّهٖ (اور جوان جو شروع جوانی سے اپنے پروردگار کی عبادت میں ہے) اس کے اطلاق سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود شاب ہی کو فضیلت میں دخل ضرور ہے مگر یہ فضیلت موہوب اور غیر ماموربہ ہے ماموربہ اور مکتسب نہیں اس میں صرف اعمال اختیاریہ کو دخل ہوتا ہے

الحمدللہ حق تعالیٰ نے یہ علم عظیم عطا فرمایا جس سے بہت اشکالات حل ہوگئے اور علوم کا باب مفتوح ہوگیا۔ اب میں یہ بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اس علم عظیم کی تفصیل بیان کرنے سے اس وقت مقصود کیا ہے تو سمجھئے کہ میرا مقصود یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے جوانی میں مجاہدہ نہ کیا ہو اور اب بڑھاپے میں مجاہدہ شروع کرنا چاہے تو وہ عبادت شباب کی فضیلت سن کر مایوس نہ ہو کہ مجھے اب مجاہدہ سے ثواب ہی کیا ملیگا شباب تو رہا ہی نہیں بلکہ اس کو جان لینا چاہیئے کہ قرب مامور بہ اس کو بھی مجاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ اس کا مدار اعمال اختیاریہ پر ہے جن میں بوڑھا جوان برابر ہے باقی جس قرب میں شباب کو دخل ہے یعنی قرب غیر مامور بہ سو اس کی تمنا بھی بوڑھے کو نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ تو اس کے حق میں لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ (مت تمنا کرو اس چیز کی جس سے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) میں داخل ہے جس میں فضائل غیر اختیاریہ کی تمنا سے منع کیا گیا ہے۔ الغرض یہ بات واضح ہوگئی کہ قرب مامور بہ ہر شخص کو مجاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے اور مطلوب یہی ہے۔ اور اس کی طلب و تمنا بھی جائز ہے پس بوڑھے کو بھی مجاہدہ کے ثمرات مکتسبہ سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ رہا یہ کہ بڑھاپے میں خود مجاہدہ کی ہی ہمت اور طاقت کہاں رہتی ہے جس سے اکتساب قرب کیا جاوے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ بوڑھے سے اس درجہ کا مجاہدہ مطلوب نہیں ہے جس درجہ کا جوان سے مطلوب ہے جوان کو جو نفع مجاہدہ شدیدہ سے ہوسکتا ہے بوڑھے کو وہی نفع مجاہدہ غیر شدیدہ سے ہوسکتا ہے کیونکہ اس کے لئے وہ ہی شدیدہ ہے۔ غرض ہر شخص کے لئے مجاہدہ کا ایک ہی طریقہ نہیں ہے بلکہ محقق ہر شخص کے مناسب مجاہدہ تجویز کیا کرتا ہے یہ کام عطائیوں کا ہے کہ وہ سب کو ایک ہی لکڑی ہانکتے ہیں کہ جو آتا ہے اس کو ایک ہی وظیفہ بتلاتے ہیں کہ جو بیس ہزار یا بارہ ہزار دفعہ اسم ذات پڑھا کرو بوڑھا ہو یا جوان سب سے چکی ہی پسواتے ہیں۔ عارف شیرازیؒ ایسے ہی لوگوں کی شکایت فرماتے ہیں ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

(کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو اگر تم ان پر زیادتی کرو تو یہ مروت کی شرط کے خلاف ہے۔)

بیداد یہی ہے کہ تم نے ایک کمزور کو وہ کام بتلا دیا جو قوی کے مناسب تھا ۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چار پا را قدر طاقت بار نہ بر ضعیفان قدر ہمت کار نہ

طفل را گر نان دہی بر جائے شیر طفل مسکین را ازاں نان مردہ گیر

(چار پاؤں پر ان کی طاقت کے موافق بوجھ رکھو، کمزوروں کو ان کی ہمت کے موافق کام دو۔ بچہ کو اگر روٹی دودھ کے بدلے دو تو بچہ کو مردہ سمجھ لو)

بچہ کو اگر دودھ کی جگہ روٹی دینے لگو تو ظاہر ہے چند روز میں سدہ کی تکلیف سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ محقق ایسا کبھی نہیں کرتا وہ ہر شخص کی دماغی اور جسمانی قوت کا لحاظ کر کے مجاہدہ تجویز کرتا ہے نیز فراغت و عدم فراغت کی رعایت کرتا ہے دو شخص قوی تندرست ہیں مگر ان میں ایک فارغ ہے دوسرا اہل و عیال وغیرہ میں مشغول ہے وہ ان دونوں کے لئے بھی یکساں دستور العمل تجویز نہ کرے گا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ واقعی اس طریق کے مجدد و حکیم تھے ۔ حضرت کے یہاں ہر شخص کے لئے جدا تعلیم تھی۔ کسی کو صرف تلاوت قرآن کی تعلیم فرماتے تھے کسی کو محض کثرت نوافل، کسی کو ذکر اللہ پھر اس میں بھی کسی کو ذکر خفی کسی کو ذکر جہر کسی کو چوبیس ہزار دفعہ کسی کو بارہ ہزار کسی کو دو تین ہزار حتیٰ کہ حضرت نے بعض لوگوں کو صرف یہ بتلایا کہ بعد ہر نماز کے تین دفعہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ لیا کرو اور بعضوں کو یہ بتلایا کہ خانقاہ والوں کی خدمت کیا کرو جیسے پانی بھرنا، ان کے لئے گوشت روٹی لا دینا ان کی جوتیاں سیدھی کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اور بحمد للہ جس کو جو بتلا دیا وہ اُسی سے کامیاب ہو گیا تو یہ حضرات ہیں حکیم نہ وہ کہ محض گل بنفشہ یاد کرے اور ہر ایک کو وہی پلایا کرے جیسے ایک حکیم کے لڑکے کا قصہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ایک مریض کے دیکھنے کو گیا کہ حکیم نے نبض دیکھ کر کہا شاید آپ نے نارنگی کھائی ہے۔ مریض نے اقرار کیا کہ واقعی

نارنگی کھائی تھی لڑکے نے باپ سے پوچھا تھا کو نبض سے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے کہا نبض سے تو صرف برودت کا غلبہ معلوم ہوا تھا پھر وہاں اتفاق سے نارنگی کے چھلکے پڑے تھے اس سے بس سمجھا کہ نارنگی کا استعمال کیا ہے بس اب بیوقوف لڑکے کے یہ نسخہ ہاتھ آگیا کہ جس مریض کے پاس جو چیز پڑی ہوئی نظر آیا کرے وہ وہی کھایا کرتا ہے چنانچہ باپ کے انتقال کے بعد جب ان کا دورہ ہوا تو یہ کسی مریض کو دیکھنے گئے آپ نے نبض دیکھی پھر اس قاعدہ کے موافق چارپائی کے نیچے نظر دوڑائی تو وہاں نمدہ پڑا ہوا دیکھا تو آپ مریض سے کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آپ نے نمدہ کھایا ہے لوگ ہنسنے لگے مریض نے کہا نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے تو آپ کہتے نبض سے تو یہی معلوم ہوتا ہے اس نے نوکروں سے کہا نکالو اس بیوقوف کو اس کی دُم میں نمدہ۔ تو ایسے ہی جو شیخ عطائی ہوتا ہے وہ دو چار اشغال یاد کر کے سب کو وہی بتلاتا ہے یہ نہیں دیکھتا کہ یہ تعلیم اس شخص کے مناسب ہے یا نہیں شیوخ کو محقق ہونا چاہیئے کہ جیسی استعداد و قوت ہو ویسی تجویز ہو۔ پس بوڑھوں اور کمزوروں کو مجاہدہ سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ اُن سے چکی نہ پسوائی جائے گی۔ بلکہ اُن کی طاقت و ہمت کے موافق کام بتلایا جائے گا بشرطیکہ وہ کسی محقق کے پاس پہنچ جائیں۔ پھر جو کچھ وہ تم کو بتلائے اس میں اپنی تجویز کو دخل نہ دو اپنی طرف سے کچھ کچھ تجویزیں کر کے اس کے سامنے پیش کرو کہ حضرت میں یہ بھی کر لیا کروں حضرت میں وہ بھی کر لیا کروں۔ بلکہ سب کام اسی پر چھوڑ دو وہ تمہاری مصلحت کو تم سے زیادہ جانتا ہے ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

(امر مباح جو طریقت کے خلاف مرتے سے منکر معلوم ہوتا ہو اگر مرشد بتلادے تو اس پر عمل کرے اس کو حقیر نہ سمجھے کیونکہ شیخ کو اس کے نشیب و فراز کا زیادہ تجربہ ہے)

پھر ان شاء اللہ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے مگر ایک شرط اور ہے وہ یہ کہ جو کچھ تم کو بتلادے اس پر عمل کر کے اپنے حالات و کیفیات سے اُسے اطلاع بھی دیتے رہو محض اس کے کشف کے

بھروسہ پر نہ رہو کیونکہ اول تو شیخ کا صاحب کشف ہونا لازم نہیں اور ہو بھی تو کشف کے لئے دوام لازم نہیں کہ ہر وقت ہوا کرے اور ہر وقت بھی ہو تو شیخ تمہاری طلب کا بھی تو منتظر ہے۔ دیکھو حق تعالیٰ کو تو سب کا حال معلوم ہے وہاں تو کسی کے بتلانے کی کچھ ضرورت نہیں مگر طلب کے بغیر وہ بھی کچھ نہیں دیتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اَنُلْزِمُكُمُوهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ کیا ہم اپنی نعمت کو تم پر چپکا دیں حالانکہ تم اس سے کراہت کر رہے ہو تو بدون طلب کے حق تعالیٰ کے یہاں سے بھی نہیں ملتا وہاں بھی اظہار طلب کی ضرورت ہے حالانکہ وہاں شان یہ ہے ؎

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن — کہ حال خستہ دلاں نیز اتو خوب میدانی

(تیرے سامنے دل کا حال بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے اس لئے کہ خستہ دلوں کا حال تو خوب جانتا ہے)

واقعی حق تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے کسی کے اظہار کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی اظہار کا امر اس لئے ہے تاکہ تمہارا عجز ظاہر ہو تم ناک رگڑو گریہ وزاری کرو ان کو یہ ادا پسند ہے اس لئے دعا وغیرہ کی ضرورت ہے پھر مشائخ سے بدون اظہار طلب کے تم کیونکر فیض لینا چاہتے ہو وہ تو انسان ہیں، محتاج بھی ہیں مستغنی نہیں ہیں ان کو اگر تمہارے اظہار طلب کا انتظار ہو تو کیا تعجب ہے اس کے بعد بقرہ کی ایک صفت یہاں پر یہ مذکور ہے قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ۔ یعنی ارشاد ہے کہ وہ بقرہ زرد رنگ کی ہو (کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو) اس صفت کو بھی نفس سے مناسبت ہے کیونکہ صوفیہ کو لطیفۂ نفس کا رنگ بھی زرد ہی مکشوف ہوا ہے اور اس کو لطیفہ میں لے اصطلاح کے اعتبار سے کہہ دیا اور وہ اصطلاح بھی تغلیب پر مبنی ہے ورنہ وہ تو کثیفہ ہے۔ البتہ مجاہدہ سے مطمئن ہونے کے بعد ایک معنی کر لطیفہ ہی بن جاتا ہے۔ ایک صفت بقرہ کی یہ ہے لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا کہ وہ بقرہ کام کاج میں مستعمل نہ ہو نہ زمین کو جوتتا ہو نہ کھیت کو پانی دیتا ہے (اس میں داغ دھبہ نہ ہو) اس میں اشارہ ہے نفس کے فراغ کی طرف یعنی مجاہدہ سے پہلے

نفس کو تمام افکار و تعلقات سے فارغ کر کے یکسو ہو کر مجاہدہ کرنا چاہیئے کہ اسی حالت میں مجاہدہ کا اثر پورا ظاہر ہوتا ہے کچھ دنوں کے لئے سارے کاروبار کسی کے سپرد کر کے عزلت گزیں ہو کر مجاہدہ کرو پھر دیکھو کہ کتنی جلدی اثر ہوتا ہے اگو مجاہدہ بحالت شغل بھی اپنا اثر دکھاتا ہے مگر تجربہ ہے کہ حالتِ فراغ میں جیسا اثر کامل ہوتا ہے ویسا بحالتِ شغل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانہ میں نسبتیں قوی ہوتی تھیں اور حالت بھی عالی طاری ہوتے تھے کیونکہ پہلے زمانہ میں طالبین فراغ کے ساتھ مشغول مجاہدہ ہوتے تھے اور مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا (صحیح و سالم ہو اس میں داغ دھبہ نہ ہو) میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس مجاہدہ سے پہلے تمام معاصی سے پاک صاف ہو جائے یعنی معاصی سابقہ سے توبۂ صادق کر کے مجاہدہ کرے اگر کسی بندہ کے حقوق ذمہ ہوں ان کو ادا کر دے یا معاف کرالے اور خدا کا حق جیسے نماز روزہ قضا ہو گیا ہو تو اس سے توبہ کر کے ان کی قضا شروع کر دے اس طرح توبہ کرنے سے نفس گناہوں سے بالکل پاک ہو جائے گا کیونکہ التائبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مثل ہے جس نے کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو) پس وہ اسی کا مصداق ہو گا مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا ۱۲ جامع (صحیح سالم ہے اس میں معاصی بھی نہیں) یہ تو بیان تھا صفات مذکورہ کی مناسبت کا مجاہدہ کے مضمون سے اور قربانی کے مضمون سے ان کو یہ مناسبت ہے کہ قربانی میں ایسا جانور ذبح کرنا چاہیئے جس کا ذبح کرنا نفس پر گراں ہو یعنی قیمتی جانور ہو تندرست موٹا تازہ خوبصورت ہو جس کو ذبح کر کے کچھ جی بھی تو دکھے، ایسا نہ ہو جس کو ذبح کر کے دل یوں کہے کہ اچھا ہوا پاپ کٹا۔ بعض لوگ واقعی ایسا جانور ذبح کرتے ہیں جو مارنے سے پہلے ہی مرا ہوا ہوتا ہے (تو اس کا ذبح کرنا اس کا مصداق ہے) ؎

جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا ۱۲ جامع) حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایسی اونٹنی کی قربانی تھی جس کی قیمت تین سو دینار تھی اگر ایسا بھی نہ ہو تو کم از کم آنکھ ناک کا تو درست ہو دیکھنے میں برا تو نہ معلوم ہو۔

اب میں مجاہدہ کی حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں تو سنیئے مجاہدہ کہتے ہیں نفس

کی مخالفت کرنے کو یعنی اس کے اقتضاءات کو روکنا مثلاً باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے تو مجاہدہ یہ ہے کہ خاموش رہو کسی وقت خاموشی کو جی چاہتا ہے اس وقت مجاہدہ یہ ہے کہ باتیں کرو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نفس کے ہر تقاضے کی مخالفت کیا کرو یہانتک کسی وقت کھانے پینے کو جی چاہے تو بھوکے پیاسے مرنے لگو نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اقتضاءات نفس کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو یقیناً مذموم ہیں یعنی خلاف شرع ہیں ان کی مخالفت تو ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جو یقیناً محمود ہیں جیسے فرض نماز روزہ اور بقدر ضرورت کھانا پینا، کپڑا پہننا ان کی مخالفت ضروری کیا ہوتی بلکہ موافقت ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جو نہ یقیناً مذموم ہیں نہ یقیناً محمود ہیں بلکہ دونوں کو محتمل ہیں جیسے مباحات بلکہ بعض دفعہ بعضے مستحبات بھی ان میں شیخ محقق سے رجوع کیا جائے اگر وہ کہدے کہ تقاضا محمود ہے تب تو مخالفت کی ضرورت نہیں اور اگر وہ کہے کہ یہ تقاضا مذموم ہے تو اس کی مخالفت کی جائے شاید یہاں کسی ذہن کو شبہ ہو کہ تم نے مستحبات کو بھی غیر مذموم و غیر محمود کی فہرست میں شمار کر دیا حالانکہ جو چیز شرعاً مستحب ہے وہ تو یقیناً محمود ہے اس میں مذموم ہونے کا احتمال کیونکر ہو سکتا ہے سو خوب سمجھ لو کہ مستحبات گو فی نفسہ محمود ہی ہیں مگر جب نفس کسی مستحب کا تقاضا کرے اس وقت وہ کسی عارض کے سبب مذموم ہو سکتا ہے کیونکہ نفس تو امارہ بالسوء ہے یہ تو ہمیشہ برائی کی طرف لیجانا چاہتا ہے جب نفس میں کسی مستحب کا تقاضا ہوگا تو اندیشہ ہے کہ اس میں نفس کی کوئی چال ہے اُس چال پر نظر کر کے وہ تقاضائے مستحب مذموم ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ بعض تقاضے ظاہر میں محمود ہوتے ہیں مگر دوسرے پہلو پر نظر کر کے مذموم ہو جاتے ہیں جیسے ایک شخص حج نفل کا قصد کرے اور وہ نماز میں سست ہو تو شیخ اس کو حج سے منع کرے گا اور یوں کہے گا ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید   معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(اے لوگو حج کو کہاں جاتے ہو محبوب یہاں ہے ادھر آؤ)

کیونکہ اس شخص کے نفس میں تقاضائے حج پیدا ہونا یہ نفس کی چال ہے وہ

چاہتا ہے کہ میں کئی حج کر کے لوگوں کی نظروں میں معزز ہو جاؤں گا یا سیر و سیاحت میں جی بہلاؤں گا اس لئے شیخ اس کو حج سے منع کرتا ہے کہ تمہارے لئے میرے ہی پاس رہنا مفید ہے حج مفید نہیں کیونکہ تمہاری نیت خالص نہیں پھر نماز میں سُست ہو ایک نفل کے لئے نہ معلوم کتنے فرض برباد کرو گے لوگ مشائخ کے ایسے احکام سُن کر اعتراض کرتے ہیں کہ حج سے روک دیا میں کہتا ہوں غلط ہے وہ حج سے نہیں روکتے بلکہ معاصی سے روکتے ہیں اس شخص کے حق میں فقیہ کے فتوے سے حج ناجائز ہے صوفی بھی فقیہ ہوتا ہے فقہ صرف ہدایہ اور کنز کا نام نہیں تصوف بھی فقہ میں داخل ہے۔ امام صاحبؒ سمجھے اس فقیہ کو وہ فرماتے ہیں اَلْفِقْهُ مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَعَلَيْهَا (نفس کا ان چیزوں کا پہچاننا جو اس کے لئے نافع اور ضرر رساں ہے فقہ کہلاتا ہے) تو فقہ اصل میں معرفت نفس للنافع والضاد کا نام ہے اور یہ تعریف فقیہ کی صوفیہ پر سب سے زیادہ صادق آتی ہے بشرطیکہ صوفی جاہل نہ ہو کیونکہ یہ حضرات نفس کے مصالح و مضار کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس حیرت ہے کہ ایک کتابی فقیہ کسی مستحب کو ناجائز کہدے وہ تو ناجائز ہو جائے اور ایک عارف فقیہ ناجائز کہے تو ناجائز نہ ہو۔ دیکھئے فقہا صاف لکھتے ہیں کہ اگر کسی وقت مستحب ترک فرض کی طرف مفضی ہو جائے تو اس وقت مستحب ممنوع ہو جاتا ہے (چنانچہ مولود فاتحہ میں مفاسد ہی کی وجہ سے بعض مستحبات کو ممنوع قرار دیا گیا ہے ۱۲) پھر اسی قاعدہ سے صوفی اگر مستحب سے روکدے تو اس پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے۔ صاحب یہ نفس بڑا ہوشیار ہے اس کے تقاضے بڑے باریک ہوتے ہیں جن میں یہ سمجھنا کہ کونسا تقاضا محمود ہے اور کونسا مذموم ہے بڑے محقق کا کام ہے بعض دفعہ ظاہر میں تقاضا بہت اچھا ہوتا ہے مگر جب حقیقت منکشف ہوتی ہے اس وقت نفس کا کید ظاہر ہوتا ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک مقام پر مشغول ریاضت تھے کہ دفعۃً قلب میں جہاد کا تقاضا ہوا کہ فلاں مقام پر مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر

کفار کے ساتھ جہاد کرو وہ بڑے پریشان ہوئے کہ یہ نفس امارہ بالسوء ہے اس لئے یہ امر بالمعروف کیسا۔ چونکہ طالب صادق تھے اس لئے کھٹک گئے مگر حقیقت منکشف نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے حق تعالٰے سے دعا کی مجھے اس تقاضے کی حقیقت سے مطلع کیا جائے کہ یہ محمود ہے یا مذموم آخر مکشوف ہوا کہ تمہارا نفس نجات عاجلہ چاہتا ہے وہ روز کے مجاہدات سے گھبرا کر چاہتا ہے کہ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ ایک دفعہ گردن کٹ جائے تو رات دن کے رگیدنے سے بچ جاؤں۔ بس یہ معلوم کرتے ہی جہاد کے ارادے سے رُک گئے۔ اور نفس سے کہا کہ جس جہاد میں اس وقت مشغول ہوں وہ تو فرض عین ہے اور جس جہاد کا تو طالب ہے وہ فرض کفایہ ہے میرے بہت سے مسلمان بھائی اس کو انجام دے رہے ہیں میں تو تجھ سے اسی طرح چکّی پسواتا رہوں گا۔

تو دیکھئے کہ ظاہر میں تقاضا کیسا محمود تھا مگر اس میں نفس کی چال تھی وہ فرض عین سے ہٹا کر فرض کفایہ میں مشغول کرنا چاہتا تھا۔ کیا پوچھتے ہو اس نفس کی چالوں کو یہ بڑا اشریر ہے۔ لوگ شیطان پر لعنت کرتے ہیں اور اس کو الزام دیتے ہیں مگر شیطان سے زیادہ خود انسان کا نفس اس کو تباہ کرتا ہے

(اِنَّ اَعۡدٰی عَدُوِّكَ نَفۡسُكَ الَّتِیۡ بَیۡنَ جَنۡبَیۡكَ ۱۲ جامع)

(تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں میں ہے)

شیطان کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہم جیسوں کو بہکانے آئے وہ تو خاص خاص لوگوں کو بہکاتا ہے جن کا نفس درست ہو گیا ہے اور ہم جیسوں کا تو نفس ہی بہکانے کے لئے کافی ہے اس کو بعض دفعہ وہ بات سوجھتی ہے کہ شیطان کو بھی نہیں سوجھتی۔ دیکھئے فرعون نے اپنے کو خدا کہا اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰی۔ (میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں) کا دعویٰ کیا یہ ہمت شیطان کی بھی نہ تھی۔ چنانچہ

بر سیر میں لکھا ہے کہ شیطان نے فرعون سے کہا تھا کہ جو بات تو نے انسان ہو کر کہی ہے میں شیطان ہو کر بھی نہ کہہ سکا تیری ہمت مجھ سے بھی بڑھی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ فرعون ہماری ہی برادی کا تھا یعنی انسان تھا اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا نفس شرارت میں شیطان سے بھی بڑا ہوا ہے فرعون کے لئے اِنَّہٗ طَغٰی (کہ وہ سرکشی میں بڑھ گیا ہے) اسے پڑھنے کے لئے فرمایا ہے اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا، ہمارے یہاں ایک شخص پڑھتا ہے اور ہمارے گھر کا کاروبار بھی کرتا ہے میں نے اس سے پوچھا کہ تمہاری ذات کیا ہے اس نے کہا تگہ میں نے کہا فرعون کے بارے میں آیا ہے اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکشی میں بڑھ گیا ہے) کہیں تگا اس طغی کا ہند تو نہیں۔ خیر یہ تو ہنسی کی بات تھی مگر اس سے قرآن کی تحریف کا شبہ نہ ہو کیونکہ میرا مطلب یہ نہ تھا کہ قرآن میں لفظ طغی تگہ کی عربی ہے بلکہ میرا مطلب یہ تھا کہ اردو والوں نے کہیں طغی کو بگاڑ کر تگا تو نہیں کر دیا۔ بہر حال ہمارا نفس بھی کچھ شیطان سے کم نہیں ہے ہمارے بہکانے کو تو یہی بہت ہے۔ دوسرے اگر شیطان ہمیں بہکاتا بھی ہے تو اس کا اس سے زیادہ کچھ زور نہیں چلتا کہ وہ وسوسہ اور خطرہ دل میں ڈالدیتا ہے پھر اس پر عمل کرنا یہ ہمارے نفس کا فعل ہے شیطان ہم سے عمل نہیں کرا سکتا۔ چنانچہ جب قیامت میں جب دوزخ والے اس کو ملامت کریں گے کہ کمبخت تو نے ہم سب کو تباہ کیا تو وہ یہی کہکر صاف الگ ہوجائیگا۔ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ یعنی جب فیصلہ ہو چکے گا (اور جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہونچ جائیں گے اور وہ سب شیطان کو برا بھلا کہیں گے) تو شیطان (ان سے) کہیگا کہ مجھے ملامت کیوں کرتے ہو تم سے حق تعالیٰ نے تو سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی ایک وعدہ کیا تھا جو غلط وعدہ تھا پھر تم نے خدا کے وعدہ کو چھوڑ کر میرے وعدہ کو کیوں مانا) اور (میں نے تم پر کچھ زبردستی تو کی نہ تھی) تمہارے اوپر میرا قابو ہی کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ میں نے تم کو (ایک بات کی طرف) بلایا اور تم نے میری دعوت کو قبول کر لیا۔ تو اب مجھے ملامت نہ کرو اپنے نفسوں ہی کو ملامت کرو اب نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو الآیۃ۔

حقیقت میں شیطان کا کام سوا اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک بات دل میں ڈالدیتا ہے اب اس پر

عمل کرنا یہ خود ہمارا کام ہے شیطان ہم سے زبردستی عمل نہیں کرا سکتا پھر اس کو ملامت کرنا فضول ہے کیونکہ وہ تو کھلا ہوا دشمن ہے وہ اگر ہمیں بُرا مشورہ دے تو کچھ بعید نہیں مگر اس سے بڑھ کر ہمارا دشمن یہ نفس ہے جو بظاہر ہم سے ملا ہوا ہے اور باطن میں شیطان سے ملا ہوا ہے کہ جو شیطان کہتا ہے یہ کمبخت نفس اس کو خفیہ خفیہ ہمارے سامنے آراستہ و مزین کر کے پیش کر دیتا ہے جس سے ہم مبتلائے معاصی ہو جاتے ہیں مثل مشہور کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے وہی حال اس نفس کا ہے کہ یہ ہم سے مل کر ہم کو تباہ کرتا ہے باقی شیطان تو صرف شیرہ لگاتا ہے آگے سب کچھ ہم خود کرتے ہیں شیرہ لگانے کا قصہ یہ ہے کہ کسی نے شیطان سے کہا تھا کہ کمبخت تو نے مخلوق کو تباہ کر دیا کہ ان سے کیسے کیسے مفاسد کا ارتکاب کراتا ہے اس نے جواب دیا کہ بالکل غلط میں تو ذرا سا اشارہ کرتا ہوں آگے ساری خرابیاں تم اپنے ہاتھوں سے کرتے ہو آؤ میں تم کو اپنا کام دکھلاؤں یہ کہکر وہ ایک حلوائی کی دوکان پر لے گیا اور جا کر ذرا سا شیرہ دیوار کو لگا دیا اور شیرہ لگا کر خود الگ ہو گیا اور ملامت گر سے کہا کہ میرا کام تو بس اتنا تھا اب آگے تم اپنی برادری کے کرتوت ملاحظہ کرو۔ شیرہ کے اوپر مکھیاں آئیں، مکھیوں کے اوپر چھپکلی دوڑی چھپکلی کے اوپر ایک بلی جھپٹی راستہ میں ایک سوار جارہا تھا اس کا کتا بلی کو دیکھ حملہ آور ہوا کتے نے جو بلی کو مارا تو حلوائی نے غصہ میں کتے کے لاٹھی ماری جس سے وہ مر گیا سوار نے جو اپنے کتے کو مرا ہوا دیکھا اس نے تلوار نکال کر حلوائی کا صفایا کر دیا حلوائی کے قتل پہ بازار والوں نے سوار کو مار ڈالا وہ فوج کا افسر تھا فوج کو اطلاع پہونچی کہ ہمارا افسر مارا گیا اس نے سارے شہر کا محاصرہ کر لیا اور قتل عام شروع ہو گیا۔ شیطان نے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے کیا کیا تھا اور آپ کی برادری کے بھائیوں نے کہاں سے کہاں تو بت پہونچا دی اس لئے میں نے کہا تھا کہ نفس کے اقتضاءات بڑے باریک ہوتے ہیں یہ کمبخت مستحبات اور مباحات میں بھی ہم کو دھوکہ دیتا ہے اس کے اقتضاءات محمودہ بھی قابل اطمینان نہیں۔ الغرض نفس کے تقاضے تین قسم پر ہیں ایک محمودہ ان کی مخالفت کسی حال میں بھی ضروری کیا جائز بھی نہیں بشرطیکہ شیخ محقق کہدے کہ تقاضا محمود ہے۔ دوسرے تقاضائے مذموم اس کے ترک کی ضرورت ہے تیسرے وہ جو ظاہراً نہ مذموم ہیں نہ محمود ہیں یعنی مباحات بشرطیکہ ان میں انہماک نہ ہو۔ ورنہ پھر وہ بھی مذموم ہیں ان میں اکثر تو نفس کی مخالفت چاہیے گاہے گاہے موافقت کا مضائقہ نہیں پس خلاصہ مجاہدہ کا یہ ہوا کہ

مباحات میں نفس کی مخالفت کی جائے اور محرمات میں اس کی مخالفت اس طرح کہ ترک کیا جائے اور مجاہدہ کا یہ درجہ تو سب کے نزدیک واجب ہے اس طرح کہ ان کی تقلیل اور اس کی ضرورت ہر مسلمان کے نزدیک مسلم ہے بلکہ اصل حالت کے اعتبار سے تو اس کو مجاہدہ میں داخل کرنا بھی ٹھیک نہیں بھلا زہر سے بچنا بھی کچھ مجاہدہ ہے مجاہدہ تو اسے کہتے ہیں جس میں نفس پر مشقت وگرانی ہو اور ظاہر ہے کہ اصل مشقت فطرت میں انہی کاموں کے ترک میں ہوتی ہے جن کی فی الجملہ اجازت ہے اور جن کا حرام ہونا معلوم ہے ان کے ترک میں مجاہدہ ہی کیا ہوتا مگر چونکہ قریب قریب ہر شخص محرمات میں بھی مبتلا ہے اس لئے ترک محرمات بھی مجاہدہ ہوگا ورنہ اصل فطرت کے اعتبار سے تو اصل مجاہدہ یہی ہے کہ مباحات میں بھی نفس کی مخالفت کی جائے کہیں انہماک میں کہیں نفس فعل ہی میں بھی کیونکہ بعض موقع میں جب نفس کو مباحات سے روکا جائیگا اس وقت وہ محرمات سے بچ سکے گا کیونکہ مباحات کی سرحد محرمات سے ملی ہوئی ہے اور قاعدہ ہے کہ جس جنگل میں شیر رہتا ہو اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی سرحد کے بھی پاس نہ جاوے اگر کوئی شخص اس جنگل کی حدود میں رہکر شیر سے بچنا چاہے یہ اس کی حماقت ہے ممکن ہے کبھی غلطی سے حد کے اندر داخل ہو جائے اور شیر کا سامنا ہو جائے اس لئے سالکین کو مباحات میں انہماک سے بہت ہی احتراز چاہیئے اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ بیوی بچوں کو چھوڑنا اور گھر کو تالا لگانا یہ مجاہدہ نہیں ہے کیونکہ بیوی بچوں کی خبر گیری شرعاً فرض ہے اور مجاہدہ ترک فرائض کا نام نہیں بلکہ ترک محرمات اور کہیں ترک مباحات کا نام ہے اگر کسی شخص کو بیوی سے محبت ہو جائے تو اس کے ازالہ کا حکم نہ کیا جائیگا کیونکہ یہ محبت خلاف شرع نہیں بلکہ شرعاً مطلوب ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۔ (اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی) مجاہدہ کی حقیقت تو معلوم ہو گئی اب بھی سمجھ لیجئے کہ مجاہدہ کا اثر کیا ہوگا کیونکہ اس میں بھی بہت لوگ غلطی کرتے ہیں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مجاہدہ سے نفس کے رذائل اور تقاضائے معصیت بالکل زائل ہو جاتے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ یہ خیال غلط ہے مجاہدہ کا یہ اثر نہیں ہے بلکہ مجاہدہ کا اثر یہ ہے کہ اس سے تقاضائے معصیت مضمحل اور کمزور ہو جاتا ہے بعض لوگ مجاہدہ کر کے جب تقاضائے معصیت پھر اپنے اندر موجود پاتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہماری ساری

محنت بیکار گئی ان لوگوں کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ مجاہدہ بیکار نہیں گیا کیونکہ مجاہدہ سے زوال تقاضا مطلوب نہیں۔ اگر تقاضا بالکل زائل ہوجاوے تو پھر گناہوں سے بچنے میں ثواب ہی کیا ہوگا۔ ثواب تو اسی بات کا ہے کہ نفس میں تقاضائے معصیت موجود ہے اور تم اس سے بچتے ہو دیکھو عنین اگر زنا نہ کرے تو اس کا کیا کمال ہے اندھا اگر نظر بد سے بچا رہے تو کونسی خوبی ہے۔ کمال تو یہی ہے کہ تم سوانکھے ہو اور مرد ہو پھر بھی نگاہ بد سے اور زنا سے بچتے ہو مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است   کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

(دنیا کی شہوت مثل انگیٹھی کے ہے کہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

خوب مثال دی کہ شہوات کی ایسی مثال ہے جیسے ایندھن جس سے حمام روشن ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح تقاضائے معصیت بیکار چیز نہیں بلکہ یہ حمام تقویٰ کے لئے ایندھن ہے اگر یہ ایندھن نہ ہو تو حمام تقویٰ سرد پڑ جائے تقویٰ کی رونق اور گرم بازاری اسی تقاضائے معصیت سے ہے بشرطیکہ اُس کو جلاتا پھونکتا رہے دل میں جمع کرکے نہ بیٹھے کیونکہ ایندھن سے جلانے کا کام لوگے جبھی روٹی پکّے گی ورنہ بھوکے مروگے اس پر شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ جب ثواب اسی تقاضائے کی وجہ سے ملتا ہے تو پھر مجاہدہ کی اور اس تقاضے کو مضمحل کرنے کی کیا ضرورت ہے اچھا ہے اسے قوی رہنے دو زیادہ ثواب ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ مجاہدہ کی اس لئے ضرورت ہے تاکہ مقاومت (اور مقابلہ) سہل ہوجاوے (تنور میں اتنا ہی ایندھن ہونا چاہیئے جس سے تنو پھٹ نہ جائے اگر زیادہ ایندھن ہوا تو کسی وقت تنور کے ٹکڑے ٹکڑے کردیگا جس سے پاس والے بھی جل بھُن جائیں گے۔ انجن کے لئے آگ کی ضرورت مسلم ہے مگر اسی قدر جس سے بیلر پھٹ نہ جائے ۱۲ جامع) اگر تقاضائے معصیت کو مضمحل نہ کیا گیا تو کسی وقت گناہ میں مبتلا کرکے تمکو تباہ کردے گا اور اس وقت اس کا مقابلہ دشوار ہوجائے گا ران کے نیچے گھوڑا شائستہ ہی رہنا چاہیئے ورنہ کسی وقت ضرور پٹک دیگا۔ گو شائستہ گھوڑا کبھی شوخی کیا کرتا ہے مگر اس کی مقاومت سہل ہوتی ہے پس سالکین کو مجاہدہ کرکے بیفکر نہ ہونا چاہیئے بلکہ تھوڑا بہت مجاہدہ پھر بھی باقی رہے گا۔ بلکہ عارفین نے لکھا ہے کہ مجاہدہ ابتدائی کے بعد جو مجاہدہ شروع ہوتا ہے اسکی زیادہ ضرورت ہے (جیسا کہ پہلے بتفصیل مذکور ہوچکا ہے) رہا یہ کہ جب مجاہدہ کے بعد بھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تو پھر صدہا مجاہدہ

وغیرصاحب مجاہدہ میں کیا فرق ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں وہی فرق ہے جو ان دو سواروں میں ہے جن میں سے ایک کی ران کے نیچے شائستہ گھوڑا ہے اور ایک کے نیچے غیر شائستہ گھوڑا ہے۔ گو ہوشیار رہنے کی ضرورت تو اس کو بھی ہے جس کے نیچے شائستہ گھوڑا ہے کیونکہ شائستہ بھی بعض دفعہ شوخی کر جاتا ہے مگر اس کو اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا اس سوار کو ہوگا جس کے نیچے غیر شائستہ گھوڑا ہے کہ اس کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ ہے شائستہ گھوڑا اگر شوخی کرتا ہے تو ایک ایڑ سے سیدھا ہو جاتا ہے اور غیر شائستہ شوخی کرتا ہے تو سوار کے باپ سے بھی نہیں سنبھلتا تو یہ کیا تھوڑا فرق ہے اور سنو! دو شخص ڈاکوؤں کے جنگل میں جا رہے ہیں جن میں سے ایک تو بنوٹ جانتا ہے اور دوسرا بنوٹ نہیں جانتا تو کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں بنوٹ جاننے والا بے خوف ہو کر جائے گا کیونکہ اس کے پاس دشمن سے بچنے کی ترکیب موجود ہے اور جو بنوٹ سے ناواقف ہے وہ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر جائیگا یہی حال ہے صاحب مجاہدہ اور غیر صاحب مجاہدہ کا مگر یہ مثال یہاں پوری چسپاں نہیں کیونکہ یہاں بے خطر اور بیفکر ہونے کی کوئی صورت نہیں صاحب مجاہدہ بھی بے خطر اور بیفکر نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی باگ ایسی ذات کے قبضہ میں ہے جو نہایت بے پروائی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں۔ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا اذا لاذقنٰك ضعف الحياة وضعف الممات ثم لا تجد لك علينا نصيرا ؕ ایک واقعہ کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا (اور معصوم نہ کیا ہوتا) تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے اور اگر ایسا ہوتے تو ہم آپ کو حالت حیات میں اور بعد موت کے دوہرا عذاب چکھاتے (کیونکہ مقربان را بیش بود حیرانی۔ مقربوں کو بہت حیرانی ہوتی ہے) پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے۔ اللہ اللہ کیا شوکت ہے اور کیسی سطوت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صاف صاف خطاب ہے اسی سے تو معلوم ہوتا کہ قرآن خدا کا کلام ہے جو کسی سے بھی نہیں دبتے اور دوسرے مقام پر حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم ہی کو خطاب ہے۔ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ؕ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ؕ اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر وحی بھیجی ہے سب سلب کرلیں پھر اس کے لئے آپ کو ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی بھی نہ ملے (یہ) آپ کے رب ہی کی

رحمت ہے (جو ایسا نہیں کیا) بیشک آپ پر اس کا بڑا فضل ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلب وحی سے ڈرایا جاتا ہے تو پھر تو اور کون ہے جو سلب رحمت سے بےخطر ہونا چاہتا ہے اللہ اللہ نہ معلوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر اس آیت کے نزول کے وقت کیا حالت گذری ہوگی۔ اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّكَ (آپ کے رب کی ہی رحمت ہے) فرما کر سنبھال لیا ورنہ دل پھوٹ جاتا (اس وقت مولانا پر ہیبت وجلال کا خاص غلبہ تھا چہرہ سے خوف ٹپک رہا تھا ۱۲ جامع) ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب پر اس شان کا استغنا و جلال کا انکشاف ہوا تو مولانا کی یہ حالت تھی کہ بار بار بیقرار ہو کر یہ شعر پڑھتے تھے ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ   در کف شیر نر خونخوارۂ

(سوائے تسلیم و رضا کے کچھ علاج نہیں شیر خونخوار کے قبضہ میں ہے)

کتنی دیر تک ان پر یہ حالت رہی پس سالک بےخطر کبھی نہیں ہو سکتا تسلیم و رضا کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اس سے عنایت حق متوجہ ہو جاتی ہے اور اسی سے کام چلتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

؎ ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ   بے عنایات خدا ہیچیم ہیچ

(یعنی گو ہم نے بہت سی پند و نصیحت کی ہے لیکن کسی کام کے پختہ ارادہ کرنے میں جب تک حق تعالےٰ کی عنایت نہ ہو ہم محض ہیچ ہیں)

اور میں بھی اپنے اس بیان کے متعلق یہی کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ تعلیم کیا ہے بدون عنایت حق کے یہ کچھ بھی نہیں ؎

ایں ہیچ گفتیم ولیک اندر بسیچ   بے عنایات خدا ہیچیم ہیچ

(یہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے بدون عنایت حق تعالےٰ کے محض ہیچ ہے)

بے عنایات حق و خاصان حق   گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(حق تعالیٰ اور خاصان خدا کی عنایات کے بغیر اگر تو فرضاً فرشتہ بھی ہو تو تیرا نامۂ اعمال سیاہ ہے)

اس شعر میں خاصان حق کا لفظ بڑھا کر تسلی کر دی کیونکہ عنایات حق کا علم دشوار ہے تو مولانا عنایات خدا کی علامت بیان فرماتے ہیں کہ خاصان حق کی عنایت حاصل کرو جس پر خاصان خدا کی عنایت ہو سمجھ لو کہ اس پر حق تعالیٰ کی عنایت ہے پس کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کی مخالفت کرو یہ تو اصل ہے اور نہ خاصان حق سے متعلق پیدا کرو یہ اس کا متمم ہے اور یہاں سے ان لوگوں کے لئے بھی راستہ معلوم ہو گیا جو

طالب ہیں مگر کسی شیخ کے پاس نہیں پہونچ سکتے تو یہ لوگ نفس کی مخالفت شروع کر دیں جو کہ اصل طریق ہے ان شاء اللہ تعالیٰ واصل ہو جائیں گے کیونکہ مجاہدہ ہی حقیقت ہے اور مجاہدہ پر وصول کا وعدہ ہے پس یہ لوگ بھی مایوس نہ ہوں البتہ اتنا کام اور کریں کہ اوقات فرصت میں بزرگوں کے حالات و ملفوظات کا مطالعہ کر لیا کریں ان شاء اللہ اس سے وہی نفع ہوگا جو صحبت شیخ سے ہوتا ہے مگر جو لوگ شیخ کے پاس پہونچ سکتے ہیں وہ یہ ترکیب سنکر خوش نہ ہوں کہ بس ہم بھی ایسا ہی کر کے واصل ہو جائیں گے کیونکہ اول تو وہ شخص معذور ہے اس کی منجانب اللہ بلا واسطہ اعانت ہوگی اور تم معذور نہیں ہو تمہاری ساتھ اعانت خداوندی بلا واسطہ متعلق نہ ہوگی۔ دوسرا اسکو سخت سخت مشکلات قدم قدم پر پیش آئیں گی ان کو یہ سہولت کہاں نصیب جو تم کو نصیب ہے کہ جہاں کانٹا اٹکا فوراً شیخ سے رجوع کر لیا جہاں نفس کے کسی تقاضے کے متعلق شبہ ہوا کہ یہ محمود ہے یا مذموم فوراً شیخ سے دریافت کر لیا اس سہولت کی قدر تم کو کیا معلوم ہو اس کے دل سے پوچھو جس کو شیخ محقق میسر نہیں ہوا وہ کس مصیبت سے راستہ طے کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر پھر بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں وہ مجاہدہ تو شروع کریں ان شاء اللہ اعانت الٰہی ان کا ساتھ دے گی، عنایت خداوندی متوجہ ہوگی جس سے کام بن جائے گا بس اب میں ختم کرتا ہوں بحمد للہ مجاہدہ کے متعلق کافی بیان ہو گیا اور ضرورت کے موافق قربانی کی حقیقت بھی بیان ہو چکی۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم و عمل مستقیم عنایت فرمائے۔ (آمین) وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ الذی بنعمتہ و عزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔ ممبر سے اترتے ہوئے فرمایا کہ اس وعظ کا نام "العبرۃ بذبح البقرۃ" رکھ دیا جائے ۱۲ جامع تمت

نوٹ :۔ افسوس کہ تنگی وقت کی وجہ سے چند آیات اخیرہ کا بیان رہ گیا یعنی واذ قتلتم نفساً فادّٰرءتم فیہا سے وما اللہ بغافل عما تعملون تک۔ مجاہدہ نفس سے ان آیات کی مناسبت بھی واضح ہو جاتی تو مضمون مکمل ہو جاتا خدا کرے پھر کسی موقعہ پر اس کی تکمیل ہو جائے۔ آمین ۱۲ جامع

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

نقد اللبیب فی عقد الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم

حکیم الاُمّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ــــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم۔ اے جناح روڈ

وعظ مسمّٰی بہ

نقد اللبیب فی عقد الحبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم

این	کوٹھ پولیس لین
متٰی	۷ رجادی الاول ۱۳۴۱ھ ۲۶ دسمبر ۱۹۲۲ء یوم منگل
کم	شروع ۲ بجکر ۲۰ منٹ ختم ۴ بجکر ۳۳ منٹ
کیف	کھڑے ہوکر چوکی پر
ماذا	ابطالِ رسوم
من ضبط	مرزا منور بیگ صاحب شارٹ نویس کوٹھ پولیس مع خواجہ صاحب حکیم صاحب
المستمعون	سو ڈیڑھ سو کے درمیان
الاشتات	قدیم اور جدید شبہات کے ازالہ کا خاص مضمون تھا۔

خطبۂ مابعد :- فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (کیا انسان گمان کرتا ہے کہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا)

یہ ایک آیت ہے سورہ قیمہ کی اس میں حق سبحانہ تعالیٰ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ نے نادانوں کے ایک خیال پر انکار فرمایا ہے اس خیال کو رد کیا ہے خواہ وہ خیال درجۂ اعتقاد میں ہو یا وہ خیال درجۂ عمل میں ہو اس تعمیم کی دلیل یحسب کا لفظ ہے چنانچہ عنقریب معلوم ہو جاویگا۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ کیا گمان کرتا ہے انسان جس کو دوسرے لفظوں سے یوں تعبیر کرسکتے ہیں

عہ کیا عاقل شخص کے ہے مرد یہ حاضر مسمّی حبیب عقد کے باب میں ۱۲

کہ کیا خیال کر سکتا ہے انسان کہ چھوڑ دیا جاوے مہمل۔ مہمل کی تفسیر اور مفہوم سمجھنا چاہیئے اور اس کے بعد جو ضرورت ہوئی ہے اس کے بیان کرنے کی وہ سمجھنی چاہیئے۔ مہمل کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں دو احتمال یا تو مہمل باعتبار اعمال کے کہا گیا ہے یعنی تکلیف بالاعمال کے یا مہمل باعتبار جزا کے کہا گیا کیا معنی کے دو درجے ہیں اہمال کے' ایک درجہ تو یہ ہے کہ کسی شخص کو مکلف نہ بنایا جائے اور اس کو مطلق العنان چھوڑ دیا جاوے اور کوئی حکم اور کوئی قانون اس کے متعلق نہ ہو جس کو آزادی کہتے ہیں آجکل۔ یعنی آزاد کر دیا جاوے جیسے کوئی جانور رہوا کرتا ہے آزاد اور کوئی قید اور کوئی قاعدہ اور ضابطہ اس کے لئے نہیں ہے۔ جہاں چاہتا ہے پھرتا ہے اور جہاں چاہتا ہے منہ مارتا ہے اور کوئی روک ٹوک اس کو نہیں ہے نہ وہ رات کو گھرلایا جاتا ہے نہ وہ کسی وقت باندھا جاتا ہے یعنی کسی عمل کا مکلف نہیں کیا جاتا اور نہ کسی ضابطہ میں پابند اس کو کیا جاتا ہے یہ تو اہمال ہے باعتبار تکلیف بالعمل کے۔ اور ایک اہمال باعتبار جزا کے اس کے لئے کوئی جزا سزا نہیں بلکہ اس کو بالکل آزاد اور مطلق العنان رکھا گیا ہے جزا اور سزا سے۔ یعنی جو کچھ بھی کرے اس کا کوئی اثر نہیں جزا اور سزا کے اعتبار سے یعنی خواہ وہ نیک کام کرے یا خواہ برا کام کرے نہ اس کو جزا ہے نہ سزا ہے اور اس کی کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ایک درجہ اہمال کا یہ ہے۔ سُدًی کے لفظ میں دونوں احتمال ہیں۔ اور قرآن مجید سے تائید ہوتی ہے دونوں احتمالوں کی اس واسطے کہ یہ ظاہر بات ہے کہ قرآن مجید کے اندر فرضیات سے گفتگو نہیں کی گئی بلکہ واقعات سے اور معاملات واقعیہ سے بحث کی گئی ہے اس واسطے ضرورت اس کی ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کو دیکھا جائے اور اس میں غور کیا جاوے کہ آیا دونوں معنی اہمال کے لوگوں کے ذہن میں تھے یا نہیں اس کو قرآن مجید کی آیتوں میں تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے دونوں خیال تھے۔ چنانچہ قرآن مجید کے اندر مذمت کی گئی ہے ایک خاص جماعت کی ان لفظوں سے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ شکایت فرمائی ہے بعض فرقوں کی کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی کوئی عظمت نہیں کی اور کوئی قدر نہیں کی جبکہ یوں کہا کہ کسی بشر پر حق تعالیٰ نے کوئی شے نازل نہیں فرمائی۔ اس خیال اور

اس اعتقاد کے لوگ تھے کہ نبوت کوئی چیز نہیں اور شریعت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ ان کے قول میں تصریح ہے مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَیۡءٍ حق تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی شے نازل نہیں فرمائی بشر نکرہ اور شیٔ بھی نکرہ ہے اور دونوں واقع ہیں تحت میں نفی کے اور یہ قاعدہ ہے عربیت کا کہ جب نکرہ تحت میں ہوتا ہے نفی کے تو مفید ہوتا ہے عموم کو یعنی اس عموم کا حاصل یہ ہوا کہ کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی گئی بشر میں بھی تعمیم ہے اور شے میں بھی تعمیم ہے پس بشر کے اندر تمام بشر آگئے حضرات بھی آگئے جو واقع میں نبی ہیں اُن کی نبوّت کا بھی وہ لوگ انکار کرتے تھے اور شیٔ کے اندر تمام احکام آگئے یعنی کسی قسم کا کوئی حکم کوئی قانون کسی شخص پر نازل نہیں ہوا اس سے زیادہ کیا ہوگا گویا انکار اور ایک عام انکار ہے نہ کسی ضابطہ کے ساتھ مخصوص نہ کسی بشر کے ساتھ مخصوص ان لوگوں کا خیال تھا کہ نبوت کوئی چیز نہیں ہے۔ اس آیت سے تو پتہ لگتا ہے کہ اس عقیدہ کے لوگ بھی تھے اور دوسرے معنی جو ہیں اہمال کے اس کا پتہ لگتا ہے بہت سی آیتوں سے یہ آیت مذکورہ تو سوچنے ہی سے ذہن میں آئی تھی اور دوسرے معنی کے اعتبار سے جو اہمال ہے وہ تو کثرت سے منقول ہے کفار اور منکرین کے مقالات ہیں جس کا حاصل ہے بعث و نشر کا انکار بہت کثرت سے آئیتیں ہیں اس مضمون کی یعنی کوئی چیز نہیں قیامت کوئی چیز نہیں حساب کتاب وہ کہتے تھے اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا یہ فقط ہماری حیات دنیویہ ہے ولبس یونہی مرتے پیدا ہوتے چلے آئے ہیں یوں ہی سلسلہ جاری ہے کوئی مرا کوئی پیدا ہوا یعنی جیسے گھاس پھونس برسات میں لگتی ہے اور بڑھتی ہے اسی طرح سلسلہ جاری ہے۔ باقی معاد اور قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔ وَاِذَا قِیۡلَ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَیۡبَ فِیۡهَا قُلۡتُمۡ مَّا نَدۡرِیۡ مَا السَّاعَةُ اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَیۡقِنِیۡنَ (اور جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو یقین نہیں) اسی طرح کثرت سے آیتیں ہیں جن کا مدلول یہ ہے کہ بعث و جزا کے

منکر تھے ان کا اعتقاد یہ تھا کہ قیامت اور حساب کوئی چیز نہیں ہے اس اہمال کے بھی قائل تھے تو قرآن مجید سے پتہ لگ گیا کہ دونوں اہمال کا اعتقاد تھا منکرین کو۔ حق تعالیٰ نے جب انکار فرمایا اس پر اور رد فرمایا اس اہمال کے اعتقاد کو اور اہمال کے دونوں اعتقاد قرآن مجید سے ثابت ہیں اور دونوں میں منافات کی وجہ نہیں ہے جو جمع نہ کیا جا سکے رد کے اندر دونوں کو۔ لہٰذا اسی کے قائل ہو سکتے ہیں اور اس کی تفسیر کو عام کہہ سکتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوگا کیا انسان کا یہ خیال ہے کہ اس کو اعمال کا مکلف نہیں کیا گیا اور یہ خیال ہے کہ اس کے لئے سزا و جزا کچھ نہیں ہے تو گویا دونوں پر رد ہے اعمال کے مکلف نہ کرنے کے خیال پر بھی اور سزا و جزا کے انکار پر بھی۔ یہ ہے حاصل آیت کا حاصل تو معلوم ہو گیا اب یَحْسَبُ کے لفظ پر غور کرنا چاہیئے۔ یَحْسَبُ کا لفظ بمعنی پنداشتن ہے جس کا مفہوم بہت عام ہے درجۂ اعتقاد کو بھی اور درجۂ اعتقاد سے گھٹا ہوا درجہ ہے خیال کا اس کو بھی دونوں کو عام ہے یہ ایک احکام لغات میں سے ہے جس کو عربیت کے ماہرین جانتے ہیں اور یہ لفظ عام ہے اس کی تعمیم کے بعد یَحْسَبُ کا حاصل یہ ہوا کہ اس اعتقاد پر بھی انکار ہے جس کا کفار کو اعتقاد تھا اور وہ اعتقاد جازم تھا نیز اگر اعتقاد کے درجہ سے گھٹا ہوا ہو تو خیال پر بھی انکار ہے ہر چند کہ قرآن مجید میں اصل مقصود اُن ہی فرقوں پر انکار ہے جو منکر تھے مگر حق تعالیٰ نے یہ کلام مقدس نازل کیا ہے جمیع امراض کے لئے۔ اس لئے اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے گئے کہ ہر مرض کا علاج ہو سکے درجۂ اعتقاد تک کی نفی تو ہے ہی قابل انکار لیکن اس سے جو کم درجہ ہے خیال کا وہ بھی قابل انکار ہے اور اس کم درجہ میں وہ درجہ بھی آ گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اعتقاد تو نہیں ہے مگر عمل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عمل ایسا ہے جیسے کہ اعتقاد انکار والوں کا عمل ہوا کرتا ہے اور اس محاورہ کو نصوص کے اندر بہت استعمال کیا گیا ہے۔

چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تارک صلوٰۃ کے لئے فَقَدْ کَفَرَ کا فرمو گیا)

کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (جس شخص نے قصداً نماز چھوڑ دی کافر ہوگیا) حالانکہ اہل حق کا مذہب قرآن مجید کی دلیل سے یہ ہے کہ کبائر کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا اور نماز کا چھوڑنا جبکہ اس کی فرضیت کا اعتقاد ہو موجب کفر نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کی تاویل میں علماء نے غور و فکر کیا ہے اور دلائل سے ماؤل ہونا ثابت کیا ہے۔

اس کی تفصیل کی حاجت نہیں ہے اس وقت مگر صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ کفر کا لفظ استعمال کرنے سے معلوم ہوا کہ کفر کے درجات مختلف ہیں۔ ایک کفر عملی۔ ایک کفر اعتقادی۔ کفر عملی کا حاصل یہ ہے کہ اعتقاد تو مومنین کا سا ہے مگر اعمال کافروں کے سے ہیں۔ تو فَقَدْ كَفَرَ کے معنی یہ ہوں گے کہ فَقَدْ كَفَرَ عَمَلاً (عمل کے اعتبار سے کافر ہوگیا)

اس کی ایسی مثال ہے ہمارے محاورات میں جیسے کہ کوئی شخص عتاب میں زجر و توبیخ میں اپنے کسی عزیز محکوم بیٹے کو یہ کہے کہ تم تو بالکل چمار ہوگئے ظاہر ہے شرافت اس کی زائل نہ ہوگی۔ نسب اس کا بدل نہیں گیا۔ یعنی یہ کہ وہ ایک قوم سے نکل کر دوسری قوم میں داخل نہیں ہوگیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کام تم ایسے رذیلوں کے کرتے ہو جیسے چمار کیا کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ محاورات کے اندر توسیع ہے مجاز بھی ہے حقیقت بھی ہے تو اس مجاز کا حاصل یہ ہوا کہ تشبیہ دی جاتی ہے ایک شخص کو کسی خاص حالت و صفت والے کے ساتھ کسی خاص وجہ سے۔ تو فَقَدْ كَفَرَ (کافر ہوگیا) کے بھی معنی یہ ہوئے کہ فَقَدْ كَفَرَ عَمَلاً یعنی کام کیا کافروں کا سا۔ یعنی نماز کو فرض سمجھ کر نہ پڑھنا یہ مومن کی شان سے بعید ہے۔ نماز نہ پڑھنا کام ہے کافروں کا۔ کافر ہی نماز نہیں پڑھتے۔ کیونکہ وہ منکر ہیں جو نماز نہ پڑھے وہ مؤمن تو ہے بوجہ اعتقاداً فرض سمجھنے کے مگر بھائی کام تو بہت ہی بیہودہ کیا تو جب كَفَرَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے دوسرے درجہ کے لئے بھی يَحْسَبُ کا استعمال بھی اس درجہ میں ہو تو کچھ بعد نہیں ہے۔ دوسرا درجہ کیا نکلا، یہ نکلا کہ

اعتقاد تو نہیں ہے اہمال کا۔ یعنی اعتقاد میں تو نہیں سمجھتا کہ انسان مہمل ہے یعنی مکلف نہیں ہے اعمال کا یہ کہ سزا جزا نہ ہو گی اعتقاد تو یہ ہے کہ جب کوئی پوچھتا ہے کیوں صاحب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے تمہارے اوپر۔ ہاں صاحب ہے۔ کیوں صاحب جیسا کرو گے ویسی سزا ملے گی۔ کیوں صاحب کیوں نہیں ملے گی، ایک ایک ذرہ کا حساب ہو گا۔ پوچھنے پر تو یہ کہہ دیتا ہے کہ اعتقاد ضرور ہے لیکن برتاؤ ایسا ہے جیسے اس شخص کا ہو جو معتقد ہے اس کے انکار کا یعنی جزا و سزا کے انکار کا۔ یا تشریع کے انکار کا کیونکہ اگر کوئی معتقد ہوتا انکار کا تو اس کا عمل کیا ہوتا عمل بھی ہوتا کہ وہ شتر بے مہار کی طرح مطلق العنان ہوتا کیونکہ جب اعتقاد ہی نہیں سزا جزا کا تو اس کے پابند ہونے کی ضرورت ہی کیا تو اس کا جو طرز ہے وہی اس شخص نے اختیار کیا۔ ایک درجہ یہ بھی ہے حسبان کا۔ وہ پہلا درجہ مخصوص کفار کے ساتھ ہے۔ دوسرا درجہ بہت سے ایمان والوں میں بھی پایا جاتا ہے یعنی ظاہر ہے کہ بہت سے اہل ایمان کے اعمال وہی ہیں جو منکرین میں پائے جاتے ہیں یعنی اعتقاد تو درست ہے لیکن عمل وہی ہیں جو منکرین کے ہیں کچھ فکر اور پرواہ نہیں ہے کہ ہم لوگ کیا کر رہے ہیں جو کچھ جی میں آیا کر لیا جس کو اتباع ہوئے کہنا چاہئیے جو خواہش ہوئی کر بیٹھے نہ یہ سوچ ہے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز نہ یہ خوف ہے کہ سزا جزا ہو گی یا نہیں، اگر کسی نے ٹوکا بھی تو گو بعض لوگ تمسخر سے یہ بھی کہہ ڈالتے ہیں ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے ۔۔۔ عاقبت کی خبر خدا جانے

کیا مہمل بات ہے خدا تو جانتا ہی ہے عاقبت کی خبر جب خدا نے بتلا دیا تو خدا کے بتانے سے تم بھی تو جان گئے۔ یہ کیا معنی۔ یہ شاعروں کی آزادیاں ہیں گو یہ ضرور ہے کہ محض زبانی ہے گو اعتقاد نہ ہو مگر یہ ضرور ہے کہ یہ بے باکی کی دلیل ہے اس قدر آزاد کلمات اسی شخص کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کو

خوف نہ ہو یا جس کے قلب میں عظمت نہ ہو۔ یہ خطرناک حالت ہے اس کی سرحد کفر سے ملی ہوئی ہے مگر جو لوگ بے باک نہیں ہیں وہ یہ تو نہیں کہتے جن سے بے پروائی معلوم ہوتی ہو وہ شرمندہ ہوتے ہیں اور اکثر مسلمانوں کی حالت یہی ہے کہ کہتے ہیں کہ ہاں بھائی گنہگار ہیں۔ مبتلا ہیں بہت سی مجبوریاں ہیں کیا علاج کیا جائے۔ اللہ سے دعا کرو۔ خدا ہماری حالت پر رحم کرے اور ہمیں اس بلا سے نجات دے یہ کہنے لگتے ہیں اکثر لوگ جو اور ذرا لکھے پڑھے ہیں انھوں نے کتابیں دیکھی ہیں اردو ہی کی سہی اب تو اردو کی کتابیں دیکھ کر بھی اپنے کو صاحب فضیلت سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بیشک گنہگار ہیں مگر اللہ تعالیٰ رحیم ہیں، کریم ہیں۔ اور غفور بھی تو ہیں۔ ان کی رحمت کے سامنے ہمارے گناہ کیا چیز ہیں۔ کیوں صاحب کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ تم کو آزاد کر دیا گیا ہے۔ یہ تو اس آیت کے خلاف ہے یا یہ معنی ہیں کہ ان کی رحمت کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ مضر نہیں۔ اگر یہ معنی ہیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ ضرر کی دو قسمیں ہیں۔ ضرر دنیوی اور ضرر اخروی۔ ضرر دنیوی یہ ہے کہ کوئی چیز کھا کر بیمار پڑ جاؤ یا سنکھیا کھا کر مر جاؤ یہ تو دنیوی ضرر ہے۔ ضرر اخروی یہ ہے کہ مرنے کے بعد سزا جزا ہو عقوبت ہو۔ یہ دو ضرر ہوئے ایک مقدمہ یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ دنیوی ضرر اخف ہے اور ہلکا ہے اخروی سزا سے۔ دو مقدمے۔ تیسرا مقدمہ یہ کہ ہر موثر چیز جو کسی اثر کی زائل کرنے والی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ وہ خفیف اثر کو جلدی زائل کرے گی بہ نسبت شدید اثر کے مثلاً آگ جلانے والی ہے اور موثر ہے افنار اجسام میں یعنی جسموں کو فنا کر دیتی ہے تو جو جسم خفیف ہوگا جیسے کپڑا اور روئی اس کو جلد اڑادے گی بہ نسبت پتھر اور لکڑ کے۔ جب تینوں مقدمے ثابت ہو گئے اور یہ اعتقاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ضرر آخروی کو رحمت حق تعالیٰ کی زائل کر دے گی اور حق تعالیٰ معاف فرمادیں گے تو دنیوی ضرر تو اس سے اخف ہے اس کو تو بدرجہ اولیٰ زائل کر دے گی

میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ کا غفور رحیم ہونا مسلم ہے، پھر اگر ایک شخص سنکھیا کھالے اور اس کو ضرر بھی پہونچ جاوے تو سنکھیا نے کیوں اثر کیا کیا وجہ ہے اس کی کیا جب کہ سنکھیا ضرر کرتا ہے اس وقت خدائے تعالیٰ رحیم ہیں یا نہیں۔ یہ اعتقاد تو کفر ہے کہ رحیم نہ رہے پھر کیا وجہ ہے اس نے ضرر کیوں کیا سنکھیا نے آپ کچھ جواب دیں گے یہی جواب دیں گے کہ رحیم تو ان کی شان ہے مگر جب تک اس کے ظہور کا ارادہ نہیں ہوگا تب تک ظہور رحمت کا فعلیت کے درجہ میں نہیں آتا اور یہ کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا چونکہ اس وقت رحمت کو متعلق کرنا نہیں چاہا اس واسطے سنکھیا کا اثر ہو گیا سو بعینہ حالت ضرر اخروی اور عقوبت نار کے بارہ میں بھی ہے اس میں کیسے بے باکی اور جرأت پیدا ہو گئی کہ وہ غفور رحیم ہیں کچھ ضرر نہ ہوگا۔ اور کچھ اثر نہ ہوگا آخرت میں بہر حال یہ وہ لوگ ہیں جن کا اعتقاد صحیح ہے مگر معاملہ اور برتاؤ ان لوگوں کا سا ہے جن کا اعتقاد باطل ہے۔ مسلمانوں میں کثرت سے اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو اعتقاداً تو انسان کو آزاد نہیں سمجھتے مگر عملاً آزاد سمجھتے ہیں اور زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ کہیں کہیں اعتقاداً بھی آزاد سمجھتے ہیں مگر اس آزادی میں اور کفار جس آزادی کے معتقد تھے اس میں قدرے فرق ہے ان لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ حق تعالیٰ نے مکلف ہی نہیں بنایا ان کا یہ اعتقاد تو نہیں ہے مگر ہاں بعضوں کا یہ اعتقاد ہے کہ حق تعالیٰ نے زیادہ امور میں تنگی نہیں فرمائی اور حرمت اور حلت کا قانون اس کے متعلق نہیں کیا۔

دوسرے لفظوں سے اس کی تعبیر یہ ہے کہ شریعت نے اس میں دخل نہیں دیا چنانچہ اب لوگوں کی زبان پر یہ بات آئی ہے کہ مولوی لوگ ہر بات میں تنگی کرتے ہیں یہ تو دنیا کے کام میں ہم کو اختیار دیا گیا ہے کہ جو چاہیں کریں چنانچہ میں نے ایسی تحریریں دیکھی ہیں ایک تو زبانی گفتگو ہوتی ہے عوام کو وہ زیادہ مضر

نہیں ہوتی نہ وہ باقی رہتی ہے وہ چونکہ الفاظ ہوتے ہیں جن کی حقیقت ہے صوت خاص اور صوت کی حقیقت ہے ہوا تو الفاظ کی حقیقت ایک ہوا ہوئی کیونکہ قسم کی حقیقت مقسم ہوتی ہے ہوا ایک ایسی چیز ہے کہ اڑ جاتی ہے اس کو بقا نہیں بات تمام ہوگئی منقطع ہوگئی بخلاف کتابت کے یہ گویا محفوظ چیز ہے تو بہت لوگ اس کو تقریر سے گذر کر تحریر میں بھی لے آئے ہیں چنانچہ میری نظر سے ایسی تحریریں گذری ہیں اور یہ تحریر ان لوگوں کی تحریریں ہیں جو اپنے کو محقق سمجھتے ہیں اور مصلح قوم سمجھتے ہیں اور بیڑا اٹھایا ہے قوم کی اصلاح کا مسلمانوں کی اصلاح کا مگر ایسے مصلح مشابہ اس شخص کے ہیں جس کی حقیقت ایک بُوجھ بجکڑ کی سی ہے کسی گاؤں میں ایک دانشمند رہتا تھا جو بہت عقلمند سمجھا جاتا تھا اتفاق سے اس گانوں میں ایک شخص سے یہ غلطی ہوئی کہ تاڑ کے یا کھجور کے درخت پر چڑھ گیا اب جو زمین نظر آئی تو خوف زدہ ہوئے اترتے ہیں تو اترا نہیں جاتا خوف کے مارے چلّانے لگے گاؤں کے لوگ جمع ہوگئے سوچ بچار کرنے لگے کہ کس طرح اتاریں کوئی تدبیر ہی سمجھ میں نہیں آئی وہی بوجھ بجکڑ یاد آئے انھیں بلایا گیا اوپر دیکھا نیچے دیکھا خوب غور کر کے فرمایا کہ رسّا لاؤ رسّا لائے حلقہ سا بنا کر گرد لگائی گئی اس نے کہا کہ اس کو کوئی قوی شخص اوپر پھینکے کسی نہ کسی طرح اوپر پھینکا گیا ان کے پاس پہونچا کر حکم دیا یہ حلقہ کمر میں باندھ لو۔ پھر گاؤں والوں کو حکم دیا کہ جھٹکا دو کھینچو۔ انھوں نے کھینچا نیچے آپڑے، مرمراگئے، گانوں والوں نے کہا یہ کیا حماقت کی بولا قسمت، میں نے تو بہت سے آدمیوں کو اسی ترکیب سے کنویں سے نکالا اب میں قسمت کو کیا کروں۔ تو جیسے وہ بزرگ تھے ایسے ہی اس وقت مصلح قوم پیدا ہوگئے ہیں آپ نے درخت کو کنوئیں پر قیاس کیا جیسے کنویں کے اندر کا آدمی اس میں سے رسّا کھینچنے سے نکلتا ایسے ہی درخت پر سے بھی اتر آئے گا۔ یہ اس شخص نے قیاس فاسد کیا تھا تو جیسے اس نے قیاس کیا تھا یہی حالت مدعیان اصلاح قوم کی ہے جبکہ ان کے علم دین حاصل نہ ہو محض رائے کی بنا پر اصلاح کرتے ہوں یہی حالت اُن کے

قیاس فاسد کی ہے ایک حکم کو دیکھ کر اور ایک قانون کو دیکھ کر دوسری جزئی کو اس کی نظیر سمجھ کر اس پر قیاس کر کے وہاں بھی حکم چلا دیتے ہیں۔ اور یہ وہ خیال ہے جو جاہلیت کا خیال ہے کافر کہتے تھے۔ اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بیع بھی مثل سود کے ہے)

حق تعالیٰ نے جب ربوا کو حرام کیا تو شبہ کیا کہ بیع تو جائز ہے اس میں بھی زیادت ہوتی ہے اور نفع ہوتا ہے اس میں بھی زیادت ہوتی ہے اور نفع ہوتا ہے تو دونوں میں نفع ہے اس میں فرق ہی کیا ہے۔ یہ ایسی مثال ہے کہ ماں بھی عورت ہے بی بی بھی عورت ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک حلال ہے اور ایک حرام ہے کتا بھی جانور ہے بکری بھی جانور ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک حلال ہے ایک حرام واقع میں تو فرق ہے مگر ہر شخص کو اس فرق کا نہ سمجھنا ضروری نہ سمجھانا ضرور ہے۔ بلکہ ناممکن تو یہ حالت ہو رہی ہے مصلحان قوم کے۔ تو ان مصلحان قوم میں سے ایک کی تحریر دیکھی ہے جس نے کہا ہے کہ ان مولویوں نے شریعت کو تنگ کر ڈالا ہر چیز کو شریعت میں ٹھونس دیا اور یہاں تک حکم لگا دیا کہ فلاں جگہ کے بال رکھنا جائز اور فلاں جگہ کے ناجائز بھلا شریعت سے بالوں کو کیا تعلق اور صاحب یوں نہ بیٹھے یوں نہ لیٹیے۔ یوں کھاؤ۔ یوں نہ کھاؤ۔ یوں استنجا کرو یوں پیشاب کرو۔ مصیبت میں ڈال دیا مسلمانوں کو شریعت کو اس سے کیا بحث۔ ان لوگوں نے شریعت کو منحصر سمجھا ہے چند احکام میں نماز پڑھ لو روزہ رکھ لو' حج کر لو' زکوٰۃ دے لو بس ہو چکا اس سے کیا بحث شریعت کو کہ ریل میں جاؤ تو پندرہ سیر سے زیادہ اسباب نہ لے جاؤ ورنہ حقوق کا مواخذہ ہوگا یہ کوئی بات ہے اگر لے گئے کیا ریل گھس گئی ریل کا کچھ بگڑ گیا۔ مجھے ایک سرحدی کی حکایت یاد آئی ریل میں سفر کر رہے تھے دو من کا بورہ کشمش کا بغل میں لے اترے ماشاء اللہ۔ بابو آیا ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ دیا کہا اس کی بلٹی۔ کہا بلٹی کیا وہ بولا اس بورہ کا ٹکٹ۔ کہتے ہیں اس کا ٹکٹ بھی یہی ہے کہا یہ اس کا ٹکٹ نہیں ہو سکتا یہ

پندرہ سیر سے زیادہ ہے آپ نے قانون میں اجتہاد کیا کہنے لگا پندرہ سیر اس شخص کے لئے ہے جو پندرہ سیر سے زیادہ نہ اٹھا سکے ہم دو من اٹھا سکتے ہیں ہمارا یہی پندرہ سیر ہے۔ آپ کے قانون کی بھی تفسیر کی ایسے ہی مفسرین شریعت کے پیدا ہوئے ہیں جو کہتے ہیں کہ اس حکم کا یہ حاصل ہے ۔مولوی لوگ سمجھے نہیں۔ چنانچہ ربوا کے مسئلہ میں رسالے موجود ہیں خواہش نفس سے مسئلے بدل کر علماء پر الزام لگائے ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہونچے یہ بھی غنیمت ہے کہتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تو خاص وقت کے مناسب احکام بتلائے تھے، مولویوں نے ان کو عام کرلیا یا حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض حکم دیا ہی نہیں مولویوں نے ایجاد کرلیا۔

چنانچہ ایک بیرسٹر ہے الہ آباد میں ہیں وہ مولانا محمد حسین صاحب سے کہنے تھے مولوی صاحب اب تو مسلمانوں کو بہت تنزل ہے اگر علماء سود کی اجازت دیدیں تو بہت اچھا ہے۔ کہا قرآن مجید میں اس کی حرمت منصوص ہے کس کی مجال ہے اس کو حلال کرے توبہ کرو توبہ کرو۔ آپ کہتے ہیں کیا قرآن مجید میں اس کی حرمت آئی ہے کہا ہاں تو آہستہ آہستہ رخسارہ پر طمانچے مارے مولانا یہ معلوم نہ تھا اگر یہ ہے تو سر آنکھوں پر ہیں تو واللہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ان مولویوں نے یہ احکام تجویز کرلئے ہیں تو بعضوں کا یہ گمان ہے کہ مولویوں نے سب احکام اپنے گھر سے بنالئے ہیں۔

غنیمت ہے مولویوں ہی تک تبرا پہونچایا آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہونچے۔ الحمد للہ کہ علماء وقایہ تو ہوگئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سبحان اللہ عرض یہ ہے کہ اپنے نزدیک اس قسم کی اصلاحات کرتے ہیں۔ اس کی بنا یہ ہے کہ وہ یوں سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم کو بالکل آزاد رکھا ہے اس لئے بہت سے احکام کی تشریع کا اذکار ہے سو بعضے اس اعتقاد کے لوگ مسلمانوں میں بھی ہیں۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

اب اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ان پر بھی فتویٰ دیتا مگر میں فتوے میں رعایت کرتا ہوں۔ کیونکہ ان کے اعتقاد میں اور کفار کے اعتقاد میں فرق ہے ان کا تو اعتقاد ہے کہ شریعت سرے ہی سے کوئی چیز نہیں ہے اور ان کا اعتقاد ہے کہ شریعت تو ہے مگر اس کی مجموعی ہیئت وہ نہیں ہے جو علماء نے سمجھ رکھی ہے اس لئے کافر نہیں کہے جا سکتے۔ ہاں قریب ہیں ضرور کفر کے جیسے ایک شخص نہر کے کنارے پر کھڑا ہے اور اندیشہ ہے کہ پاؤں پھسلا اور پانی میں غرق۔ بہرحال اس خیال کے بھی لوگ ہیں مسلمانوں میں قرآن مجید اس کو بھی رد کر رہا ہے اگر کوئی شخص کہے کہ اس خیال سے تو علماء بھی خالی نہیں کیونکہ علماء بھی بہت سی چیزوں کو جائز کہتے ہیں یہ نہیں کہ وہ کسی امر میں آزادی کے قائل ہی نہ ہوں ان کے نزدیک بھی بہت افعال و اعمال جائز بھی ہیں تو ایسے امور کے جائز کہنے کا حاصل یہی ہوا کہ انسان مخیر ہے شریعت نے اس کو آزادی دی ہے تو تخییر اور اختیار اور آزادی اور اطلاق جواز میں فرق ہی کیا ہوا۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جو معتقد ہیں کہ بعض امور میں ہم کو آزادی گئی ہے تو اس بناء پر نہیں کہ ان سے شریعت نے تعرض نہیں کیا بلکہ اس بنا پر معتقد ہیں کہ ان کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ایک میں شریعت کا اعمال ہے ایک میں اہمال ہے۔ غرض بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں کہ ان کے متعلق کہیں بھی قانون شرعی نے خاص قیود سے مقید نہیں کیا مثلاً قانون شریعت میں اس کے متعلق کوئی قید نہیں کہ عمامہ میں چار پیچ ہوں زیادہ نہ ہوں۔ تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا قانون نے اس سے تعرض ہی نہیں کیا حالانکہ یہ نہیں ہے بلکہ قانون نے اس کے متعلق بحث کی ہے اور بحث کر کے اجازت دی ہے تو علماء کا اعتقاد یہ نہیں ہے کہ بعض امور کے متعلق شریعت نے بحث ہی نہیں کی۔ نہیں بلکہ

ضروری اطلاع: بخط و کتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کرانے کے وقت اپنی خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

شریعت نے بحث کی ہے اور بحث کر کے ان امور کی اجازت دی۔ غرض یہ ہے کہ جن امور کو علماء نے جائز کیا ہے ان امور کے متعلق شریعت سے فتوے جواز کا ملا تب جائز کیا اگر شریعت سے فتوے جواز کا نہ ملتا تو ہرگز جائز نہ کرتے اور آزاد لوگ شریعت میں جواز کا فتویٰ تلاش ہی نہیں کرتے۔ یہ فرق ہے علماء کی آزادی میں اور ان لوگوں کی آزادی میں۔

بہرحال قرآن مجید رد کر رہا ہے ان کے اس خیال کو یہاں ایک تقسیم اور بھی ہے وہ یہ کہ ایک قسم یہ ہے کہ تمام احکام میں یہ اعتقاد یا خیال یا برتاؤ ہے اور ایک یہ کہ بعض میں ہے اور بعض میں نہیں۔ سو ایسا تو کوئی مسلمان نہیں کہ تمام احکام میں یہ اعتقاد یا خیال یا عمل رکھتا ہو البتہ ایسے بہت لوگ پائے جاتے ہیں کہ بعض احکام میں ضرور ان کا یہی خیال یا اعتقاد یا عمل ہے چنانچہ ابھی میں نے بیان کیا کہ ان کا یہ خیال ہے کہ بہت سے امور سے شریعت نے تعرض نہیں کیا اور یہ خیال جیسا کہ نقلاً و نصاً باطل ہے اسی طرح عقلاً بھی باطل ہے وجہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ ہمارے مالک ہیں یا نہیں اور پھر مالک ہیں تو مطلقاً یا بعض وجوہ سے یا یوں سمجھئے کہ ہم لوگ ان کی ملک تام ہیں یا ملک ناقص۔ دوسرے یہ دیکھنا چاہیئے کہ مالک کو حق ہوتا ہے تصرف کا یا نہیں یعنی حق تصرف مبنی مالکیت پر ہے یا نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ تصرف کرنا موقوف ہے مالک ہونے پر نیز مالک ہونا مقتضی ہے تصرف کرنے کو یعنی جیسا کہ تصرف کرنا موقوف مالک ہونے پر ایسے ہی مالک ہونا مقتضی ہے تصرف کرنے کو یعنی نہ تصرف ہو سکتا ہے بدون مالکیت کے نہ مالکیت متحقق ہوتی ہے بدون تصرف کے پہلا قضیہ تو بالکل صاف ہے حتیٰ کہ جہاں بھی تصرف صحیح ہوگا وہاں مالکیت کا ہونا ضروری ہے خواہ ناقص ہو یا تام مثلاً حکام دنیویہ جو رعایا میں تصرف کرتے ہیں اسی بنا پر کہ وہ ایک درجہ میں اپنے آپ کو مالک سمجھتے ہیں گو وہ درجہ لغت میں

ملکیت کا ہے یعنی حاکم مالک نہیں ہے صرف ملک ہے ملک کہتے ہیں حاکم کو اور
بادشاہ کو اور بادشاہ مالک نہیں ہوتا کیونکہ لوگ اس کے بردے اور غلام نہیں
البتہ ایک گونہ اس کو اختیار ہوتا ہے خاص مصالح کی وجہ سے بہر حال یہ ثابت
ہو گیا کہ کہیں تصرف نہیں ہوتا بدون مالکیت کے اگر ہے تو غضب اور ظلم ہے
مثلاً کوئی ڈاکو اگر تصرف کرے تو اس کا نام غصب ہے اور ظلم ہے تو تصرف صحیح
اور تصرف بحق بدون مالکیت کے نہیں ہوتا سو یہ تو بالکل صاف ہے البتہ اس
میں ذرا اخفا ہے کہ مالکیت کا تحقق بدون تصرف کے نہیں ہوتا کیونکہ ظاہر تو یہ معلوم
ہوتا ہے کہ مالک ہونے کے لئے یہ ضرور نہیں کہ تصرف بھی کرے۔ چنانچہ دیکھا
جاتا ہے کہ بادشاہ اور حکام بعض چیز کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاتے غرض اس میں
ذرا اخفا ہے تو بات یہ ہے کہ ایک تو وہ مالک ہے جس کا علم ناتمام جس کی شفقت
ناتمام جس کی حکمت ناتمام جس کا تصرف ناتمام جس کی ملک ناتمام ایسی مالکیت
تو واقعی مقتضی نہیں تصرف کو اور ایک مالک وہ ہے کہ علم اس کا محیط ہر وقت اسے
معلوم کہ کون چیز کس حالت میں ہے قدرت اس کی پوری ہر قسم کے تصرف پر وہ
قادر توجہ اس کی ایسی کامل کہ ایک قسم کی توجہ دوسری قسم کی توجہ سے مانع نہیں
لَا یَشْغَلُهٗ شَانٌ عَنْ شَانٍ ایک حال دوسرے حال سے اس کو غافل نہیں کرتا
پھر حلم بھی علی الاطلاق کہ سب چیزوں کی مصالح کو محیط ادھر شفقت بھی عام
اور تام نہایت خیر خواہ ہر چیز کی جو مصلحت ہے اس کے موافق اس کو مکمل بھی
کرتا ہے ایک مقدمہ تو یہ اور دوسرا مقدمہ یہ کہ تکمیل بلا تصرف نہیں ہوسکتی جو
مالک اس شان کا ہوگا وہ ان صفات کی وجہ سے لازم ہے کہ ہر وقت اپنی
مملوک چیز میں تصرف کرے حق تعالیٰ کی چونکہ یہی شان ہے اور تمام صفات
کمال کی اس میں موجود ہیں تو عادۃً ممکن نہیں کہ وہ ہر چیز میں ہر وقت تصرف نہ
کرے۔ پھر تصرف کی دو قسمیں ہیں ایک تصرف تشریعی ایک تصرف تکوینی کس چیز
میں یہ کہ مثلاً اس شے کا موجود کرنا اس شے کو نشوونما دینا اس کو صحت دینا اس کو

مریض کرنا اس کو ہلاک کرنا اس کو معدوم کرنا۔ یہ تو تصرف تکوینی ہوا۔ ایک تصرف تشریعی ہے یعنی یہ خطاب کرنا کہ فلاں چیز جائز ہے فلاں چیز ناجائز کسی شے کی نسبت امر کرنا کسی شے سے نہی کرنا جب ان کے تصرفات عام ہیں تو جیسا کہ تکوینی تصرف سے کوئی چیز کسی وقت خالی نہیں اسی طرح تشریعی کیفیت سے بھی کوئی شے کسی وقت عقلاً خالی نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر کوئی امر اس تصرف سے مانع ہو تو وہ اور بات ہے مثلاً مخاطب میں عقل نہ ہو بلوغ نہ ہو ومثل ذلک پس انسان کو بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ اس میں بھی ہر وقت متصرف ہیں اسی تصرف کو اس آیت میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (آپ فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا) تو صلوۃ اور نسک تصرفات تشریعیہ ہیں اور محیا و ممات تصرفات تکوینیہ ہیں۔ اس سے ہر قسم کے تصرفات حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہوئے۔ آگے فرماتے ہیں۔ لَاشَرِیْکَ لَہٗ سُبْحَانَ اللّٰہِ (اس کا کوئی شریک نہیں) اور کوئی شخص نہیں ہے جو ان تصرفات میں شریک ہو ہر چیز میں حق تعالیٰ ہی منصرف ہیں اور کسی کا تصرف نہیں تو ایسے تصرف کا انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری بات ہے کہ کسی امر میں بھی ہم کو مہمل نہیں چھوڑا گیا تو لازم آگئی یہ بات اور ثابت ہو گیا کہ کسی ایک حکم میں بھی اور کسی وقت میں بھی ہم کو آزاد نہیں چھوڑا اور کوئی ایسی حالت نہیں جس سے شریعت نے تعرض نہ کیا ہو اب کیا حال ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ شریعت کا قانون ہماری ہر حالت سے تعرض نہیں کرتا بلکہ بعض سے کرتا ہے بعض سے نہیں کرتا۔ غرض حق تعالیٰ کے قانون کو دنیوی قانون پر قیاس نہیں کر سکتے اس لئے وہاں جو حکام ہیں ان کا تصرف عام نہیں ہے کیونکہ ان کی مالکیت ناتمام ہے اور مالکیت اس وجہ سے ناتمام ہے کہ جو کمالات شرط ہیں مالکیت کے وہ ان میں ناتمام ہیں اور چونکہ حق تعالیٰ کے

کمالات تام ہیں اس لئے ان کے تصرفات بھی عام اور تام ہوئے چاہئیں۔ غرض خدائے تعالیٰ کا یہ تصرف ہے کہ ہم ان کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں نشوونما پاتے ہیں صحتیاب ہوتے ہیں۔ مریض ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی تصرف ہے کہ وہ ہم کو ہر حالت میں خطاب کرتے ہیں کہ اِفْعَلْ کَذَا وَلَا تَفْعَلْ کَذَا یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو یہ حاصل ہے آیت کا اسی سے موقع شناسوں کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کیا ضرورت ہے اس بیان کرنے کی۔ وہ ضرورت یہ ہے کہ اس تقریب نکاح میں مجکو بلایا گیا ہے اور اس کے متعلق بھی لوگوں کے ایسے ہی غلط خیالات ہیں کہ شریعت نے اس کی رسوم سے تعرض نہیں کیا یا تعرض کیا ہے تو اس طرح سے کہ ہم کو سب رسوم کی اجازت دی ہے اور یہ خیال خصوص ان رسوم کے متعلق نہایت عام ہے جن کی صورت بھی مباح ہے پس مجکو ان ہی کی اصلاح اس بیان سے مقصود ہے کیونکہ جی یوں چاہا کرتا ہے کہ ہر وقت کی ضرورت کے اقتضاء کے موافق بیان کیا جائے ورنہ یہ حال ہوگا کہ جیسے کسی کو ہو تو بخار اور نسخہ لکھدیا جادے درد سر کا تو وہ ایسا بیان ہوگا بخلاف اس بیان کے جو اقتضائے وقت کے موافق ہو وہ ایسا ہوگا جیسا مرض ویسا علاج تو ان تقریبات کے متعلق بہت لوگوں کے جو خیالات ہیں ان کے غلط ہونے کو اس وقت ظاہر کرتا ہے اس لئے تقریبات کے متعلق دو قسم کے اعمال ہیں ایک وہ ہیں جن کو ہر شخص جو ذرہ برابر بھی دین سے مس رکھتا ہے ان اعمال کو برا اور ناجائز اور حرام سمجھتا ہے وہ اعمال رسوم شرکیہ و بدعیہ ہیں جن کو ہر شخص جو ذرا بھی تعلق اور جو کچھ بھی مس دین سے رکھتا ہے ناجائز سمجھتا باقی جن کو دین سے کچھ بھی مس نہ ہو ان کا تو ذکر ہی کیا ان کے یہاں تو ہر چیز جائز ہے چنانچہ پہلے زمانہ میں ہر طرح کے شگون اور ٹوٹکے فقط جائز ہی نہیں بلکہ واجب اور لازم سمجھے جاتے تھے بلکہ اب بھی پرانے خیال کی بوڑھیوں میں وہ مرض موجود ہے ذرا ذرا سی بات سے فال اور شگون لیتی ہیں جس کی نسبت حدیث شریف میں صاف لَا طِیَرَۃَ آیا ہے بدشگونی

اور ٹوٹکہ کوئی چیز نہیں بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں بدھ منحوس ہے منگل کا دن ایسا ہے فلاں دن فلاں طرف سفر کرنا برا ہے، فلاں دن فلاں طرف اچھا ہے، فلاں دن کپڑا مت خریدو فلاں دن کپڑا مت سیؤ اور بہت سے خیالات ہیں۔ کوا بولا مہمان آئے گا، جوتی پر جوتی چڑھ گئی سفر ہوگا، ہتیلی کھجلائی روپیہ آئیگا خرافات جاہلیت کے خیالات اور حیرت کی بات ہے کہ ان خرافات کے لئے دلائل تجویز کئے ہیں کہیں فال نامے ہیں کہیں حضرت علیؓ سے روایتیں ہیں۔ حضرت علیؓ انہیں ایسے سستے مل گئے ہیں کہ تمام عجائب وغرائب ان کے سر مڑھ دیئے جاتے ہیں۔ نعوذ باللہ (خدا کی پناہ)

حضرات اہل بیت کے علوم تو مستفاد عن النبوۃ ہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا طِیَرَۃَ (شگون کوئی چیز نہیں ہے) حضرات اہل بیت کیسے قائل ہو جاویں گے طیرہ کے۔ پہلے زمانہ میں شادیوں کے اندر ایسی رسمیں شرک و بدعت کی بے حد تھیں یہاں تک کہ موسل میں ڈوری بندھوانے کی ایک رسم تھی جب کوئی بزرگ خاندان آتا تھا تو اس سے برکت کے لئے ڈوری بندھواتے تھے۔ اور تعجب کی بات ہے کہ علماء کو بھی ان خرافات میں شریک کر لیتی تھیں۔ اپنے گھر میں کوئی عالم ہوا تو اُسے موسل میں ڈوری باندھنے لے جاتیں تاکہ برکت ہو اور من بھر کی جگہ دو من چاول نکل آویں۔ کہیں دلہن کے پلہ میں ہلدی کی گرہ باندھتیں کہیں ایک بچہ اس کی گود میں دیتیں کہ دیکھ اللہ میاں ایسا ہی بچہ لے لوں گی' یہ باتیں کہیں کہیں کہیں اب بھی ہیں۔ کسی عورت کے اگر بچے نہ جیئں تو بعض جاہل بچہ کو پیدا ہوتے ہی گھوڑے پر ڈال آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھ اللہ میاں اگر لیتا ہے تو ابھی لے لے نہیں پھر نہیں ملے گا۔ اگر وہ کچھ دنوں نہیں مرتا تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا ان کا معاہدہ پورا ہوا معاہدہ ہوا ہی کب تھا، اگر ہوا بھی تو ایک ہی طرف سے تو ہوا۔ اس قسم کے خرافات کثرت سے ہیں۔

اناؤ کے ضلع میں میرے ایک دوست نے ایک نکاح میں مدعو کیا تھا میں نے

کہا خرافات تو نہیں ہوں گی انھوں نے وعدہ کیا کہ نہیں ہوں گی اور وعدہ بھی کیا عورتوں سے وعدہ لیکر ایک دن رات کو مجھے تو نیند میں پتہ بھی نہ چلا ان کو ڈھک ڈھک کی آواز سنائی دی، گھر میں گئے تو دیکھا کہ ڈھول بج رہا ہے، انھوں نے ڈانٹا کہ یہ کیا واہیات ہے۔ کہا نہیں ذرا سا شگون کیا تھا اتنا بھی نہ ہو تو میت میں اور شادی میں فرق ہی کیا رہے۔

میرٹھ میں تماشا ہوا ایک رئیس کے یہاں شادی تھی وہ متبع سنت تھے بالکل سادگی کے ساتھ تقریب تھی نہ ڈھول نہ تماشا نہ باجہ نہ گاجا۔ ایک صاحب چپکے سے بولے ارے میاں چونکی کسر ہے ان رئیس صاحب نے کہیں سن لیا خدمت گار کو حکم دیا کہ ایک روپے کے چنے لے آؤ۔ جب وہ لے آیا تو کہا ان کے سامنے رکھدو اور کہا پڑھئے کلمہ شریف کیا حرج ہے اور برکت ہو جائے گی اور کلمہ شریف کی برکت ہی حاصل کرنے کے لئے تو اس کو میت کے لئے پڑھتے ہیں تو میت شادی میں برکت ہو جاوے گی۔ اسی طرح سورۂ یٰسین شریف جو موت کے قریب پڑھی جاتی ہے تو خاص برکات کے لئے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا خاص موت ہی سے تعلق ہے۔ میں ایک جگہ مریض کی عیادت کے لئے گیا اس وقت جی چاہا کہ برکت کے لئے سورۂ یٰسین شریف پڑھوں مگر ڈر کے مارے پکار کر نہ پڑھی کہ عورتیں کو سیرگی ایک ظریف کو پورا قرآن تو یاد نہ تھا محض جاہل تھا لیکن گاؤں میں اپنے کو حافظ مشہور کیا رمضان شریف میں ادہر ادہر کی جو سورتیں یاد تھیں انھیں ملا ملا کر سنا دیا اور کہا کہ کلام مجید ختم ہو گیا مٹھائی تقسیم کرو۔ گاؤں میں ایک شخص کو یٰسین یاد تھی حافظ جی نے یٰسین پڑھی نہ تھی کیونکہ انھیں یاد ہی نہ تھی اس نے کہا حافظ جی یٰسین نہیں پڑھی وہیں بولے میاں کہیں نماز میں یٰسین بھی پڑھی جاتی ہے وہ تو مُردوں پر پڑھی جاتی ہے اگر میں پڑھ دیتا تو سارا گاؤں مرجاتا یہ سن کر وہ راضی ہو گیا مردہ کے تلبس کا اتنا بڑا اثر سمجھتے ہیں کہ مردہ کی چارپائی کو منحوس سمجھتے ہیں اس کے کپڑے پہننے کے منحوس سمجھے جاتے ہیں ان سب کو خیرات کر دیتے ہیں گویا خیرات کے لئے منحوس چیزیں ہیں مگر تماشا

ہے کہ مردہ کی ساری چیزیں تو منحوس لیکن روپیہ اور جائیداد منحوس نہیں یہ تو ایسے مبارک ہیں کہ ان کے لئے پہلے سے امیدیں لگائے بیٹھے رہتے ہیں بھائی اگر مردہ کی چیز منحوس ہے تو روپیہ اور جائداد کیوں نہ منحوس ہوگئے۔ چونکہ لیسین شریف بھی مردہ کے مرنے کے وقت پڑھی جاتی ہے لہذا اس کو بھی اسی ذیل میں داخل کرلیا ہے اور اب کلمہ شریف کو بھی ایسا ہی سمجھنے لگے غرض یہاں تک غلو ہوگیا ہے کہ جس شادی میں ڈھول ڈھماکہ نہ ہوا سے میت کی مجلس سمجھتے ہیں اسی لئے ان عورتوں نے شگون کیا تھا ڈھول سے صاحب خانہ مجھ سے معذرت کرنے لگے میں نے کہا کیا بات ہے انھوں نے ساری حکایت بیان کی یہاں تک کہ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ بالکل اس تقریب کو جس کے اندر رسوم شرکیہ نہوں تقریب ہی نہیں سمجھتے پہلے تو بہت زیادہ اس خیال کے تھے لیکن بعضے اب بھی اس خیال کے ہیں مگر کم دو وجہ سے ایک تو علم دین کی وجہ سے کہ اب علمِ دین پہلے سے بڑھ گیا ہے اور ایک علم دنیا کی وجہ سے یعنی دو قسم کے لوگ ہیں اہلِ دین اور اہلِ دنیا دونوں ان رسوم کے قبیح ہونے پر متفق ہیں۔ اہلِ دین قبیح سمجھتے ہیں بوجہ مخالفت شریعت کے اور اہلِ دنیا شریعت کے تو زیادہ لمبے چوڑے معتقد نہیں لیکن چونکہ یہ رسمیں عقل کے بھی خلاف ہیں اور لغو ہیں اس لئے نئی روشنی والے بھی ان کو قبیح سمجھتے ہیں مگر چونکہ یہ لوگ محض عقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے ان رسوم کو قبیح سمجھتے ہیں اس واسطے ہم ان کے ممنون نہیں ہیں کیونکہ انھوں نے شریعت کو نہیں لیا بلکہ محض عقل کا اتباع کیا ہم تو عقل کو بھی شریعت کے تابع رکھتے ہیں۔ ہم تو اول یہ دیکھیں گے کہ عقل جو حکم دیتی ہے وہ شریعت کے فتوے کے موافق ہے یا نہیں۔ اگر موافق ہے تو خیر ورنہ ہم یہ کہدیں گے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دوراندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

ہمیں ایسی عقل بھی نہیں چاہیے جو شریعت کے تابع نہ ہو مگر عقل بالکل بیکار بھی نہیں ہے اس کی مثال گھوڑے اور دامن کوہ کی سی ہے صرف اتنا کام عقل کا ہے کہ دامن کوہ

تک پہنچا دے اس کے بعد پہاڑ پر چڑھنے میں گھوڑا کچھ کام نہیں دے سکتا آگے ضرورت ہے قدم کی اسی طرح عقل اصول تک تو کار آمد ہے لیکن فروع کے درمیان ناکارہ محض ہے ہاں عقل پر احسان ہے کہ اگر وہ کسی مقام پر شریعت کی خادم ہو کر کچھ تقریر کرلے تو اس کی تقریر سُن لی جائے اگر کوئی بڑا حاکم تقریر کر رہا ہو تو اس کا خانساماں اس کی تائید میں کہے جی حضور بجا ہے تو کیا اس خانسامہ کے اس تائید کرنے سے اس حاکم کے قول کی کچھ قدر بڑھ گئی اور کیا وہ اس تائید سے خود حاکم ہو گیا ہرگز نہیں بلکہ اس حاکم کا اس خانسامہ پر احسان ہے کہ اس کی تائید کو سن لیا ہم تو اس خانساماں کو ڈانٹ دیتے کہ کیا بک بک کر رہا ہے تو شریعت کی یہ عنایت ہے کہ اگر عقل شریعت کی خادم ہو کر اس کی تائید کرتی ہے تو وہ اس کی تائید کو سن لیتے ہیں ورنہ عقل کے دخل درمعقولات کا مقتضا تو یہ تھا کہ شریعت عقل کو بولنے تک کی اجازت نہ دیتی غرض حق تو یہ تھا کہ عقل شریعت کے سامنے لا و نعم کچھ نہ کہے بلا قیل و قال اس کا اتباع کرے ہاں البتہ اگر نعم کہے تو ہم تب بھی قدر کریں گے اور اگر کچھ نہ کہے تو وہ درجہ اس سے بھی بڑھا ہوا ہے ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گر ست — لیک عشق بے زبان روشن تر است ئے دوم

(اگرچہ زبانی بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان روشن تر ہے)

اور اس انقیاد کے لزوم کی وجہ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو علاقہ ہے مومن کو وہ محض عقلی نہیں ہے بلکہ عشقی ہے اور جو عشقی علاقہ ہوتا ہے اس کا مقتضا یہ ہوتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو — دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اگر قتل کریں آپ پر قربان ہو دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے جو کچھ کریں میں ہر حالت میں آپ سے راضی ہوں)

اور اس کا مذہب یہ ہوتا ہے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور ناپسند

ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

ذرا بھی کہیں چون و چرا نہیں کرتا فانی محض ہوتا ہے پس عشقی علاقہ اس کو مقتضی ہے کہ جہاں شریعت کا کوئی حکم سن لے اس کو بے چون و چرا لے اس عشقی علاقہ میں عقل بیچاری کی رسائی بھی نہیں ہے مگر خیر اگر اس کی تصدیق اور تائید میں کچھ بولے تو اجازت ہے۔ بہرحال ان عقلا نے ان رسوم کی ممانعت اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ شریعت کے خلاف ہیں بلکہ اس وجہ سے ممانعت کی ہے کہ وہ ان رسوم کو اپنے نزدیک عقل کے خلاف سمجھتے ہیں اس واسطے ہم ان کے ممنون نہیں کیونکہ جب بنا ان کے حکم کی محض ان کی عقل نارسا ہے تو اگر کوئی حکم صحیح ان کے عقل کے خلاف ان کو معلوم ہوگا تو یہ اس حکم صحیح کو بھی چھوڑ دیں گے۔ لیکن خیر اس پر بھی اگر ہم ممنون نہیں تو خاص اس تائید میں شاکی بھی نہیں لیکن بعد تعمق نظر ایک حالت پر شاکی بھی ہیں مگر شاکی دوستانہ ہیں اور شکایت دوستوں ہی سے ہوتی ہے وہ مسلمان ہیں اور ہمارے بھائی ہیں وہ شکایت معاندانہ اور نفرت کی نہیں ہے وہ شکایت یہ ہے کہ عورتوں کو تو منع کرتے ہیں کہ فضول خرچیاں مت کرو اور خود ان کا یہ حال ہے کہ عورتوں کا زیور وغیرہ اتار کر اپنا فرنیچر درست کر لیا۔ میز کرسی، ہارمونیم اور گراموفون اور خاک بلا سینکڑوں فضول چیزیں جمع کر لیں۔ ایک عورت شکایت کرتی تھی اور سچی شکایت کرتی تھی کہ ہمیں تو زیور سے خالی کر دیا یہ بھی آجکل کا مذاق ہے کہ عورتوں کو لڑکا سا رکھنا پسند کرتے ہیں۔ نہ زیور ہے نہ کچھ ہے۔ یہ ایم۔اے ہیں وہ یہیں ہیں وہ بی پی ہیں۔ یہ بی۔اے ہیں گو قافیہ نہ ملا۔ وہ عورت کہنے لگی کہ ہمارا سارا زیور چھین کر اپنے اوپر لاد لیا۔ سر پر بجائے جھومر کے ٹوپی کا پھندنا، گلے میں بجائے گلوبند کے ہار کے ٹکٹائی اور کالر تجویز کر لیا، پاؤں میں بجائے کڑوں کے کلب ہاتھوں میں کف حتیٰ کہ کف کی بدولت نماز کی بھی توفیق نہیں ہوتی کیونکہ وضو میں کف نہ بگڑ جاویں گے، شکن نہ پڑ جاویں گی۔ بہرحال عورتوں کو تو زیور وغیرہ اتار کر ننگا منڈا کر دیا

ان کو لگا دیا اپنی ضروریات میں اور خود فضولیات میں مبتلا ہو گئے مگر خیر ؎

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی　　گومشت خاک ماہم برباد رفتہ باشد

(خوش ہو رقیبوں سے دامن کھینچ کر گذر گئے اگرچہ ہماری مٹھی بھر خاک برباد ہوئی)

اتنا کام تو ہمارا چلا کہ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رسوم نقلاً تو قبیح ہیں ہی عقلاً بھی ان لوگوں نے قبیح تسلیم کر لیا ہمارا اتنا کام تو چل گیا بہر حال اہل وقت عقل پرستی کا بہت غلو ہے اس وجہ سے ہم کو یہ جوڑ لگانا پڑا کہ عقل بھی منع کرتی ہے ان رسوم شرک و بدعت کو غرض ان رسوم کو قبیح سمجھنے میں تو اہل عقل و نقل دونوں متفق ہیں۔ اب رہیں دوسری رسوم ان میں بڑے بڑے عقلا بھی مبتلا ہیں اور کیا کہوں کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن واقعہ ہے کہ بہت سے علماء بھی ان رسوم میں ڈھیلے ہیں میرے پاس ایسے خطوط آتے ہیں کہ اگر مجمع کر لیا یا کھانا کھلا دیا یا آپس میں کچھ دے دلا دیا تو اس میں شریعت کے خلاف کون سی بات ہو گئی۔ جب ہمارے طبیب ہی مریض ہیں تو پھر مریضوں کا علاج کون کرے وہ بیچارے جائیں کہاں۔ بات کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ رسوم دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو شرک و بدعت ہیں اور دوسری تفاخر کی ہیں کہتا ہوں کہ رسوم شرکیہ و بدعیہ تو بیشک گھٹ گئی ہیں لیکن تفاخر کی رسوم پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور چونکہ تفاخر کی رسوم کو رسوم ہی نہیں سمجھا جاتا اس لئے جب رسوم کی ممانعت کی جاتی ہے تو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اس وقت روشنی کا زمانہ ہے اب رسوم ہی کہاں رہ گئی ہیں اور نظائر میں ان ہی رسوم شرکیہ کو پیش کر دیتے ہیں اور واقع میں وہ بہت کم ہو گئی ہیں لیکن رسوم فخریہ پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں چونکہ پچھلے زمانہ میں بھی نہ اتنا تمول تھا نہ اتنا دماغوں میں غلو تھا نہ فخر میں غلو تھا بالکل سیدھی سادی معاشرت تھی بڑے بڑے امرا گاڑھا گزی پہنتے تھے۔ ہمارے قصبہ میں صرف ایک رئیس کے یہاں ایک فرش اور ایک مراد آبادی حقہ اور ایک فتیل سوز تھا باوجودیکہ ہزاروں خوش حال اور متمول لوگ تھے جب کسی کے یہاں شادی ہوتی تو یہ چیزیں ان کے یہاں سے منگوائی جاتیں فرش قالین وغیرہ اور کسی کے

یہاں نہ تھا اب بھی پہلے بادشاہوں کے جوڑے عجائب خانوں میں موجود ہیں انہیں کو دیکھ لیجئے وہ ایسے ادنیٰ درجے کے ہیں کہ بادشاہ تو بہت بڑی چیز ہے اب کوئی ادنیٰ ملازم بھی ایسے کپڑوں کو پسند نہیں کرتا یہاں تک کہ بادشاہ لوگ بھی نینو استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ظفر شاہ کا جامہ نینو کا ابتک موجود ہے کیا ٹھکانا ہے سادگی کا۔ اب نینو چماریاں اور بھنگنیں بھی نہیں پہنتیں۔ یہ حالت تھی اس زمانہ میں بہت ہی سادگی تھی کبر و فخر بھی کم تھا اور اس قسم کے لباس ہوتے تھے پہلے زمانہ میں اور اب تو یہ حالت ہے کہ اگر دو سو سے کم کا ہو تو وہ جوڑا ہی نہیں اس کا نام کفن رکھا ہے کہا جاتا ہے کہ جوڑا کیا دیا جیسا کفن ڈال دیا اور اکثر جو جوڑے دوسرے عزیزوں کو دیئے جاتے ہیں وہ ہوتے بھی ایسے ہی ہیں کیونکہ اب تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہوں دس چاہے ہوں بالکل کفن جیسے۔ خوامخواہ بہت سے جوڑے دئے جاتے ہیں یہ بہو کے ماں باپ کا ہے' یہ نانا نانی کا ہے' یہ خاک کا ہے' یہ بلا کا ہے غرض عدد کا پورا کرنا ضروری ہے حالانکہ ضرورت ایک کی بھی نہیں جیسے کہ کوئی لفظ بضرورت شعر بڑھا دیا جاتا ہے لیکن مصلح تو یہی کہے گا کہ شعر گفتن چہ ضرور (شعر کہنا کیا ضرور ہے)۔

مرزا فائق ایک شاعر تھے اس نے ایک خط منظوم غالب کو لکھا جس کے ایک شعر میں ید کا لفظ مشدد آتا تھا اور اس کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ تشدید بضرورت شعر غالب ایک مسخرہ شخص اگر چہ حاشیہ پر وہ نہ بھی لکھتا تب بھی وہ کہیں چوکنے والا تھا اور اب تو ایک بہانہ مل گیا مسخرے نے اس کے جواب میں ایک قطعہ لکھا۔

چہ خوش گفت فائق شاعر غرّا | کہ کس ہمچو من ذہن رسا نباشد
چو مقام ضرورت شعر افتد | تشدید جائز چرا نباشد

(کیا خوب کہا فائق غرا شاعر نے کہ کوئی شخص میری مثل ذہن رسا نہیں ہے جب شعر میں کسی جگہ ضرورت پیش آجائے تو تشدید کس لئے جائز نہ ہوگی)

حقیقت میں شعر گفتن چہ ضرور (شعر کہنا کیا ضروری ہے) اسی طرح ان کو ضرورت اتنے

جوڑوں کی کیا تھی کونسی وحی نازل ہوئی تھی اس کی بنا کیا ہے محض تُخرا اور اس کو کوئی بُرا سمجھتا نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری فہرست معاصی کی نہایت مختصر ہے ہم نے معاصی کی فہرست میں انتخاب کیا ہے ہماری فہرست میں معاصی صرف دو چار ہیں زنا، چوری، قتل، شراب خواری بس یہ چیزیں ہمارے نزدیک معاصی ہیں اور کوئی چیز معصیت ہی نہیں اگر یہ بات ہے تو حق تعالیٰ کے اس ارشاد کے کیا معنی سنئے ارشاد فرماتے ہیں وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (ظاہری گناہ بھی چھوڑو اور باطنی گناہ بھی) اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں ظاہری گناہ اور باطنی گناہ۔ ظاہری گناہ کی تفسیر یہ ہے کہ جو محسوس ہو دوسروں کو اور باطنی گناہ وہ ہے جو دوسروں کو محسوس نہ ہو پس معلوم ہوا کہ یہ جو ظاہری گناہ ہیں صرف یہی گناہ نہیں ہیں بلکہ اور بھی گناہ ہیں جو محسوس نہیں۔ اور یہ جو محسوس گناہ ہیں ظاہر کے یہ محسوس کیوں ہیں محسوس اس لئے ہیں کہ ان کا محل محسوس ہے یعنی ہاتھ پاؤں۔ آنکھ زبان وغیرہ ان جوارح سے جو گناہ ہوتے ہیں چونکہ یہ جوارح محسوس ہیں اس واسطے ان کے افعال بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اور باطنی گناہ ایسے محل کے ہیں جو خود محسوس نہیں اس لئے وہ بھی غیر محسوس ہیں وہ محل کون ہے وہ محل ہے قلب اور نفس تو معلوم ہوا کہ بعضے گناہ قلب اور نفس کے بھی ہیں اب ذرا مہربانی کر کے ان گناہوں کے نام تو بتائیے جو نفس اور قلب کے ہیں آپ تو کیا بتائیں گے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ خدا تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتے ہیں، حدیث صحیح میں ہے لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ كِبْرٍ جس کے دل میں رائی برابر بھی کبر ہو گا وہ ہرگز جنت میں نہ جائے گا یہ ہے قلب کا گناہ۔ اب دیکھئے دوسرا گناہ قلب کا حق سبحانہ تعالیٰ فرماتے ہیں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ یعنی اے ایمان والو اپنی خیر خیرات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو مثل اس شخص کے جو لوگوں کے دکھلاوے کے واسطے خرچ کرتا ہے۔ اس آیت سے ریا کا گناہ

معلوم ہوا۔ یہ آیتیں اور حدیثیں ریا اور فخر کو حرام بتاتی ہیں اور یہ دونوں گناہ متعلق ہیں نفس اور قلب کے۔ اب اس کا تو کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا کہ ریا اور فخر بھی گناہ ہیں کیونکہ قرآن اور حدیث سے ان کا گناہ ہونا ثابت ہے اب آگے واقعات کو دیکھئے کہ نیت کیا ہوتی ہے ان تقریبات میں کیا یہ نیت نہیں ہوتی کہ شان ظاہر ہو شہرت ہو نام ہو، ذرا ہماری بات لوگوں کی نظروں میں بڑھی رہے گو سب کی نیتیں اس میں بھی یکساں نہیں ہوتیں یعنی یہ ضرور ہے کہ انیس بیس کا فرق ہوتا ہے اور اگر زیادہ فرق بھی مان لیا جائے تب بھی کیا ہوتا ہے جس کی نیت میں زیادہ فساد بھی نہیں ہے وہ بھی یہ نہ سمجھیں کہ ہماری نیت بالکل پاک صاف ہے کچھ تو فساد ضرور ہوتا ہے اور جہاں نیت میں کچھ بھی فساد نہیں وہاں کے لئے ایک اور کلیہ موجود ہے بیفکر نہ ہو جئے آگے دوسری دفعہ بھی قانون کی آتی ہے اس کے منتظر رہیئے ہاں اگر کوئی اس کلیہ میں بھی داخل نہ ہوتا ہو تو خیر اس کو اجازت ہوگی لیکن یہ احتمال واقع ہی نہیں چنانچہ ابھی عنقریب اس کا بیان آتا ہے۔ لیجئے اب زیادہ منتظر رکھنے کی کیا ضرورت ہے میں ابھی بیان کئے دیتا ہوں بات یہ ہے کہ اکثر طبائع کے اندر تو فخر و نمود ہی کا مادہ موجود ہے اور اس کی نسبت جیسے کلیات موجود ہیں جس کا ذکر اوپر آچکا ویسے ہی جزئیات بھی موجود ہیں چنانچہ فرماتے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم۔ مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی جو شخص شہرت کے لئے کپڑا پہنتا ہے اس کو حق تعالےٰ قیامت کے دن ذلت کا کپڑا پہنائیں گے ثوب شہرت میں اضافت لامیہ ہے تو معنی یہ ہوئے اَلثَّوْبُ لِلشُّهْرَةِ یعنی شہرت کی غرض سے جو کپڑا پہنا جاوے تا کہ لوگ انگشت نما کریں کہ کیسا بڑھیا کپڑا پہنا ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کپڑا اس نیت سے پہنا جاوے کہ ہمارا نام ہو ہماری شہرت ہو تو اسے قیامت میں ذلت کا لباس پہنایا جاوے گا حالانکہ ہر جوڑا بہت قیمتی بھی نہیں ہوتا مگر جب اس کو شہرت کی غرض سے پہنا گیا تو وعید تو متعلق ہو گئی اور شہرت کی نیت علامات سے ظاہر ہے چنانچہ بازار سے کپڑا اچھانٹ کر لاتے ہیں ایک دکھایا یہ نہیں دوسرا دکھایا یہ نہیں تیسرا دکھایا یہ نہیں۔

یہ ساری چھان پھٹک فقط اس لئے ہوتی ہے کہ وہ کپڑا ایسا تو ہو کہ کم از کم ہمارے خاندان میں تو کسی کے پاس نہ نکلے تاکہ ہمارا امتیاز ہو اور ہمارا اعزاز ہو تو روزمرہ کے لباس میں دس بارہ بیس روپیہ سے زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا پھر بھی بہت تفاخر سے اس میں وعید ہے بس جب کہ اس قدر کم خرچ کر لے پر بھی وعید متعلق ہو جاتی ہے تو جہاں ہزاروں روپیہ خرچ کر دیا جاوے وہاں کا تو کیا پوچھنا ہے ایک فساد تو یہ ہے دوسرا فساد جو اس کے لئے لازم ہے وہ اسراف ہے کیونکہ اسراف کہتے ہیں معصیت میں خرچ کرنے کو، آپ کا خیال ہوگا کہ ہم کونسی معصیت میں خرچ کر رہے ہیں ہمارے یہاں ناچ نہیں رنگ نہیں. اے صاحب تفاخر اور ریا بھی تو معصیت ہے پس تفاخر کے لئے خرچ کرنا معصیت ہی میں خرچ کرنا ہے اس لئے اسراف میں یقیناً داخل ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ معصیت منحصر نہیں ہے ناچ رنگ اور دیگر افعال جوارح میں بلکہ بہت سے معاصی قلب کے متعلق بھی ہیں چنانچہ تفاخر اور ریا ان ہی معاصی قلب میں سے ہے لہٰذا اس میں خرچ کرنا بھی معصیت ہی میں خرچ کرنا ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ معصیت میں خرچ کرنا اسراف ہے پس یہ بھی اسراف ہوا اور ایک معصیت ہی میں خرچ کرنا کیا نماز روزہ میں بھی حد سے تجاوز ہونا اسراف ہے اور مطلق اسراف کے متعلق حق سبحانہ تعالےٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا. پس اسراف مطلقاً مذموم ہوگا. ایک صاحب مجھ سے کہا کہ جس کے پاس روپیہ نہ ہو اس کے لئے تقریبات میں خرچ کرنا اسراف ہے ہمارے پاس تو بہت سا روپیہ ہے ہمارے لئے کیا اسراف ہے. کیوں صاحب اگر روپیہ زیادہ ہو تو کیا اس کے لئے کوئی حدود نہیں ہیں. سنئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اَدَفِی الْوُضُوْءِ سَرَفٌ کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے قَالَ نَعَمْ فرمایا ہاں وضو میں بھی اسراف ہوتا وَلَوْ کُنْتَ عَلٰی ضِفَّۃِ نَھْرٍ جَارٍ یعنی اگرچہ نہر ہی کیوں نہ بہ رہی ہو وہاں بھی اسراف ہوتا ہے خواہ مخواہ ضرورت سے زیادہ پانی خرچ کرنا وہاں بھی منع ہے غرض اسراف کی حقیقت ہے حد سے متجاوز ہونا. ہر شے میں جب حد سے بڑھ گئے اسراف ہو جائیگا یہ دوسرا فساد ہوا اب اگر نیت کی درستی کے سبب اس فساد سے بھی بچ گئے تو

ایک کلیہ شریعت میں اور ہے اس کی مخالفت سے ایک تیسری دفعہ تم پر قائم ہوجاویگی وہ کلیہ یہ ہے کہ جس امر مباح کے ارتکاب سے دوسرا کوئی شخص کسی محذور شرعی میں مبتلا ہوجاتا ہو وہ مباح مباح نہیں رہتا اب اگر کسی نے اپنی نیت درست بھی کر لی مگر دوسرے لوگ جن کی نیت درست نہیں ان کو تو اس شخص کے فعل سے قوت و تائید ہو گی اس لئے باوجود درستی نیت کے یہ افعال اس شخص کے لئے ناجائز ہوجاوینگی اس کی مزید تفصیل آگے بھی آوے گی اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ایک کلیہ سے بچے تو دوسرا کلیہ موجود ہے غرض خوب سمجھ لو کہ فہرست منکرات سے کوئی بچے گا نہیں جو الزامات لگائے گئے ہیں ان سے نکل کر کوئی نہیں جا سکتا ایک الزام سے بچے گا تو دوسرا الزام عائد ہوجائے گا غرض ان الزامات کی وہ حالت ہے جو اس شعر کی مصداق ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں ۔۔۔ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

ہر شخص پر ایک نہ ایک دفعہ قائم ہے اگر کسی خاص شخص پر ان دفعات میں سے ایک دفعہ قائم نہ ہوسکتی ہو تو اس کے لئے دوسری دفعہ موجود ہے تفاخر کے متعلق ایک اور حدیث یاد آئی ہے نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ دَعْوَةِ الْمُتَبَارِيَيْنِ ۔ ممانعت فرمائی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو شخصوں کی دعوت قبول کرنے سے جو ایک دوسرے سے بڑھنا چاہیں اور بچا کچی میں کھانا کھلاویں۔ یہ بلا ہم نے قصبات میں بہت دیکھی ہے اور شہروں میں اور طرح کی بلائیں ہیں۔ قصبات میں تو یہ حالت ہے کہ اگر کسی نے ایک تقریب میں دو قسم کا کھانا دیا ہے تو دوسرے شخص نے اپنی تقریب میں تین قسم کا کھانا دیا، تیسرا چار قسم کا اس کا یہاں تک اہتمام ہے کہ گذشتہ فہرستیں کھانے کی نکال کر دیکھی جاتی ہیں کہ فلاں شخص کی تقریب میں کتنے کھانے تھے۔ اگر چار تھے اور چار ہی ہماری تقریب میں دیئے گئے تو نام ہی کیا ہوگا اور تذکرہ ہی کیا ہوگا کیونکہ کوئی نئی بات تو نہ ہوئی چار کی جگہ چھ ہونے چاہئیں۔ ورنہ پانچ تو ضرور ہوں اب بھلا یہ تفاخر نہیں تو کیا ہے۔ یہ اس سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اُس سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا تو ان اہل رسم کو زبان سے اقرار ہے کہ ہم نمود کے لئے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں

چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک پردیسی صاحب نے ہمت کر کے اپنی بہن کو انہی کپڑوں میں رخصت کر دیا اس کی والدہ کے پاس کل آٹھ سو روپیہ تھا اسی میں ان کو خرچ بھی کرنا تھا۔ بڑی بی صاحبہ کی یہ تجویز تھی کہ لڑکی کو پانچ سو کا زیور دوں گی جوڑے دوں گی پھر خرچ کروں گی گویا آٹھ سو کی رقم کیا تھی چھاچھ تھی کہ پانی ڈالتے جاؤ اور بڑھتی جائے یا انھیں ضرب کا عمل آتا ہوگا کہ چار کو ضرب دیا چار سے سولہ ہوئے سولہ کو ضرب دیا چار سے چونسٹھ ہوگئے چونسٹھ کو ضرب دیا چار سے اور بڑھ گئے اسی طرح ضرب پر ضرب دیتے چلے گئے اور رقم بڑھتی چلی گئی مگر ضرب سے رقم کاغذ ہی میں بڑھتی ہے واقع میں نہیں بڑھتی واقعیت کا تو یہ حال ہے کہ ایک بنئے کا منشی دوکان پر بیٹھا حساب لگا رہا تھا بنیوں کے منشی منیم کہلاتے ہیں تو منیم جی حساب جوڑ رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ چونسٹھ کے چار ہاتھ لگے چھ ہاتھ لگے آٹھ ہاتھ لگے بارہ۔ تھوڑی دیر میں سینکڑوں کی نوبت پہونچ گئی۔ ایک فقیر بھی یہ سب کھڑا سن رہا تھا اور حاصلات کو جوڑ رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ جب حساب ختم ہو تو میں سوال کروں۔ چنانچہ جب منیم جی حساب جوڑ چکے تو اس نے سوال کیا کہ کچھ مجھے بھی مل جائے اس نے کہا میرے پاس اس وقت کچھ نہیں ہے فقیر نے کہا اجی مجھے کیوں بہکاتے ہو میں تو برابر کھڑا سن رہا تھا ہاتھ لگے اتنے اور ہاتھ لگے اتنے۔ سینکڑوں روپیہ تو ابھی ہاتھ لگ چکے ہیں پھر کہتے ہو میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں یہ کیا غضب ہے۔ اس نے کہا ارے بھائی وہ تو کاغذ ہی میں ہاتھ لگے تھے واقع میں ہاتھ خالی ہیں۔ تو اگر کسی کے پاس ضرب کا عمل ہو بھی تو اس سے کوئی رقم واقع میں تھوڑا ہی بڑھ جاتی ہے۔ بہرحال بہت ہی طوفان برپا کرنے کے ارادے تھے۔ بڑی بی کے چنانچہ ہمارے گھر میں مشورہ کرنے کے لئے رات کو آئیں میدان ہوا خالی صاحبزادے نے موقع کو غنیمت سمجھا داماد کو بلا لائے اور لڑکی کو بہلی میں بٹھا کر کہ دیا کہ لو بھائی لیجاؤ خود بھی تشا ہو گئے وہ ماں ہمارے یہاں تھیں یہ خبر اُنہیں وہیں پہونچی پھر تو صاحب وہ کوسنے اور رونا پیٹنا مچایا کہ آفت برپا کر دی میں نے کہا خبردار جو ہمارے گھر میں رونا پیٹنا مچایا جاوے اپنے گھر میں جا کر روؤ پیٹو۔ اس کے بعد میں نے کہا دکیا کروں کمبخت رحم آجاتا ہے میں نے

کیا) خیر جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہو چکا لڑکی تو اپنے گھر پہنچ چکی یوں کرو کہ جوڑا اب بنا دو میں بھیجدوں وہ کہنے لگے ہائے میں یوں دیتی یولیتی میں نے کہا خیر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے میں بزاز کو بلا دوں خوب اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے بنا کر بھیجدو قبل اس کی واپسی کے سرخرو ہو جاؤ گی کیونکہ تم یہ کہہ سکو گی جب ہمیں خبر ہوئی تب ہم نے کپڑے بھیجدیئے اس سے پہلے ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ یہ سن کر وہ کیا کہتی ہیں کہ واہ جی اب کیا ہوتا ہے اصلی موقع تو دینے کا نکل ہی گیا اب کیا نام ہوگا وہ تو اب جات ہی جاتی رہی اب تو میں کچھ بھی نہیں کرونگی صاف کہتی ہے واہ جی اب تو کچھ بھی نہیں کروں گی آپ نے دیکھ لیا یہ تو زبان سے اقرار ہے اچھا ہوا بیچاری کے روپے بچ گئے ورنہ حج ہی رہ جاتا کیونکہ آٹھ سو روپیہ سے کم میں تو آجکل حج بھی نہیں ہو سکتا بالخصوص عورت کا کیونکہ بدون محرم کے عورت کو حج کرنے جانا جائز ہی کہاں ہے اور اب تو ایک شخص کے لئے پانچسو روپیہ صرف حج ہی حج کو چاہیئے یعنی بلا حاضری مدینہ طیبہ کے اور اگر مدینہ طیبہ بھی جانا ہو تو تین سو روپیہ اور چاہیئں غرض آٹھ سو سے کم میں تو فقط بڑی بی کا حج بھی نہیں ہو سکتا تھا خیر اس کا بھلا ہو گیا رقم بچ گئی تو غرض جو کچھ تقریبات میں کیا جا رہا ہے سب ناموری کے لئے کیا جا رہا ہے۔ تو اب بتلایئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اور یہ سوال کہاں تک صحیح ہے کہ ان چیزوں میں ناجائز کی کیا بات ہے یہ بالکل غلط ہے۔ اگر گناہ کی حقیقت سے واقف ہوتے تو ہرگز ایسا نہ سمجھتے۔

ے سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا است۔ (خطا یہی ہے کہ دوست تم سخن شناس نہیں ہو)

گناہ فقط یہی نہیں ہے کہ ڈومنیاں بجائی جائیں، گناہ فقط ڈومنی ہی میں منحصر نہیں یہی تو غلطی ہے آپ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گناہ فقط دو تین ہی ہیں خصوص دل کے گناہ کو تو گناہ ہی نہیں سمجھتے حالانکہ یہ بات نہیں گناہ بہت ہیں اور ان میں دل کے بھی بہت سے ہیں حضرت جنید بغدادی کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ نماز پڑھنے مسجد میں آئے۔ دیکھا کہ ایک سائل سوال کر رہا ہے دیکھنے میں بالکل تندرست خوب ہٹا کٹا موٹا تازہ بظاہر نہ کوئی معذوری نہ مجبوری۔ انہوں نے اپنے دل میں کہا کہ ایسے شخص کو تو سوال کرنا بالکل حرام ہے اور یہ ناجائز کام کر رہا ہے حالانکہ ممکن تھا کہ اس کو کوئی خاص عذر ہو جسکی وجہ سے وہ

اکتساب کے قابل نہ ہو یا اکتساب کی قابل ہو لیکن اکتساب سے اس کی ضرورت پوری نہ ہو سکتی ہو مثلاً فرض کیجئے کسی ظالم نے اس پر ایک ہزار کی ڈگری ناحق کرادی ہے اور وہ مظلوم ہے اس صورت میں گو وہ ہاتھ پاؤں سے درست ہے مگر ہزار روپیہ وہ ایک دم کہاں سے دے بلکہ اس صورت میں دو سو چار سو روپیہ اس کے پاس جمع بھی ہوں تب بھی وہ باقی روپیہ کا اکتساب ایک دو دن میں تو نہیں کرسکتا لہٰذا ایسے شخص کو اجازت ہے شریعت سے کہ بھیک مانگ کر ڈگری کا روپیہ ادا کردے اور اپنی جان چھڑالے۔ بگران کو اس کی ظاہری حالت سے شبہ پڑا اور اس کو دل میں بُرا کہا۔ رات کو جو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مردہ ہے اور اس کو کاٹ کاٹ کر کھلانے کے لئے ان سے کہتا ہے یہ انکار کرتے ہیں تو ان کو جواب ملتا ہے کہ دن میں تو اس فقیر کی غیبت کر کے مردہ کا گوشت کھایا اور اب انکار ہے انھوں نے کہا کہ میں نے اس کو کچھ کہا نہیں جواب ملا غیبت زبان ہی سے کہنے سے ہوتی ہے دل سے بھی تو ہوتی ہے حق تعالیٰ تو قلب کو دیکھتے ہیں بلکہ اصل غیبت دل سے ہی ہے ؎

اِنَّ الْکَلَامَ لَفِی الْفُؤَادِ وَاِنَّمَا   جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَی الْفُؤَادِ دَلِیْلًا

یعنی کلام تو دراصل قلب ہی میں ہوتا ہے زبان تو محض اس کی مترجم ہے۔ جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہ صرف اس کو ظاہر کردیتی ہے باقی بات تو وہی ہوتی ہے جو دل میں ہوتی ہے چنانچہ اٹھے اور پہونچے اسی فقیر کے پاس۔ دور سے دیکھ کر اس نے فوراً یہ آیت پڑھی وَھُوَالَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَعْفُوْ عَنِ السَّیِّئَاتِ جس کا مطلب یہ تھا کہ گھبراؤ نہیں توبہ کرنے سے خدا سب گناہ معاف کردیتا ہے چونکہ اب توبہ کر چکے ہو لہٰذا سب معاف تو دیکھئے غیبت دل سے بھی ہوتی ہے اسی طرح حدیثوں میں وعید آئی ہے ریا پر اور وعید آئی ہے حسد پر اور وعید آئی ہے کبر پر حب دنیا پر اب بتلایئے یہ سب گناہ قلب کے متعلق ہیں یا اعضاء ظاہری کے ظاہر ہے کہ قلب ہی کے متعلق ہیں اور بھی گناہ قلب کے متعلق کیا ہوتے سارے ہی گناہوں کا تعلق اول قلب ہی سے ہوتا ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا

فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ یاد رکھو کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے گوشت کا اگر وہ سنوارا ہوا ہوتا ہے تو سارا بدن سنور جاتا ہے اور وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے یاد رکھو کہ وہ قلب ہے واقعی قلب ہی کے اوپر دارو مدار ہے صلاح و فساد کا۔ صوفی تو اس کے قائل ہیں سارے فقہا بھی اس کے قائل ہیں دیکھئے آخر بدون نیت کے نماز ہی صحیح نہیں ہوتی اور نیت ہی سے ایک نماز سنت ہوتی ہے اور دوسری فرض مثلاً چار ہی رکعت سنت میں ہیں اور چار ہی فرض میں تو اگر سنت کی نیت کر لی سنت ہوگئی فرض کی نیت کر لی فرض ہوگئے۔ برخلاف اس کے یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ نیت تو کی جائے سنت کی اور ہوجائے فرض اور یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ اگر محض قلب میں نیت کر کے نماز پڑھ لے تو نماز ہوجائے گی زبان سے چاہے کچھ بھی نہ کہے لیکن چونکہ ہمارا قلب پریشان رہتا ہے اور ہم کو قلب سے نیت کرنا دشوار ہے اس لئے فقہا نے احتیاطاً زبان سے بھی نیت کے الفاظ کہہ لینا تجویز کر دیا ہے ورنہ اگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہے مگر دل میں سمجھے کہ میں ظہر کی نماز ادا کرتا ہوں تو نیت متحقق ہوجائے گی اور نیت وہ چیز ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ سارے اعمال کا دارومدار نیت ہی پر ہے۔ اب بتلائیے فقہا کے نزدیک بھی قلب ہی کے اوپر سارا دارومدار ہوا یا نہیں نیت وہ چیز ہے کہ اگر ظہر کے وقت میں نیت فرض کر لی تب تو فرض ادا ہوں گے ورنہ اگر کسی نے ہزار نفلیں بھی ظہر کے وقت میں پڑھ ڈالیں مگر اس کے ساتھ نیت فرض کی نہ کی تو اس کے ذمہ فرض موجود۔ اور عذاب تیار۔ اور حضرت قلب تو وہ چیز ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ جل وعلا شانہٗ کے ساتھ معاملہ کا سارا مدار اسی پر ہے تو اب یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ قلب کے متعلق کوئی عمل نہیں خوب سمجھ لیجئے کہ گناہ صرف اعضا ظاہری ہی کے متعلق نہیں ہیں بلکہ قلب کے متعلق بھی ہیں جیسا کہ بالتفصیل ثابت کر دیا گیا ہے لیجئے اس جماعت کا تو فیصلہ ہوا۔ یہ بیان ذرا طویل ہوگیا لیکن یہ ضرورت تھی اس بیان کی کہ بعض لوگوں کی زبان پر یہ لفظ آتا ہے کہ شریعت کو ہماری شادی اور غمی سے کیا تعلق اسی لئے

میں نے یہ آیت پڑھی ہے اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (کیا انسان خیال کرتا ہے کہ مہمل چھوڑ دیا گیا ہے) انکار فرماتے ہیں اور نکیر فرماتے ہیں اس خیال پر کہ انسان مہمل چھوڑا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ہر چیز کو شریعت سے پوچھو۔ کہیں وہ جواز کا فتویٰ دے گی کہیں عدم جواز کا۔ بہت لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ پھر کیا کیا رسمیں کریں اور کیا کیا نہ کریں میں کہتا ہوں کہ بجز ایجاب و قبول کے سب فضول ہے کچھ نہ کرو اب چاہے مجھے کوئی دیہاتی کہے یا گنوار کہے جو چاہے کہے۔ اور دیہاتی تو ہم ہیں ہی۔ ہمارے جواب تو دیہاتی ہی ہیں چاہے کوئی برا مانے چاہے بھلا مانے۔ بس سو سنار کی اور ایک لوہار کی۔ اس جواب پر بعض نے مجھے رائے دی کہ ایسی سختی مناسب نہیں ایک دم سے ساری رسمیں نہ چھڑانی آہستہ آہستہ چھڑانی چاہئیں۔ رفتہ رفتہ ہی اصلاح ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے کیوں مقید کرتے ہو مجھ سے یہ کیوں کہلواتے ہو۔ اگر ایک دم سے ساری رسمیں تمھیں چھوڑنا مشکل ہیں تو تمھیں اختیار ہے تم خود رفتہ رفتہ چھوڑو باقی مجھے وہی کہنے دو جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں آخر تمھارا اس میں ضرر ہی کیا۔ اور اگر میں ایک ایک کر کے منع کروں تو اس میں یہ خرابی ہے کہ فرض کرو آج دس چیزیں ہیں قابل منع کرنے کے اور ان میں سے صرف آٹھ کو منع کیا اب وہ سمجھیں گے کہ ہم مخاطب صرف انہی آٹھ کے چھوڑنے کے ہیں خیر بیچاروں نے نفس کو مجبور کر کے ان آٹھ کو چھوڑا۔ کل کو دو کی اور ممانعت کی گئی تو اب حجت ہوگی کہ لو آج یہ دو اور بڑھا دیں تو کل تو اجازت دیدی تھی۔ آج منع کرتے ہیں ان کا کیا بھروسہ ہے خدا جانے کہاں تک یہ سلسلہ جاری ہے یہ خرابی ہے آہستہ آہستہ منع کرنے میں۔ تو مجھے کیوں مقید کرتے ہو میں تو دس کے دس ہی کو منع کروں گا تمھیں اگر ہمت نہ ہو تم ایک ایک دو کر کے چھوڑ دو مجھے خوامخواہ کیوں مقید کرتے ہو۔ تو صاحب میں تو یہی کہوں گا کہ صرف ایجاب و قبول چاہیئے باقی کھلانا پلانا۔ دینا دلانا جمع کرنا سب واہیات سب ہی میں خرابی ہے کسی میں تھوڑی کسی میں بہت اگر بنظر انصاف سے دیکھا جائے تو اکثر تو یہی ہے کہ کھلانا پلانا جمع کرنا دور دراز سے لوگوں کو بلانا جوڑے دینا لینا یہ سب صرف نام و نمود کے لئے ہوتا ہے نہ کسی کے ساتھ ہمدردی مقصود ہوتی ہے نہ کچھ۔ ہر شخص اپنے دل کو ٹٹول کر

دیکھ لے اگر کوئی کہے کہ صاحب ہم نے تو خوب غور کرکے دیکھ لیا ہماری نیت تو بالکل ٹھیک ہے ہم کو تو نام ونمود ہرگز مقصود نہیں ہیں تو اس کا وسوسہ بھی نہیں تو میں اس کی تکذیب نہیں کرتا واقعی بعضے خوش نیت بھی ہوتے ہیں میں خواہ مخواہ ان کو کیوں الزام دوں۔ اور جو مصالح وہ بیان کرتے ہیں وہ ایک حد تک ٹھیک بھی ہیں کہتے ہیں کہ اجی روز روز تو عزیزوں سے کہاں ملنا ہوتا ہے تقریبات میں سب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ غریبوں کو کھانا پہونچ جاتا ہے ہاں یہ ضرور نیک نیتی ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اول تو ایسے خالص نیک نیت ہیں کتنے پھر جو ہیں بھی انھوں نے بس ایک مصلحت کو تو دیکھا اور ہزاروں مفسدوں پر نظر نہ کی حَفَظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ اَشْيَاءُ ایک چیز پر تو نظر رہی اور دوسری بہت سی چیزیں نظر سے غائب کر دیں سو حضرت سنئے اس کے واسطے بھی شریعت نے ضوابط و قواعد مقرر کر دیئے ہیں شریعت کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے نہایت منضبط اور مکمل قانون ہے اکثر حضرات یہ مصلحتیں بیان کر کر مجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ میں ان تقریبات میں کچھ گنجائش نکال دوں صاحب اگر شریعت میرے اختیار میں ہوتی تو مجھ سے درخواست رعایت کی کی بھی جائے لیکن شریعت میرے گھر کی چیز تو نہیں اگر میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کر کے اپنی طرف سے رعایت کر بھی دوں تو اس سے ہوتا کیا ہے جو امر ناجائز ہے وہ میرے کہنے سے جائز تھوڑا ہی ہو جائے گا بلکہ الٹا مجھ ہی سے سوال ہوگا کہ تم کون تھے جائز کرنے والے تو میں کیوں مصیبت میں پڑوں اب سنئے کہ شریعت نے ایسے موقع کے لئے کیا حدود اور قواعد مقرر کئے ہیں سو منجملہ ان کے ایک قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی چیز میں مصلحت اور مفسدہ دونوں جمع ہوں تو اعتبار مفسدہ کا ہوتا ہے یعنی اگر کسی چیز میں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے تو اس حالت میں مصلحت کو نہ دیکھا جائے گا بلکہ مفسدہ کا اعتبار کیا جاوے گا پھر اس کی بھی ایک حد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصلحت دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو وہ جس کا حاصل کرنا واجب ہو وہاں تو یہ حکم ہے کہ اس مصلحت کو حاصل کرو اور مفسدہ کو روکنے کی کوشش کرو۔ مثلاً جماعت میں آتے ہیں نماز کے لئے لیکن فرض کرو کہ امام ایسا ہے کہ قرآن غلط پڑھتا ہے یا اور کوئی ایسا ہی نقص ہے جس کی وجہ سے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے تو ہم

کوشش تو یہ کریں گے کہ وہ شخص امامت سے معزول کر دیا جائے لیکن جب تک ہم اس کوشش میں کامیاب ہوں گے اس وقت تک اسی کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں گے یہ نہ کریں گے کہ جماعت چھوڑ دیں کیونکہ جماعت یا سنت موکدہ ہے یا واجب اس میں علما کا اختلاف ہے ہمارے علماء حنفیہ میں محققین کی یہی تحقیق ہے کہ واجب ہے جماعت کیونکہ اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں وہ سنت موکدہ سے بڑھی ہوئی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میرا جی یوں چاہتا ہے کہ لکڑیاں جمع کراؤں پھر اذان کہلاؤں اور جماعت کراؤں پھر دیکھوں کون کون جماعت میں نہیں آیا جو نہیں آیا ان کے گھر جا کر پھونک دوں ایسی وعید سنّت موکدہ پر نہیں ہوتی ہے اسی واسطے ہمارے بہت علماء نے جماعت کو واجب کہا ہے۔ اس پر شبہ کیا ہے بعض ذہین لوگوں نے کہ یہ وعید منافقوں کے واسطے تھی کہ اہل ایمان کے واسطے کیونکہ منافق ہی جماعت میں حاضر نہیں ہوتے تھے تو یہ وعید گھر پھونک دینے کی دراصل ان کے نفاق پر تھی نہ کہ ترک جماعت پر میں کہتا ہوں فہم سے کام لینا چاہیے اول تو اس حدیث میں کوئی قرینہ اس تخصیص کا نہیں دوسرے ایک اور بھی قاعدہ ہے کہ کفار صرف ایمان کے مکلف ہیں فروع کے مکلف نہیں اور اہل ایمان مکلف فروع کے بھی ہیں مثلاً کفار جب تک کافر ہیں انھیں یہ حکم نہیں دیا جاتا کہ نماز پڑھو کیونکہ نماز بدون ایمان کے صحیح نہیں ہو سکتی تو اگر ان کو حکم دیا بھی جائے کہ نماز پڑھو تو اس حکم سے فائدہ کیا ہوگا کیونکہ نماز صحیح تو ہونے کی نہیں پھر یہ ایک فضول بات کا حکم ہوا انھیں حکم دیا جائے گا کہ ایمان لاؤ بس ایمان لانا تھا کہ اب تمام خطاب ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور سارے فروع کے وہ مکلف بن گئے اب ہر ہر حکم ان سے متعلق ہو گیا اس کے پہلے کچھ بھی نہیں تھا اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی باغی ہو اس کو یہ خطاب نہیں کیا جاوے گا کہ اگر اتنے دن تک کوئی شخص زمین پر قابض رہے تو وہ موروثی ہو جائے گا سارے احکام کی اس کو تبلیغ نہیں کی جائے گی بلکہ اس کو سب سے پہلے حکم یہ ہوگا کہ بغاوت چھوڑ دو اس سے پہلے دفعات فوجداری اور دیوانی کے متعلق اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا جب اس نے بغاوت چھوڑ دی

تو اب اس پر سارے دفعات عاید ہوگئے۔ فوجداری کے دفعات بھی دیوانی کے دفعات بھی جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب دوسرا قاعدہ سنئے کہ منافق تھے کافر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے بتلا دیا گیا تھا کہ فلاں فلاں منافق ہیں تو ان کا کافر ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا اور جب وہ کافر تھے تو ان کی طرف حسب قاعدہ مذکورہ جماعت کا امر متوجہ ہی نہ تھا لہذا وہ ترک جماعت پر کسی سزا کے مستحق ہی نہ تھے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا گھر کیوں جلاتے تو وہ شبہ جاتا رہا اور ثابت ہوگیا کہ یہ وعید ترک جماعت ہی پر ہے اور ایسی سخت وعید سنت موکدہ کے ترک پر ہوا نہیں کرتی اس واسطے محققین حنفیہ قائل ہوئے ہیں جماعت کے واجب ہونے کے۔ بہرحال جماعت خواہ واجب ہو خواہ سنت مؤکدہ ہے ضروری چیز تو مسجد میں آنا جماعت کے لئے ایک ایسی مصلحت ہے جو ضروری ہے مگر اس کے ساتھ یہ مفسدہ مل گیا ہے کہ امام ایسا ہے جس کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے۔ اب یہاں مصلحت بھی ہے اور مفسدہ بھی ہے مگر مصلحت ہے واجب التحصیل تو اس صورت میں حکم یہ ہوگا کہ جماعت کو نہ چھوڑو اس مفسدہ کا علاج کرو یعنی امام کو الگ کرو مگر الگ کرو خوش تدبیری سے فتنہ فساد کی اجازت نہیں ایسی باتوں کے لئے لڑنا بھڑنا نہ چاہیئے کیونکہ لڑنے بھڑنے کے مفاسد اس کراہت کے مفسدہ سے بھی زیادہ ہیں اور اگر اس امام کے الگ کرنے پر قدرت نہ ہوگی تو اس پر عمل کریں گے کہ صَلُّوْا خَلْفَ كُلِّ بِرٍّ وَّفَاجِرٍ یعنی ہر شخص کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو خواہ وہ نیکوکار ہو یا بدکار۔ یہ حکم تو مصلحت واجب التحصیل کا تھا اور ایک مصلحت وہ ہے کہ وجوب کے درجہ میں نہیں ہے جیسے تقریبات میں بہت سے بھائیوں کا آپس میں مل لینا یا غریبوں کو وقت خاص پر کھانا مل جانا یہ مصلحت شرعاً واجب نہیں ہے اور اس کے ساتھ مفاسد بہت سے موجود جیسے تفاخر اور ریا اور کیا اور کیا۔ جہاں ایسی مصلحت جو واجب نہ ہو کسی مفسدہ کے ساتھ جمع ہو جائے گی وہاں اس مصلحت ہی کو چھوڑ دیں گے بلکہ ایسی ایسی ہزار مصلحتیں بھی کسی ایک مفسدہ کے ساتھ جمع ہو جائیں گی ان کو بھی ترک کر دیا جائیگا تو ہمارے قبضہ میں نہیں ہے

قانون کہ تمھارے مصالح کی رعایت سے اس میں وسعت کردی جائے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس قانون کی تصریح موجود ہے۔ ارشاد ہے یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ‌ؕ قُلۡ فِيۡهِمَآ اِثۡمٌ كَبِيۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا۔ یعنی پوچھتے ہیں آپ سے کہ خمر اور جوئے کا کیا حکم ہے۔ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور ان میں کچھ نفعے بھی ہیں (ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے) دیکھئے خود آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ جوئے اور شراب میں مصالح موجود ہیں لیکن چونکہ گناہ بھی موجود ہے اس واسطے حکم ان کی حرمت ہی کا ہوا۔ تو یہ قاعدہ قرآن مجید سے ثابت ہوگیا کہ جہاں مفسدہ اور مصلحت غیر مطلوب فی الشرع جمع ہو وہاں ترجیح مفسدہ ہی کو ہوگی۔ لیجئے اب تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس قانون کے انکار کی لیجئے میرا مدعا آیت سے بھی ثابت ہوگیا۔ گو اس ثبوت کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ہم مقلدوں کو حق کیا ہے نصوص سے استدلال کرنے کا ہم تو تابع ہیں اپنے ائمہ کے۔ جب ان کا مذہب مدون ہے تو ہم کو اسی کو لے لینا کافی ہے۔ یہ کام تو علمائے مجتہدین کا ہے نصوص سے استدلال کریں اور قانون مرتب کریں ہم جیسوں کو تو یہی کافی ہے کہ جس امام سے عقیدت ہو اس کے قول پر عمل کرلیں۔ مثلاً ہم اتباع کرتے ہیں امام ابو حنیفہ کا تو ان کا قول ہمارے لئے کافی ہے ہم اسی پر عمل کریں گے۔ رہا نصوص سے استدلال سو یہ ان کا کام ہے پس جب ہم مذہب حنفی میں یہ اصل لکھا ہوا مدون پاتے ہیں کہ اگر کسی کام میں مفسدہ اور مصلحت دونوں جمع ہوں تو ترجیح مفسدہ کو ہوگی بشرطیکہ مصلحت واجب التحصیل نہ ہو۔ بس اس بناء پر ہم ان رسوم کو منع ہی کریں گے۔ اب اس کا بھی جواب ہوگیا کہ اس میں مصلحتیں ہیں۔ کیونکہ جہاں مصلحتیں ہیں وہاں مفسدے بھی تو موجود ہیں۔

اب ایک بات رہ گئی یعنی بہت لوگ ایسے بھی تو ہیں جن کی نیت میں نہ تفاخر ہے نہ کبر نہ شہرت نہ کوئی اور خرابی بالکل پاک صاف ہیں وہ البتہ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب ہمارے فعل میں تو مصالح ہی مصالح ہیں مفاسد ہیں ہی نہیں سب مصلحت ہی مصلحت ہے

مفسدہ کچھ بھی نہیں۔ اللہ گواہ ہے ہماری نیت نہ تفاخر کی ہے نہ ریا کی۔ ہماری نیت میں کوئی خرابی نہیں۔ ہماری نیت بالکل پاک صاف ہے سو اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے تو ہم تکذیب نہیں کرتے۔ ایک مسلمان کی ممکن ہے کسی کی نیت ایسی ہی پاک صاف ہو۔ اور اسراف کا جو مفسدہ تھا اس کا وہ یہ جواب دے سکتے ہیں کہ ہمیں ماشاءاللہ خدا نے اتنا دیا ہے کہ ایسے ایسے خرچوں سے ہمیں رائی برابر بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا اول تو اس کا تسلیم ہی کرنا مشکل ہے کہ نقصان نہیں پہنچتا میں اگر آ جاؤں انکار پر تو کہہ سکتا ہوں کہ قرض ہو ہی جاتا ہے اور میں ثابت کر سکتا ہوں واقعات سے کہ بڑے بڑے لوگ بھی مقروض ہو جاتے ہیں ایسے موقعوں پر کیونکہ ہر شخص اپنی حیثیت سے بڑھ کر ہی ان تقریبات میں خرچ کیا کرتا ہے۔ یوں چاہے گراں نہ سمجھیں اس قرض کو مگر خیر مجھے قیل و قال کرنا منظور نہیں ہے میں اس کو بھی مانتا ہوں کہ اسراف بھی نہیں ہوتا بلا ضرورت میں اس بحث میں کیوں پڑوں مگر ہاں جو بات کہنے کی ہے وہ تو ضرور کہی جائے گی۔ کیا میں حقائق کو بھی ظاہر نہ کروں۔ سو سنئے۔ میں نے یہ مانا کہ آپ اپنی نیک نیتی کی بنا پر اس کلیہ سے ایک درجہ میں بچ گئے کہ جہاں مفسدہ اور مصلحت دونوں جمع ہو جائیں وہاں ترجیح مفسدہ کو ہوتی ہے۔ خیر اس کلیہ سے تو آپ جیسے تیسے بچ گئے لیکن حضرت ابھی پیچھا نہیں چھوٹا ابھی ایک اور کلیہ بھی موجود ہے وہی کلیہ جس کا وعدہ میں اوپر کر چکا ہوں وہ بھی ہماری شریعت ہی کے اصول میں سے ہے اور قرآن و حدیث سے تائید کیا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے جس عمل مباح سے کسی دوسرے مسلمان کو ضرر دین کا پہونچے ہمارے لئے بھی وہ عمل مباح نہ رہے گا حتیٰ کہ کسی فعل مندوب و مستحب سے بھی اگر کسی مسلمان کے اعتقاد یا عمل میں کوئی خرابی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس مستحب کو ترک کر دیا جائے گا یہی راز ہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعض احادیث پر عمل کو ترک کرانے کا مثلاً حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف تھی جمعہ کے دن صبح کی نماز میں الم تنزیل اور سورہ دہر پڑھنے کی اکثر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔ چنانچہ شافعیہ اب بھی پڑھتے ہیں۔ اب تک ان کا یہی معمول ہے اور امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ اس کا التزام مناسب نہیں۔ دیکھئے حدیث میں تو وارد مگر امام صاحب اس کو منع کرتے ہیں۔ اصل میں امام صاحب کے اس قول کا حاصل یہ ہے کہ یہ عمل واجب تو ہے نہیں محض مستحب ہے اور اس مستحب سے دوسروں کے واسطے ایک خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہاں اپنا اپنا تجربہ اور اپنا اپنا مشاہدہ ہے نہ ایک کو دوسرے کا رد چاہیئے نہ تنقیص۔ ممکن ہے امام ابو حنیفہؒ کو تجربہ ہوا ہو اور اس خرابی کا ان کو مشاہدہ ہوا ہو اور ان کو نہ ہوا ہو اس میں ان سے منازعت نہیں ہو سکتی۔ غرض ان کو مشاہدہ ہوا عوام الناس کی کیفیت کا کہ بعض مستحب افعال بھی ان لوگوں کو شبہ میں ڈال دیتے ہیں چنانچہ اس معمول کے متعلق بھی امام صاحب نے سمجھا کہ جب کسی جمعہ میں بھی ناغہ نہ ہوا اور کبھی اس کے خلاف کرتے نہ دیکھے گے تو سمجھیں گے کہ یہ عمل لازم اور واجب ہے۔ یہ تو اعتقادی خرابی ہوئی۔ دوسرے ممکن ہے کہ ایک اور بھی خرابی کا مشاہدہ ہوا ہو اور وہ عملی خرابی ہے۔ وہ یہ کہ بعض دفعہ جو نماز میں مجمع ہو جاتا ہے بڑا، تو دور والوں کو سنائی نہیں دیتا کہ امام کونسی صورت پڑھ رہا ہے، تو اب تو خیر ہے نہیں کہ امام نے سجدہ کی آیت پڑھی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے اس لئے تو کیا سجدہ یہ گئے رکوع میں۔ وہ اٹھا سجدہ سے اور کہا اللہ اکبر۔ انھوں نے کہا سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ۔ بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں ایک دفعہ یہی گڑبڑ ہوئی۔ وہاں یہ دستور ہے کہ سب اہل مذاہب جمع ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔ کسی مصلے پر نماز ہوتی ہو شافعی پر یا حنفی پر یا کسی پر دوسرے اماموں کے مقلد بھی بلا تامل شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں کا سا قصہ نہیں ہے کہ کوئی شافعی امام ہو جائے تو اس کے پیچھے حنفی نماز نہ پڑھیں یہ واہیات بات ہے۔ وہاں سب پڑھ لیتے ہیں ایک دوسرے کے پیچھے وہاں کوئی تخصیص نہیں کرتا۔ چنانچہ جمعہ کے دن ایک دفعہ یہ ہوا کہ صبح کی نماز شافعی مصلے پر ہو رہی تھی۔ حج کا زمانہ، مجمع تھا بہت۔ امام ٹھیرے شافعی۔ انھوں نے حسب معمول

الم تنزیل پڑھی اب انھوں نے سجدہ کی آیت پر پہنچکر سجدۂ تلاوت کیا اور اللہ اکبر کہکر ایک ساتھ سجدہ میں گئے۔ اب جنھیں معلوم نہیں ہے کہ یہ سجدۂ تلاوت کیا گیا ہے اور وہ سمجھے کہ امام نے رکوع کیا وہ گئے رکوع میں امام اٹھے سجدہ سے کہا اللہ اکبر انھوں نے کہا سمع اللہ لمن حمدہ اب امام تو قرأت میں ہے اور وہ منتظر ہیں کہ سجدہ میں جاوے اب امام سجدہ ہی میں نہیں جاتا۔ جب بہت دیر ہوگئی تو اب کوئی تو نیت توڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ آخر معاملہ کیا ہے کوئی سجدہ میں چلا گیا اس خیال سے کہ شاید تکبیر کی آواز نہ سنائی دی ہو۔ سجدہ سے اٹھ کر جو دیکھا تو لوگ کھڑے ہیں۔ خیر یہ بھی کھڑے ہو گئے اس کے بعد امام نے پھر دو رکعت پڑھیں تو ان کے نزدیک گویا امام نے تین رکعتیں پڑھیں غرض اس قدر گڑبڑ ہوئی کہ کوئی رکوع میں ہے کوئی سجدہ میں ہے۔ کسی نے نیت توڑ دی۔ کوئی سمجھا امام نے تین رکعتیں پڑھیں۔ چنانچہ ایک شخص بخارا کے بھی اس جماعت میں تھے وہ جب لوٹ کر گھر پہنچے تو کہنے لگے ارے میاں شافعیوں نے تو قرآن و حدیث کے بالکل خلاف عمل اختیار کر لیا ہے مغرب کی طرح صبح کی بھی تین رکعت پڑھتے ہیں تو آپ نے دیکھا کہاں تک نوبت پہنچی۔ بس امام صاحب نے ایسے ہی واقعات دیکھ کر فرمایا کہ جو عمل واجب بھی نہیں اور عوام میں اس کے کرنے سے پڑتی ہے گڑبڑ تو کیا ضرورت ہے کہ اس کو کیا ہی جاوے جیسے بعض لوگوں کو خواہمخواہ شوق ہوتا ہے نئی بات کرنے کا۔ چنانچہ ایک قاری صاحب نے نماز پڑھائی قرأت کے جوش میں آکر آپ نے قل ہو اللہ احد پڑھنے میں احد پر وقف نہیں کیا۔ بلکہ اس کو اللہ الصمد سے ملا کر پڑھا تو چونکہ احد پر تنوین ہے اس لئے عربیت کے قاعدہ سے اس صورت میں اللہ الصمد کا ہمزہ حذف ہو جائیگا۔ اور احد کی تنوین کا نون مکسور ہو کر لام سے مل جاویگا اور اس طرح پڑھا جاویگا اَحَدُ نِ اللّٰہُ الصَّمَدُ تو گو انھوں نے صحیح پڑھا تھا مگر عوام تو نہیں سمجھتے یہاں تک بحث بڑھی کہ حضرت اس پر فوجداری ہوگئی کہ یہ اس قاری نے نیا قرآن شریف کہاں سے نکالا۔ اب بعضے جاہلوں نے کیا کیا۔ اچھے مردم میکند بوزینہ ہم، (جو انسان کرتا وہی بندر بھی کرتا ہے) ان قاری صاحب کی نقل اتاری۔ جاہل کی نقل ہی کیا۔

انھوں نے یہ کیا کہ احد پر وقف بھی کیا اور نون مکسور بھی پڑھا یعنی نِ اللّٰہُ الصَّمَدُ جو بالکل غلط ہے۔ خدا بچاوے جہل بھی کیا بری چیز ہے۔ اب فرمایئے اس موقعہ پر کیا کیا جائیگا یہی کیا جائیگا کہ جہاں جہل ہو اس قاری کو حکم دیا جائیگا شرعی قاعدہ سے کہ ایسا نہ کرے کیوں اس واسطے کہ عوام اس سے گڑبڑ میں پڑتے ہیں غرض ایسی بات کرنا جس میں عوام میں گڑبڑ پڑ جاوے درست نہیں۔ تو قاعدہ یہ ٹھہرا کہ جس مباح سے اور جس مستحب سے عوام کسی دین کی خرابی میں پڑ جائیں وہ فعل خواص کے لئے بھی جائز نہیں رہتا حالانکہ وہ خود اس خرابی سے بچے ہوئے ہیں۔ ایسے موقعہ پر خواص کو لازم ہے کہ وہ خود بھی ایسے فعل مباح کو بلکہ ایسے فعل مستحب کو بھی چھوڑ دیں جس سے عوام کی خرابی کا اندیشہ ہو اور حقیقت میں یہ قاعدہ وہ پہلا ہی قاعدہ ہے مصلحت اور مفسدہ جب جمع ہوتے ہیں مفسدہ کو ترجیح ہوتی ہے کیونکہ دوسرے شخص کا خرابی میں پڑ جانا یہ بھی تو مفسدہ ہے اگر لازم نہیں تو متعدی سہی۔ اسی واسطے میں نے پہلے کلیہ سے بچنے کے مقام پر یہ کہا ہے کہ ایک درجہ میں جب یہ قاعدہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھئے کہ آپ کو وسعت ہے پانچ ہزار خرچ کرنے کی اور آپ کو خدا نے علم بھی دیا ہے جس کی وجہ سے آپ کو نفس پر قدرت ہے اور آپ نے اپنے نفس کو ریا سے فخر سے کبر سے سب سے بچا لیا تقریب میں کوئی بے انتظامی بھی نہیں ہوئی۔ کوئی نماز بھی قضا نہیں ہوئی بلکہ کوئی جماعت بھی فوت نہیں ہوئی۔ حالانکہ ایسے موقعوں پر نمازیں تک قضا ہو جاتی ہیں۔ جماعت کا تو کیا ذکر اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی حج کو بھی جاوے اور وہ حج ہو نفل اور اس میں ایک بھی فرض نماز کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو حج کے جانے کی بھی اجازت نہیں۔ پھر اب دیکھ لیجئے ان تقریبات کی کیا حالت ہے۔ حالت یہ ہے کہ نہ عشا کی نماز ہے نہ صبح کی نماز ہے جماعت تو کوئی چیز ہی نہیں مگر فرض کر لیجئے کہ آپ کے یہاں ایسا بھی نہیں ہوا۔ گو یہ فرض کر لینا ہے بہت بعید اور ہے شاذ و نادر ایسا کہ نمازوں کے فوت ہونے کی نوبت نہ آتی ہو۔ خیر اگر یہ نہیں تو گڑبڑ تو ضرور ہے کہ نمازیں ٹھیک وقت پر ادا نہیں ہوتیں تاہم اگر کوئی کہے کہ ہم اس کا بھی خاص اہتمام رکھیں گے کہ نہ نماز فوت ہونے دیں گے نہ جماعت، نہ تاخیر ہونے دیں گے تو بہت اچھا ہم تکذیب نہیں کرتے آپ کی ہم نے

مانا کہ آپ نے اپنے آپ کو ہر طرح کی برائی سے بچالیا۔ مگر حضور یہ بھی تو دیکھئے کہ نتیجہ کیا ہوا آپ کے فعل کا۔ آپ کو دیکھ کر آپ کے وہ بھائی اور برادری کے لوگ جو آپ سے وسعت میں اور علم میں کم ہیں مگر برابری کے دعوے میں بڑھے ہوئے ہیں وہ بھی تقریب کو اسی طرح کریں گے کہ ہم کیوں گھٹے ہوئے رہیں۔ آپ نے تو گھر میں سے دو ہزار روپے نکال کر خرچ کر ڈالے ان کے گھر میں روپیہ کہاں۔ انھوں نے جائداد گروی کر کے صرف کیا۔ اب جائداد گروی ہوئی اس کی آمدنی گروی رکھنے والا کھا رہا ہے اور وہ سود ہے اور وہ سود لینے والا ہے اور تم سود دینے والے ہو۔ اور حدیث میں دونوں پر لعنت آئی ہے لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اٰکِلَ الرِّبٰوا وَمُوْکِلَہٗ یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے کھانے والے اور کھلانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بلاضرورت لعنت خریدی۔ یہ کاہے کی بدولت ہوا۔ آپ کے فعل کی بدولت۔ نہ آپ ایسا کرتے نہ وہ اس بلا میں پڑتے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ روساء کو کیوں منع کیا جاتا ہے ان کے پاس روپیہ وافر ہے۔ ان پر کیا بار ہوتا ہے۔ ان تقریبات میں خرچ کرنے سے ہاں انھیں منع کرنا چاہیئے۔ جو غریب ہیں میں نے کہا سبحان اللہ معلوم ہوتا ہے آپ کے دل میں ذرا بھی ہمدردی نہیں۔ میں پوچھتا ہوں اگر خدانخواستہ آپ کا بیٹا بیمار رہو اور حلوا کھانا اس کو مضر ہو تو اس وقت آپ کیا کریں گے کیا یہ کریں گے کہ آپ تو حلوا بنا بنا کر کھایا کریں اور وہ دیکھا کرے میں تو نہیں سمجھتا کہ کوئی باپ ایسا ہوگا کہ اس کے سامنے حلوا پکائے گا۔ حضرت اس وقت یہ حالت ہوگی کہ حلوا کھانا چاہیں گے بھی تو حلق سے نہ اترے گا اگر ایسا ہی کوئی قصائی ہوگا تو خیر بازار میں جا کر حلوا کھا آئے گا لیکن گھر میں تو حلوے کا نام بھی نہ آنے دیگا۔ آخر اس کی وجہ کیا، وجہ ظاہر ہے۔ یہی کہ اگر گھر میں حلوا پکے گا یا گھر میں آئے گا تو یہ نہیں ہو سکے گا کہ صرف وہی لوگ کھائیں جن کو حلوا نقصان نہیں کرتا بلکہ اوروں کو کھاتے دیکھ کر اس کو بھی حرص ہوگی یہ بھی کھائے گا اور بدپرہیزی کرے گا چونکہ اس سے محبت ہے اور اس کا نقصان ہرگز گوارا نہیں۔ اس کی خاطر سارے گھر پر حلوا حرام ہو جائیگا۔ لیجئے اس کی بنا اسی قاعدہ شرعی پر تو ہوئی

کہ جو فعل مباح ہے وہ ہمارے لئے بھی ناجائز ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے دل پر اس کا اثر برا پڑتا ہو۔ پس اگر آپ کو محبت ہوتی اور ہمدردی ہوتی مسلمانوں سے تو ایسا کبھی نہ کرتے بلکہ یہ سوچتے کہ میں تو کروں گا اس وجہ سے کہ مجھ کو وسعت ہے اور دوسرا بھائی کرے گا برابری کے دعوی کی وجہ سے اور وہ ہو جائیگا تباہ۔ لہذا میں ہی ہاتھ روک لوں۔ اگر محبت اور ہمدردی ہوتی تو اپنے بھائیوں کو ضرور تباہی سے بچایا جاتا۔

ایک شخص بولے کہ جب سب باتیں منع ہیں تو پھر دل کا حوصلہ کیسے نکالیں اور خوشی کس طرح منائیں۔ میں نے کہا مجھے دو پانچ ہزار روپیہ میں غریبوں کو تقسیم کردوں۔ ایک ہزار آدمیوں کو پہونچ جاویں ایک ایک کو پانچ پانچ روپیہ، وہ تمہیں دعائیں دیں نام بھی ہو دل بھی خوش ہو۔ مگر حضرت ان باتوں میں وہ مزہ کہاں بس سن کر مرجھا گئے۔ کیونکہ اس میں حظ نفس تو نہ ہوا۔ چہل پہل، دھوم دھام، صوفیوں کا سا مزا کوئی گر رہے کوئی پڑے کوئی غل مچا رہا ہے۔ ایک ہنگامہ برپا ہے۔ بھلا وہاں یہ رونق کہاں۔ اللہ بھلا کرے تاشے ڈھول کا یہ رونق تو انہی سے ہوتی ہے اور نفس خوش رونق ہی سے ہوتا ہے۔

اب فرمایئے اب آگے کیا گنجائش ہے کچھ کہنے کی۔ اب تو ختم ہو گئی حجت۔ اب تو ثابت ہو گیا کہ کسی کے لئے بھی اجازت نہیں۔ بس تو اب فقط ایک چیز رہ گئی تقریب نکاح کے اندر یعنی ایجاب و قبول بلکہ اگر کسی کی ہمت ہو تو اس میں بھی اختصار ممکن ہے وہ اس طرح کہ دولھا بھی مجلس نکاح میں نہ ہو وہ کسی کو اپنا وکیل کر دے نکاح کے لئے کیونکہ یہ فرض نہیں ہے کہ دولھا خود موجود ہو جب ہی نکاح ہو سکے۔ مثلاً کوئی نوکر ہے اس کو رخصت ہی نہیں ملتی یا ملنے میں وقت ہے یا مل بھی سکتی ہے مگر کیوں لیں فرض کیجئے کسی کا جی ہی نہیں چاہتا تو بس کسی کو اپنا وکیل کر دے کہ وہ اس کی طرف سے قبول کر لے (ہنس کر فرمایا) مگر یہ سمجھا دیا جائے کہ کہیں وہ اپنے واسطے نہ قبول کر لے، یوں کہہ دیا جائے کہ میری طرف سے قبول کر لینا چونکہ وکیل بجائے مؤکل کے ہوتا ہے اس لئے نکاح صحیح ہو جائے گا۔ دیکھا آپ نے کس قدر سہولت ہے وہ نوکری پر موجود اور یہاں نکاح ہو گیا۔ چنانچہ مواہب لدنیہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نکاح کی یہی صورت مروی ہے کہ جس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

سے ان کا نکاح ہوا وہ خود موجود نہ تھے۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ میں نے فاطمہ کا نکاح علیؓ سے کردیا۔ اِنْ رَضِیَ عَلِیٌّ بِذٰلِکَ یعنی اگر علیؓ منظور کریں اس کو۔ حضرت علیؓ کو جب خبر پہنچی تب انھوں نے کہا کہ میں نے منظور کیا۔ یوں ہوا تھا نکاح حضرت علیؓ کا تو دیکھ لیا آپنے کہ یوں بھی نکاح ہوسکتا ہے۔ برات تو برات دولھا کے ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ غور کرلے کی بات ہے اے عقلا کہ جتنی حاجات ہیں انسان کی کچھ نہ کچھ خرچ کی ضرورت سب میں ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ دو آنہ مثلاً آدمی کسی کام کو کہیں جاوے تو کھانا تو ضرور ہی کھائیگا۔ اس میں کم از کم دو آنہ تو خرچ ہوں ہی گے، اسے بھی جانے دیجیئے۔ پانی سب سے سستی چیز ہے حتیٰ کہ بکتا بھی نہیں مگر اس میں بھی خرچ ہوتا ہے۔ خود پانی کی کوئی قیمت نہ سہی مگر لانے والے کو تو اجرت دینا ہی پڑتی ہے ۲/ مہینہ ۸/ ۲/ ۴/ کچھ تو لگتا ہی ہے۔ بہت ہی کم ہوا تو ایک پیسہ تو ضرور ہی پانی کا بھی خرچ پڑجاتا ہوگا۔ تو کچھ نہ کچھ قیمت پانی جیسی سستی چیز کی بھی ہوئی غرض ہر چیز میں کچھ نہ کچھ خرچ کی ضرورت ہے بجز نکاح کے کہ یہ اپنی حقیقت میں ایک پیسہ پر بھی موقوف نہیں۔ کیونکہ اس کی حقیقت ایجاب ہے اور قبول اور یہ محض دو بول ہیں زبان کے۔ ان میں کسی خرچ کی کیا ضرورت، رہے چھوارے سو وہ محض مستحب ہیں۔ نہ ہوں نہ سہی کچھ بھی حرج نہیں اور مہر اُدھار ہے اس وقت اس کا کوئی تقاضا نہیں اور ادھار بھی جب ہے جب دو اور جو دینا لینا ہے ہی نہیں جیسا کہ آجکل عام طور سے سمجھا جاتا ہے تب تو ان کے زعم میں ادھار بھی نہیں چنانچہ بعض وقت صاف کہتے ہیں کہ مہر تو محض ایک دباؤ کے لئے ہے۔ دینا لینا تھوڑا ہی ہے۔ کون لیتا ہے اور کون دیتا ہے (حالانکہ یہ غلط ہے مہر دَین ہے جیسے اور دَین ہوتے ہیں) خیر کم سے کم مہر ادھار تو ہے ہی اس وقت اس کا مطالبہ نہیں تو نفسِ نکاح میں تو یہ خرچ شامل نہ ہوا۔ اب فرمایئے سب سے زیادہ سستی چیز اگر کوئی تھی تو نکاح تھا۔ مگر اللہ بھلا کرے ہمارے بھائیوں کا سب نے آپس میں کمیٹی کرکے اس کو ایسا مہنگا کردیا ہے کہ غریب آدمی کی تو مصیبت ہے اور اس میں مزاحمت ہے عقل کی بھی۔ اور مزاحمت ہے شریعت کی بھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

(دیر پنک کمل کراچی)

بھلا یہ کونسی عقل کہہ سکتی ہے کہ جس چیز میں مطلق روپیہ کی ضرورت نہ ہو اس میں فضول اس قدر روپیہ صرف کر ڈالو ادھر شریعت کہتی ہے اَعْظَمُ النِّکَاحِ بَرَکَۃً اَیْسَرُہٗ مُؤْنَۃً یعنی حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ نکاح سب سے زیادہ برکت والا ہے جس میں سب سے کم خرچ ہو یہ ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں نکاح کے متعلق سارے خرچ آگئے حتیٰ کہ مہر کی کمی بھی جس کی خصوصیت کے ساتھ بھی فضیلت وارد ہے آجکل مہر کی زیادتی کو بھی بڑا فخر سمجھا جاتا ہے۔ میری بھتیجی کے نکاح میں پانچہزار کا مہر باندھا گیا ایک رئیس تھے سندھ کے وہ بھی نکاح میں شریک تھے میرے یہاں آئے ہوئے تھے انھوں نے سن کر بڑا تعجب کیا کہ اجی پانچ ہزار اس قدر زیادہ انھیں اتنے ہی پر تعجب ہوا حالانکہ ہمارے پاس ایک قصبہ ہے جلال آباد وہاں تو سوا سوا لاکھ روپیہ کا مہر باندھا جاتا ہے اس میں تو پانچ ہزار سستا ہی ہے مگر ان کے یہاں کے مقابلہ میں یہ بھی بہت مہنگا تھا کہنے لگے اجی ہمارے یہاں تو ایک بکری یا ایک گائے یا سات آٹھ روپیہ بہت سے بہت دس روپیہ بڑے بڑے رئیسوں کا یہی مہر ہوتا ہے۔ لیجئے ان کے یہاں مہر بس اتنا ہی ہے واقعی صاحب مہر تو بس کم ہی اچھا اور خاص کر جب دینا لینا ہی نہیں تو پھر زیادہ مقدار سے فائدہ ہی کیا اگر شان ہے تو دینے میں ہے محض نام لینے میں کیا شان اور اگر نام ہی لینے میں شان ہے تو پھر لاکھ ہی کے اوپر کیوں رہو ہفت اقلیم کا نام لے دیا کرو بلکہ دنیا و مافیہا بلکہ آخرت و مافیہا بلکہ عرش اور کرسی اور جنت سب ہی کا نام کیوں نہ لے دیا کرو جب دینا لینا ہی نہیں تو پھر کیوں کسر رکھے۔ چنانچہ ایک جگہ مہر عجیب طرح کا سننے میں آیا دس مٹکے مچھروں کے دس مٹکے پسوؤں کے۔ لاحول ولا قوت یہ کیا خرافات ہے مطلب یہ کہ ساری عمر کے لئے مرد پر بار رہے اور دے ہی نہ سکے۔ اور ایک مقام پر سوا سیر کودوں کا مہر ہوتا ہے اس کو سن کر میں بڑا خوش ہوا کہ بہت ہی سستا مہر ہے مگر اس کی تفسیر کی گئی کہ سستا نہیں ہے سوا سیر کودوں سے مراد سوا سیر کودوں کا ناج نہیں ہے بلکہ اتنے روپے جتنے

سوا سیر کودوں میں دانے ہوں۔ بھلا کیا ٹھکانا ہے سوا سیر کودوں میں لاکھوں ہی دانے ہوتے ہوں گے جن کا گننا بھی مشکل ہے تو سوا سیر کودوں کے یہ معنی ہوئے کہ لاکھوں روپیہ اب آپ ہی فرمایئے یہ کیا ہے محض رسوم قبیحہ۔ اجی مہر نہ اتنا کم ہی ہو کہ لڑکی کی تحقیر ہو نہ وسعت سے زیادہ ہو کہ دیا ہی نہ جا سکے۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیوی کا مہر گیارہ سو بھی تھا حساب سے صرف تین چار روپیہ کم ہوتے ہیں گیارہ سو سے اگر بہت ہی بڑا فخر کرنا ہے تو گیارہ سو کا مہر باندھ دو مگر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ گیارہ سو کا مہر زیادہ تھا کیونکہ ایک بادشاہ تھے حبشہ کے حضرت بخاشی یہ نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انھوں نے کیا تھا اور یہ مہر بھی انھوں نے اپنے ہی ذمہ رکھا تھا تو دیکھئے ایک بادشاہ نے اپنے ذمہ صرف گیارہ سو روپیے رکھے تو یہ بھی کوئی بڑی رقم نہ ہوئی بادشاہ کے یہاں گیارہ لاکھ تو ہوتے اگر ایسا ہی شوق ہے زیادہ مہر باندھنے کا تو خیر یہ مقدار گیارہ سو کی بھی موجود ہے مگر اتنا تو نہ بڑھاؤ کہ دیا ہی نہ جا سکے رہی شان سو شان کو رہنے دو۔ کیا نعوذ باللہ ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہماری شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ ہے استغفر اللہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر مہر کی زیادتی کوئی عزت کی بات ہوتی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مستحق تھے اس عزت کے۔ واقعی بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عزت والا ہو سکتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقط دینی عزت ہی میں سب سے بڑھے ہوئے نہ تھے بلکہ دنیوی عزت میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور صرف مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ غیر مسلم قوموں میں اور ظاہری ساز و سامان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بعض دفعہ ایسا ہوا ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوا چنانچہ حج میں ایک دفعہ سو اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیلے قربانی کیے ہم نے تو کسی بادشاہ کو بھی نہیں سنا کہ اکیلے سو اونٹ کی قربانی کی ہو ۶۳ اونٹ تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ذبح فرمائے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے ہیں تو ایک چڑیا کا بھی ذبح کرنا مشکل ہوتا ہے نہ کہ ۶۳ اونٹ اور ذبح کرنا بھی چھری پھیر کر نہیں بلکہ بھالہ سے اس زمانہ میں عرب کے اندر یہی رسم تھی کہ بھالا گلے میں مارا جاتا تھا اس کو نحر کہتے ہیں اونٹ اسی طرح ذبح کیا جاتا تھا خیال کیجئے کہ بھالا کس قوت سے لگتا ہو گا ۶۳ اونٹوں کا اس طرح ذبح کرنا سہل بات نہیں ہے ۶۳ کو خود ذبح فرمایا بقیہ کو ذبح کرنے کے لئے حضرت

علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمادیا۔ پورے ۱۰۰ اونٹ کی قربانی فرمائی۔ اس کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا۔ روایت میں ہے کہ اُن اونٹوں کی یہ حالت تھی کہ کُلُّهُنَّ يَزْدَلِفْنَ اِلَيْهِ جب وہ اونٹ ذبح کئے جانے کے لئے ایک قطار میں کھڑے کئے گئے کہ ہر اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھک جھک کر بڑھتا تھا کہ پہلے مجھے ذبح کریں ہائے اس موقع پر مجھے وہ شعر یاد آتا ہے ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف　　بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد (دوبار)

(تمام جنگل کے ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا اس امید میں کہ کسی دن تو شکار کو آئے گا)

یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محبوبیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ جانور بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا تھے اور اپنا ذبح ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے چاہتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ جانور بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے بلکہ جانور کیا سب مخلوق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتی تھی صحیح روایت میں ہے اِنِّی لَاَعْرِفُ حَجَرًا كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ یعنی فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک پتھر کو پہچانتا ہوں جو مجھکو سلام کیا کرتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ پتھر بھی آپ کو پہچانتے تھے پھر تعجب ہے کہ انسان نہ پہچانے بالخصوص جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور یہ پہچاننا نہیں ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ زبان سے کہہ لیا پہچاننا کہتے ہیں۔ کسی کے حق پہچاننے کو۔ سو سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تین حق ہیں ایک حق ہے محبت ایک حق ہے عظمت تیسرا حق ہے متابعت۔ اب لوگوں نے کیا کیا ہے کہ تجزیہ کیا ہے ان حقوق میں بعضوں نے تو محض محبت لے لی عظمت اور متابعت کو نذر انداز کر دیا بعضوں نے محض ظاہری عظمت کو کافی سمجھا محبت اور متابعت سے کوئی سروکار نہ رکھا بعضوں نے محض متابعت پر قناعت کر لی محبت اور عظمت کی تحصیل کے درپے نہ ہوئے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں حقوق کا ادا کرنا یکساں طور پر ضروری ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حق کا ادا کرنا واجب ہے محبت کا بھی عظمت کا بھی اور متابعت یعنی اتباع کا بھی چنانچہ ارشاد ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ یعنی اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ سے میرا اتباع کرو معلوم ہوا کہ محبت کے ساتھ اتباع بھی ضروری ہے اور سچ تو یہ ہے محبت تو وہی ہے جس کے ساتھ اتباع بھی ہو ورنہ محبت بلا

اتباع تو وہی محبت ہے کہ گھر بار سب تمہارا مگر کوٹھی کٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا اور یہ تعلق بلا اتباع تو وہی تعلق ہے کہ

؎ گر جان طلبی مضائقہ نیست ورزر طلبی سخن درین است

(اگر جان مانگو مضائقہ نہیں اور مال مانگو اس میں کلام ہے)

نہ نماز نہ روزہ نہ زکوٰۃ نہ حج نہ زکوٰۃ کچھ بھی نہیں اور دم بھرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اے صاحب خوب سمجھ لیجئے محبت وہی معتبر ہے جس کا اثر دونوں طرف پورا پورا ہو ہم کو ایسی محبت کا ایک طرف سے بھی پوری نہیں بس ہم کو ایسی محبت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسی کسی طالب علم کی حکایت ہے کہ کسی شہزادی کو کہیں اتفاق سے آپ نے دیکھ لیا تھا بس عاشق ہو گئے یہاں تک حوصلہ بڑھا کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے کی فکریں کرنے لگیں۔ ایک روز اسی سوچ میں بیٹھے تھے کہ ایک دوست ملنے آئے پوچھا کس حال میں ہو کہا شہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہوں کہا سبحان اللہ آپ کی یہ تو حیثیت اور شہزادی سے نکاح کرنے کی فکریں طالب علم نے کہا کہ میاں آدھا سامان تو ہو بھی چکا صرف آدھا سامان ہونا اور باقی ہے۔ دوست کو بڑا تعجب ہوا تو پوچھا آخر کیونکر کہا نکاح کے لئے دولہا اور دلہن دونوں کی رضامندی شرط ہے سو میں تو بالکل راضی ہوں بس اس کے راضی ہونے کی دیر ہے آدھا سامان تو ہو گیا آدھا باقی ہے اگر اسے آدھا سامان کہہ سکتے ہیں تو واقعی اس محبت یکطرفہ میں آپ کے پاس بھی آدھا سامان موجود ہے آپ بھی خوش رہیے۔ غرض یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت۔ محبت وہ ہے جس میں دوسری طرف سے بھی محبت ہو اور وہ موقوف ہے متابعت پر جب یہ نہیں تو وہ محبت ہی نہیں۔ ایک ہندی شاعر جو ہیں تو رند آدمی مگر فارسی کلام ان کا صوفیانہ ہے لیکن کلام صوفیانہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ صوفی تھے بلکہ بات یہ ہے کہ شاعر ہوتے ہیں دو قسم کے ایک تو بعضے روکھے ہوتے ہیں ان کا کلام پھیکا پھیکا ہوتا ہے اور بعضے ہوتے ہیں صاحب دردائیوں کے کلام میں تصوف کی چاشنی ہوتی ہے حالانکہ دراصل تصوف سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اسی قسم کے وہ شاعر تھے چونکہ وہ صاحب درد تھے اس لئے ان کے کلام میں تصوف کا رنگ ہوتا تھا۔ ایک شخص نے ان کا کلام دیکھا تو سراسر تصوف اور معرفت میں ڈوبا ہوا پایا بس ان کی بزرگی کے معتقد ہو گئے سمجھے کہ یہ شخص کوئی زبردست صوفی اور اولیاء اللہ میں سے معلوم ہوتا ہے یہاں تک اعتقاد بڑھا کہ ان کی زیارت کے لئے ایران سے سفر کر کے آئے جب ان کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ بیٹھے حجام سے ڈاڑھی کی صفائی کرا رہے ہیں۔ اب یہ حیرت میں۔ آخر نہ رہا گیا آغا ریش مے تراشی (آغا ڈاڑھی درشواتے ہو) آپ بولے بلے ریش می تراشم دلے دل کسے نمے خراشم (ہاں میں ڈاڑھی ترشواتا ہوں کسی کا دل نہیں دکھاتا) کسی سے صوفیوں کا

مقولہ سن لیا ہوگا کہ سارے گناہ کرو مگر کسی کا دل مت دکھاؤ۔ مگر انھوں نے بھی اس کا خوب ہی جواب دیا کہا آرے دل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مے تراشی (یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو رنجیدہ کرتے ہو تم اپنی اس حرکت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے سارے اعمال پیش کئے جاتے ہیں جب تمہارے اعمال پیش ہوتے ہوں گے تو تمھاری اس حرکت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر دل دکھتا ہوگا۔ یہ سنتے ہی بس آنکھیں کھل گئیں صاحب درد تو تھے ہی ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور جوش میں

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا باجان ہمراز کردی (کل شعر دو بار)

خدا تمھیں خوش رکھے کتنے دن تک میں دھوکہ ہی میں رہا آج غلطی معلوم ہوئی ہے توبہ ہے جو اب کبھی ایسا کروں وہ اس گمان میں تھا کہ ان چیزوں کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت سے کیا علاقہ اس محقق کی تنبیہ سے معلوم ہوا کہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں ؎

تَعْصِی الْاِلٰهَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ هٰذَا الْعُمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ

(ترجمہ) تو نافرمانی کرتا ہے حق تعالیٰ کی اور دعوی کرتا ہے ان کی محبت کا یہ عجیب بات ہے ؎

لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

(ترجمہ) اگر تیری محبت سچی ہوتی تو اطاعت بھی کرتا کیونکہ عاشق معشوق کا مطیع ہوا کرتا ہے وہ کیا عاشق ہے جو معشوق کی نافرمانی کرے وہاں تو جان سے بھی مال سے بھی ہر طرح سے اطاعت کے لئے حاضر ہے اور یہاں محبت کے لئے اطاعت کی بھی ضرورت نہ سمجھی جائے یہ مضمون مجھے اس پر یاد آگیا تھا کہ كُلُّهُنَّ يَزْدَلِفْنَ اِلَيْهِ (ان میں ہر ایک آپ کی طرف جھکتا تھا) جانوروں کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی ہر اونٹ یہی چاہتا تھا کہ پہلے مجکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذبح کریں اصل ذکر یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیلے ... اونٹ قربانی کئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر بھی بادشاہ تھے اور بادشاہ بھی ایسے کہ کسی بادشاہ کی بھی عزت اتنی نہ تھی جتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی چنانچہ ہرقل[۵] شاہ روم اپنے تخت شاہی پر بیٹھا ہوا کہتا ہے (صحیح بخاری میں یہ روایت ہے) کہ اگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں دھوتا اللہ اکبر ایک بزرگ کے بارے میں جو ٹوٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھنے والے ہیں یہ الفاظ بادشاہ کے منہ سے کس قدر عظمت کی دلیل ہیں پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ الفاظ محض عظمت اور وقعت ہی کی وجہ سے کہے گئے ہیں نہ یہ کہ کسی مجبوری سے دیکھئے ایک زبردست خود مختار بادشاہ ہرقل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر فاصلہ پر بیٹھا ہوا

[۵] ہرقل روم کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا۔

اپنے ارکان دولت کے سامنے اتنے صریح لفظوں میں ایک ایسی بات کہہ رہا ہے جو بظاہر اس کی شان کو اس کی رعایا کی نظروں میں بہت ہی گھٹانے والی ہے اگر عزت اس کا سبب نہیں تھی تو اور کیا چیز تھی اگر یہ عزت نہیں تو پھر اور عزت کسے کہتے ہیں کیا عزت نام ہے کپڑوں کا اگر کپڑوں میں عزت ہے تو وہ ایسی عزت ہے جیسے علی حزین شاعر سے ملنے ایک شخص بڑے ٹھاٹھ سے آیا کپڑے بہت بڑھیا بڑھیا پہنے ہوئے کھڑ کھڑ بھڑ بھڑ بولتے ہوئے۔ علی حزین پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا ان حضرت کو اس شان سے آتا ہوا دیکھ کر پاؤں سمیٹ لئے اور بہت عزت کیساتھ بٹھایا حالانکہ یہ بڑا دماغدار شخص تھا پوچھا اسم شریف یوسف نام تھا آپ فرماتے ہیں۔ ایسُف علی حزین نے یہ سنتے ہی سامنے کو پاؤں پھیلا دیئے اور کہا یا اگر تو ایسف ہستی پس چرا من پائے خود دراز کشم (اگر تو ایسف ہے تو میں پھر پاؤں سمیٹوں) بس ساری عزت میاں کی اتنی ہی دیر میں خاک میں مل گئی غرض کپڑوں کی عزت بس اتنی ہی دیر کی ہوتی ہے جہاں حقیقت کھلی بس پھر کچھ بھی نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت ایسی عزت نہ تھی حقیقی عزت تھی ویسے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت بیحد سادہ تھی لباس بالکل معمولی ہوتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی اور حقیقی عزت حاصل تھی دنیا کے بادشاہوں کی سی زبردستی کی عزت نہ تھی اور محض دینی عزت نہیں بلکہ دنیوی عزت بھی بدرجہ کمال حاصل تھی اب اس سے زیادہ کیا دنیوی عزت ہوگی کہ ایک بادشاہ یوں کہتا ہے کہ اگر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ پاتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں دھوتا اور اس کو اپنا فخر سمجھتا تو غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیوی اور دینی ہر قسم کی عزت حاصل تھی پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ازواج و بنات کے مہر تھوڑے ہی تھوڑے مقرر فرمائے جس سے معلوم ہوا کہ مہر کا زیادہ ہونا کوئی عزت کی بات نہیں اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اگر مہر کا بڑا ہونا کوئی عزت کی بات ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سے زیادہ مستحق تھے اس عزت کے۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ مہر تھوڑا ہی کافی ہے اور بہتر ہے اب بتلایئے نکاح میں خرچ ہی کونسا رہ گیا ایک مہر تھا سو وہ بھی ادھار نقد تو ایک پیسہ کا بھی خرچ نہیں آپ نے دیکھا نکاح ایسی سستی تو چیز مگر ہمارے بھائیوں نے مل جل کر اس کو اس قدر گراں کر دیا ہے کہ الٰہی توبہ بعض بعض قوموں میں تو عورت پر روپیہ بھی دینا پڑتا ہے اب خیال فرمایئے کہ یہ سب مزاحمت ہے عقل کی اور نقل کی یا نہیں غرض ان رسوم کی کسی پہلو سے بھی اجازت نہیں نکلتی ہاں یوں کہئے کہ صورت معصیت کی نہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے حکم تو حقیقت پر ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شریعت نے ان سے تعرض بھی کیا ہے پس اگر اب

بھی وہی خیال ہو کر ان باتوں میں ہمکو آزادی ہے اعتقاداً یا عملاً تو کہا جائے گا اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی یعنی کیا خیال کرتا ہے انسان کہ اس کو مہمل چھوڑ دیا جائیگا مطلب یہ ہے کہ خیال غلط ہے مہمل نہیں چھوڑا جائیگا بلکہ اس کے ہر ہر فعل کی ہر ہر قول کی اور ہر ہر حال کی نگرانی ہو گی۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں چونکہ وقت کم تھا اس لئے میں بیان کر چکا اب میں صرف چار پانچ منٹ لینا چاہتا ہوں اس مجمع میں کچھ اہل علم بھی ہیں اس لئے ایک طالبعلمانہ مضمون میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں اصل مقصود تو بیان ہو چکا یہ ایک زائد بحث ہے اگر سب کی سمجھ میں نہ آوے تو کچھ حرج نہیں وہ بحث یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہٗ فرماتے ہیں اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اس کو مہمل چھوڑ دیا جائیگا) یہاں صرف انسان کو خطاب کیا حالانکہ یہ ثابت ہے کہ جن وانس دونوں جزا وسزا پائیں گے اور جزا وسزا دونوں کو جب ہی ہو سکتی ہے جب دونوں مکلف ہوں جب دونوں مکلف ہیں تو اس خطاب میں انسان کی تخصیص کیوں کی گئی اَیحسب الانسان ان یترک سدی ہاں جنوں کے ثواب کے متعلق البتہ اختلاف ہے چنانچہ امام صاحب کا قول مشہور اور کتب میں منقول ہے کہ وہ جنت میں نہ جائیں گے ان کی جزا یہی ہو گی کہ عذاب سے نجات ہو جائیگی یہ امام صاحبؒ کا مشہور مذہب ہے باقی جمہور کا مذہب یہ ہے کہ مؤمنین جن بھی جنت میں جائیں گے دلیل امام صاحبؒ کی یہ مشہور ہے یٰقومنا اجیبوا داعی اللہ وامنوا بہ یغفر لکم من ذنوبکم ویجرکم من عذاب الیم اس آیت میں جنوں کا قول حق تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے کہ جنوں نے آپس میں کہا تھا کہ کہنا مان لو خدا تعالیٰ کے داعی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خدا تعالیٰ تمہارے گناہ بخشدیگا اور تم کو عذاب الیم سے نجات دیگا یہاں عذاب سے نجات دینے کا وعدہ ہے یہ وعدہ نہیں ہے کہ جنت میں بھی داخل کریگا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ سکوت معرض بیان میں بیان ہوتا ہے یہاں جزا کا بیان ہے اگر جزا کچھ اور ہوتی تو اس کا بھی بیان ہوتا اور بیان ہے نہیں تو اور کچھ جزا ابھی نہیں تو جزا حصر یہ ہوئی کہ ان کو دوزخ سے نجات ہو جاوے گی یہ ہے امام صاحبؒ کا قول۔ جمہور کی دلیل یہ آیتیں ہیں فبای الاء ربکما تکذبان جنت کی نعمتیں یاد دلا کر فرماتے ہیں کس کس نعمت کو تم دونوں جھٹلاؤ گے اے جن وانس اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نعمتیں دونوں کے ملے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تصریح اس آیت میں ہے لم یطمثھن انس قبلھم ولا جان یہ آیت حوروں کے بارہ میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حوریں جن وانس دونوں کے لئے ہوں گی اور حوریں جنت کے

اندر رہیں تو جنت میں جانا جنوں کا ثابت ہوا اور ہر مجتہد ٹھہرے مجتہد کے استدلال کا جواب دے سکتا ہے اور احقر کا گمان یہ ہے کہ امام صاحب کا مقصود نفی نہیں دخول جنت کی مؤمنین جن کے لئے بلکہ یہ مقصود ہے کہ ہم بوجہ نص صریح نہ ہونے کے ایسا حکم نہیں کر سکتے اور غالباً اطفال کے باب میں بھی امام صاحب کا یہی قول ہے واللہ اعلم لیکن ظاہراً جمہور کا قول زیادہ جی کو لگتا ہے اور اس کے اختیار کرنے سے ترک تقلید کا کسی کو شبہ نہ ہو کیونکہ یہ کوئی مسئلہ فقہ کا نہیں ہے جس میں امام صاحب کے قول کی تقلید واجب ہو یہ مسئلہ معاد کا ہے اور اس سے زیادہ اسلم یہ ہے کہ خدا کے سپرد کیا جائے خدا جانے کیا ہوگا جو ہوگا ہو رہے گا بہر حال اس کا فیصلہ ہمارے اجلاس میں نہ آویگا ہم کو کاوش کی ضرورت نہیں باقی جنوں کے مکلف ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں اور وہ ان آیتوں سے ثابت ہے سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَا الثَّقَلَانِ (اے جن وانس ہم عنقریب (حساب و کتاب کیلئے خالی ہوئے جاتے ہیں یعنی حساب کتاب لینے والے ہیں) جن وانس دونوں کو ثقل فرمایا ثقل کے معنی ہیں جس پر ثقل یعنی بوجھ ہو بوجھ سے مراد وہی بار تکلیف ہے معلوم ہوا دونوں مکلف ہیں اور دوسری آیت میں فرماتے ہیں يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ قیامت میں جواب طلب کیا جائیگا کہ اے جن وانس کیا تمھارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مکلف ہیں پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیت میں یعنی أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى (کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اسکو مہمل چھوڑ دیا جائیگا) میں صرف انسان کا ذکر کیا گیا اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ قرآن کی تبلیغ اول انسانوں ہی کو ہوئی پھر ثانیاً جنوں کو۔ ایک تو یہ جواب ہے سیدھا سادہ۔ دوسرے یہ کہ ہر چند کہ مکلف انسان اور جن دونوں ہی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی عنایت حق تعالیٰ کی انسان پر ہے اتنی جن پر نہیں ہے جن دوسرے درجہ میں ہیں لہذا مخاطب ہونا بھی ان کا تبعاً للانسان ہے اور فضائل میں بھی وہ تابع ہیں انسان کے چنانچہ جو لوگ قائل ہوئے ہیں اس بات کے کہ جن جنت میں جائیں گے وہ بھی کہتے ہیں کہ جنت کے گردو پیش میں رہیں گے جیسے تابع لوگ ہوا کرتے ہیں بہر حال وہ تابع ہیں اس بنا پر خطاب میں ان کو شریک نہیں کیا گیا لیکن اثر خطاب میں وہ داخل ہیں کیونکہ تابع متبوع کے اثر خطاب میں داخل ہوا کرتا ہے اور تابع ہونے کے دلیل یہ آیت ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (ہم نے بنی آدم کو مکرم کیا) صوفیہ کرام سمجھے ہیں اس کے راز کو کہ انسان مکرم کیوں ہے وہ راز یہ ہے کہ انسان مظہر اتم ہے حق تعالیٰ کا اسی واسطے آیا ہے إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ اس کے لفظی معنی تو ہیں کہ حق تعالیٰ

نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا لیکن یہ مسلم ہے کہ صورت کے معنی متبادر مراد نہیں کیونکہ اس سے تجسم لازم آتا ہے حق تعالیٰ کا سلا محالہ دوسرے معنی مراد ہوں گے جس کی حقیقت یہ ہے کہ صورت کے معنی ظہور ہیں چنانچہ صورت متعارفہ کو جو صورت کہتے ہیں وہ بھی اس بناء پر کہ وہ ظہور ہے حقیقت ذی صورت کو پس معنی یہ ہوئے کہ ایسی حالت پر پیدا کیا کہ خدا تعالیٰ کا اس حالت سے ظہور ہوا تو علیٰ صُوْرَتِہٖ کے معنی ہوئے علیٰ ظہورہٖ یہی معنی ہیں صوفیہ کے اس قول کے الانسان مظہر اتم ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ کا مطلب یہ کہ حق سبحانہ تعالیٰ کا ظہور پورا پورا انسان کے ذریعہ سے ہوا۔ اس ظہور سے مراد وہی ظہور ہے جو کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (میں مخفی خزانہ تھا پس پسند کیا میں نے کہ پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا) میں ہے کیونکہ اُعْرَفَ کے معنی کا حاصل یہی ہے اظہر ہوں تو حق تعالیٰ کی مظہر ہر چیز ہے لیکن انسان خصوصیت کے ساتھ مظہر ہے اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ انسان مظہر اتم ہے ایک تو یہ وجہ ہے انسان کے سب سے زیادہ مکرم ہونے کی دوسری ایک وجہ کا پتہ وہاں سے چلتا ہے جہاں مکلف فرمانے کے قصہ کو بیان فرمایا ہے وہ یہ آیت ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (ہم نے امانت کو آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا سب نے انکار کیا اور ڈر گئے اس کے اٹھانے سے اور اس کو انسان نے اٹھا لیا) سب جانتے ہیں کہ مکلف جن وانس دونوں ہیں مگر یہاں ذکر صرف انسان کا ہے کہ اسی نے ہماری امانت کو اٹھایا یہاں امانت سے مراد تکلیف شرعی ہے یعنی احکام کی تعمیل تو گویا کہا یوں گیا تھا کہ کون اختیار کرتا ہے اس تکلیف احکام کو اس شرط پر کہ جو اطاعت کریگا شاب ہوگا جو اطاعت نہ کریگا معذب ہوگا اس کو سن کر سب ڈر گئے نہ آسمان کو ہمت ہوئی نہ زمین کو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شعور سب کے اندر ہے چنانچہ اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زمین آسمان نے سُنا اور سمجھا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب و خاک و باد و آتش و بندہ اند   با من وتو مردہ باحق زندہ اند

(آب وخاک ہوا اور آگ بندہ ہیں ہمارے سامنے مردہ حق تعالیٰ کے سامنے مردہ ہیں)

ہمارے تمہارے سامنے یہ سب چیزیں مردہ اور بے جان معلوم ہوتی ہیں لیکن خدا کے سامنے یہ سب زندہ ہیں چنانچہ بعضے حکماء یونانیین بھی قائل ہیں کہ بعض جمادات میں شعور ہے اور نئے حکماء بھی کہتے ہیں کہ درختوں

میں روح ہے مگر خفتہ ہے۔ سبحان اللہ عقلا کو بھی وہی ماننا پڑا جو شریعت سے ثابت ہے تو اگر جمادات وغیرہ میں بھی حس و شعور مان لیا جائے جیسا کہ بہت سے اہل کشف سے ثابت ہے تو کیا حرج ہے اور ظاہر قرآن مجید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم جو اپنے نزدیک حسّاً شعور ہیں اور یہ سب چیزیں ہمارے نزدیک بے شعور ہیں حقیقت میں یہ بھی ذی شعور ہوں لیکن ہمارا شعور اُن کے شعور کے متعلق نہ ہوا ہو۔ غرض فرماتے ہیں کہ ہم نے آسمانوں پر اور زمینوں پر اور پہاڑوں پر امانت کو پیش کیا کہ اس کو کون اٹھاتا ہے سب نے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے مگر حضرت انسان فوراً بول اٹھے کہ ہم ہیں اس کو اٹھانے والے کچھ دیکھا نہ بھالا بس بے تامل لیکر کھڑے ہو گئے اس کو۔ ہمت تو دیکھئے آپ کی۔ اور وجہ کیا ہے اس ہمت کی۔ اسکو صوفیہ نے بیان کیا ہے۔ قرآن مجید اس سے ساکت ہے اگر کوئی مسکوت عنہ فی القرآن کا صوفیہ کے ارشاد سے قائل ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

(امانت کے بوجھ کو آسمان نہ اٹھا سکا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام مارا)

اس میں اشارہ ہے اس وجہ کی طرف یعنی دیوانہ کے لفظ میں کہ اس کے اندر دیوانگی تھی دوسروں میں یہ چیز نہ تھی۔ شرح اسکی یہ ہے کہ انسان میں شان عشق غالب تھی اوروں میں یہ مادہ اس درجہ کا نہ تھا گو یا سب میں شعور تھا انسان ہی میں بے شعوری تھی یعنی عشق (یہ لطیفہ ہے) اس عشق سے ان حضرت کو لذت ہوئی خطاب میں تو اس سے اندازہ کیا کہ جب ایک خطاب میں یہ لذت ہے تو اگر مکلف ہونے کو مان لیں گے تو بار بار خطاب ہوا کریگا اور خوب لطف آئیگا اور بڑا مزہ ہوگا چاہے دوزخ میں بھی جلنا پڑے لیکن اس لذت کو کیوں چھوڑا بس آؤ دیکھا نہ تاؤ عشق کے جوش میں اس امانت کو اٹھا ہی تو لیا اس کو فرماتے ہیں وحملها الانسان (اٹھالیا اس کو انسان نے) اس میں اشارہ ہے انسان کے عاشق ہونے کی طرف بھی کہ کہ اس نے پہچان لیا اس دولت کو جو اس تکلیف کے اندر پنہاں تھی۔

اب یہاں مسلّم ہے یہ بات کہ اس امانت کو جن و انس دونوں نے اٹھایا کیونکہ دونوں مکلف ہیں تو یوں ہونا چاہئے تھا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ وَالْجِنُّ (انسان اور جنوں نے اسکو اٹھالیا) لیکن صرف انسان کو ذکر فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مکلفیت کی صفت میں اصل ہے اور جن تابع ہے تو اصل کو ذکر کیا اور تابع کو چھوڑ دیا اور جب اس صفت میں اصل ہونیکی وجہ سے اسی کا نام لیا تو اس حمل کے حقوق کے

اخلال پر جو اس آیت میں اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًى (کیا انسان کا یہ خیال ہے کہ اسکو مہمل چھوڑ دیا) نکیر کیا ہے اس میں بھی اسی کا خاص بیان کیا، سبحان اللہ۔ یہ تبرعاً بیان کر دیا اس میں اصل مضمون کا پھر اعادہ کرتا ہوں یہ دیکھتا ہے کہ شریعت نے ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے آیا ہم کو ہر ہر امر میں پابند کیا ہے یا آزاد چھوڑ دیا ہے اور ہمارے افعال کو ہماری رائے پر رکھا ہے سمجھ لیجئے کہ یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہے کہ شریعت نے ہمارے افعال سے تعارض نہیں کیا شریعت نے ہر ہر چیز سے تعرض کیا ہے لیجئے قرآن مجید میں ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا یعنی کسی کے گھر میں نہ جاؤ جب تک کہ اُن سے میل نہ کر لو اور ان کو سلام نہ کر لو۔ یہ معاشرت کے احکام ہیں اور یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ یعنی اے مسلمانو جب تم سے کسی مجلس میں کہا جائے جگہ دو تو جگہ دیدو مطلب یہ کہ دب کر بیٹھ جاؤ اور جب کہا جاوے یہاں سے اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ یہ امر ہے اور اس پر وعدہ ہے یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ یہ مجلس کے آداب ہیں علیٰ ہذا عادات کے متعلق بہت سی آیتیں ہیں منجملہ ان کے یہ ہے لَیْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُیُوْتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِیْقِكُمْ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ۔ یعنی اندھے پر تنگی نہیں لنگڑے پر تنگی نہیں مریض پر تنگی نہیں نہ تمہارے اوپر تنگی ہے اس بات میں کہ اپنے گھر کھاؤ یا اپنے باپ کے گھر یا ماں کے گھر اور عزیزوں کے گھر جو آیت میں مذکور ہیں یعنی اپنے بھائیوں کے گھر یا اپنی بہنوں کے گھر یا اپنے چچاؤں کے گھر یا اپنی پھوپیوں کے گھر یا اپنے ماموؤں کے گھر یا اپنی خالاؤں کے گھر یا ان گھروں سے جنکی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوست کے گھر اور اکٹھے ہو کر کھاؤ یا الگ الگ۔ یہ آیت عادات کے متعلق ہوئی۔ اور یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ یعنی اے مسلمانو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دولت خانہ میں مت جاؤ الا آنکہ تم کو اجازت دی جائے کھانا کھانے کی غرض سے مگر اس میں بھی یہ شرط ہے کہ کھانے کے پکنے کے انتظار میں پہلے سے جا کر نہ بیٹھو بس یہ چاہیئے کہ جب بلایا جائے جاؤ اور جب کھانا کھا چکو چلے آؤ اور نہ وہاں بیٹھ کر باتیں بگھارو۔ یہ دعوت میں جانے کا قانون ہے۔ غرض ہر کام کا قانون موجود ہے

عادات کے متعلق اور لیجیے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی کھاؤ پیو اور فضول خرچ مت کرو اس کا بھی قانون ہے اور لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ یعنی نہ مردوں کی جماعت دوسرے مردوں کی جماعت سے مسخراپن کریں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے مسخراپن کریں اور نہ آپس میں طعنے دو نہ کسی کو برے نام سے پکارو۔ وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو آپ نے دیکھا یہ سلسلے عادات اور معاشرت ہی تو ہیں تو دیکھ لیجیے ہر چیز کا مکمل قانون موجود ہے۔ غرض کھانا پینا اوٹھنا بیٹھنا بولنا چالنا کھانا کمانا غرض ہر ہر بات سے تعرض کیا معاملات کو لیجیے۔ لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ یعنی آپس میں ایک دوسرے کا مال بیجا طریق پر نہ کھاؤ مطلب ہے کہ حلال طریق پر حاصل کرکے کھاؤ ناجائز طریق سے کسی کا مال مت لو وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا یعنی جائز کیا حق تعالیٰ نے بیع کو اور حرام کیا سود کو یہ معاملات ہی تو ہیں جن کے متعلق احکام ہیں تو دیکھ لیجیے ان آیتوں میں عادات کے متعلق بھی قانون ہے معاشرت کے متعلق بھی قانون ہے معاملات کے متعلق بھی قانون ہے، غرض یہ ہے کہ تمام آیتیں بھری پڑی ہیں دنیوی عادات اور معاشرات وغیرہ کی تعلیم سے سب کے لیے قانون مقرر ہے اب اس کے بعد کیا گنجائش ہے یہ کہنے کی کہ فلاں چیز سے کیا تعلق ہے شریعت کو فلاں چیز کے متعلق کوئی قانون نہیں شریعت میں اسکو ہماری رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے جب یہ ہے تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سب چیز کا قانون ہو اور شادی بیاہ کا کوئی قانون ہی نہ ہو خوب سمجھ لیجیے کہ شادی بیاہ کا بھی شریعت میں قانون ہے جس کو میں بہ تفصیل بیان کرچکا ہوں۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ فہم سلیم اور عمل کی ہمت اور توفیق عطا فرماویں۔ الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ سید الکائنات واشرف المخلوقات صلوٰۃ تسبق الغایات۔

بعض تحریرات ارکان تقریب جس میں یہ وعظ ہوا

خط خانصاحب خواجہ عزیز الرحمن صاحب گورنر لوچھ کشمیر رخصتی والد نوشہ، حبیب الرحمن سلمہ بنام جناب مولوی حکیم محمد مصطفےٰ صاحب دام مجدہم از لکھنؤ ڈورالی گلی نزد بیل فرنگی محل ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء

مخدومی ومطاعی جناب حکیم صاحب زاد لطفکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ میں تہ دل سے آپ کی اس تکلیف کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپ نے براہ الطاف کریمانہ سفر کوٹاہ ملقب بہ فیض کالوٹا اور وعظ نقد اللبیب فی

عقد الحبیب کی ترتیب و تکمیل میں اٹھائی اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ اب یہ دونوں رسالہ جات خدا کرے جلد طبع ہو جاویں تو ان سے امید کامل ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اصلاحِ رسوم شادی میں کافی طور سے ہو جاویگی حضرت اقدس مولانا صاحب مدظلہم العالی کا ایک ایک لفظ پُر معنی ہے اور بڑے تجربہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے چونکہ میرے لڑکے حبیب الرحمن سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی ہی کے موقع پر وعظ نقد اللبیب ہوا تھا اس لئے میں نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اب یہ رائے قائم کی ہے کہ حقیقتاً شادی کے موقع پر ہجوم احباب برادری مرد و عورت کا کرنا بیحد تکلیف دہ ہے اور بجائے جاہ و عزت کے ذلت و پریشانی ہوتی ہے۔ میرے یہاں شادی کے موقع پر کوئی رسم ایسی نہیں ہوئی جیسے کہ اور جگہوں پر ایسے موقع پر ہوا کرتی ہیں صرف خاص خاص اہل برادری و اعزہ مرد و عورت کو اطلاع دی گئی تھی اس پر بھی بڑا ہجوم ہو گیا اور چار پانچ دن تک مہمانداری رہی جس میں صرف کھانے کے انتظامات میں وہ وہ پریشانیاں اٹھانی پڑی ہیں کہ میرا دل ہی جانتا ہے میں نے تو اپنے خیال میں کوئی رسم ادا نہیں کی مگر صرف دعوت ولیمہ اور اہل برادری کے جمع کرنے ہی میں مجھے تجربہ ہو گیا کہ حضرت اقدس مدظلہم العالی کا ایک ایک لفظ وعظ بالکل صحیح ہے اور ہرگز ہرگز کبھی اس اہتمام کے ساتھ شادی نہیں ہونا چاہیئے جو کچھ میں نے تخمینہ شادی کے اخراجات کا کیا تھا اس سے چار چند خرچ ہو گیا اور اکثر اعزہ کو شکایت ہی رہی کہ انکی خاطر و تواضع نہیں کی گئی کھانا پکنے کیلئے ہوشیار سے ہوشیار رکابداروں کا انتظام کیا گیا لیکن اسپر بھی زردہ والا معاملہ آپکو یاد ہو گا کہ نہ معلوم کس طرح سے اس میں مٹی کے تیل کی ناقابل برداشت بدبو ہو گئی تھی جسکی وجہ سے عین کھانے کیوقت جسقدر ذلت وسبکی میری ہوئی ہے میرا ہی دل جانتا ہے اسقدر کثیر تعداد کے چاول و گھی و میوہ جات کا بوجہ مٹی کے تیل کی بدبو ہو جانیکے بھنگیوں و چماروں کو بٹوا دینا دل کو بڑا شاق ہوا بلکہ اس سے بھنگیوں اور چماروں میں بھی بدنامی ہوئی کہ گورنر صاحب کشمیر کے لڑکے کی شادی میں ایسا زردہ پکا۔ حالانکہ حتی الامکان بڑی احتیاط برتی گئی تھی خاص خاص معتمد اعزہ کے سپرد انتظام کھانیکا تھا مگر وہ بیچارے کیا کریں جبکہ ان کے قابو سے باہر بات ہو۔ میرا تو ہزارہا روپیہ خرچ ہو گیا اور ذلت و خواری ان کے عوض میں نصیب ہوئی مجھے بڑا زعم اپنی انتظامی قابلیت پر تھا اسکا یہ نتیجہ ذلت و خواری ہوا میں نے تو اسی وقت سے عہد مصمم کر لیا کہ آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ کسی بچہ کی تقریب اس طرح سے نہ کرونگا بلکہ حضرت اقدس مدظلہم العالی کے مواعظ جو اصلاح الرسوم کی بابت جس قدر چھپے ہیں انکو خوب غور سے پڑھ کر ان پر عمل کرونگا اور کبھی شادی کے موقع پر بھی اجتماع اہل برادری وغیرہ بھی نہ کرونگا اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ مجھے اسکی توفیق عنایت فرما دیں میں سچے دل سے اپنی اس غلطی کا اعتراف کرتا ہوں جو اس موقع پر مجھ سے ہوئی۔ حالانکہ میرے بھائی عزیزم حاجی خواجہ عزیز الحسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت اصرار کے ساتھ اس تقریب پر اجتماع اہل برادری سے منع کیا تھا مگر میں نے یہ سمجھا کہ کوئی رسم خلاف

شرع شریف تو میں کروں گا نہیں صرف احباب کو اور خاص خاص اہلِ برادری کو دعوت ولیمہ دونگا مگر یہ نہ معلوم تھا کہ یہی وبال جان ہو جاویگا علاوہ میری اس ذلت و خواری کے منتظمین کی اکثر نماز وقت پر نہ ہوئیں جماعت تو نصیب ہی نہ ہوئی اور بڑا قلق اس کا ہے کہ حضرت والا مدظلہم العالی کے وعظ کے وقت اکثر منتظمین شرکت نہ کر سکے پردہ کا اگرچہ بہترین انتظام کیا گیا تھا مگر میں نے خود دیکھا کہ خود میری ہی نظر اکثر غیر محرم مستورات پر پڑ گئی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ ایسے موقع پر پردہ کا انتظام کما حقہٗ کرنا نا ممکن ہے۔ بہت سے برتن بہت سے میرے کشمیری نمدے اور لوٹیاں جو بڑی قیمتی تھے گم ہو گئے جن کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ غرضکہ شادی سے فراغت پا کر میں نے جو غور کیا تو میرے گھر میں دلہن تو آئی مگر مجھے ذلت و نقصان بہت برداشت کرنا پڑا۔ کاش میں اپنے بھائی عزیز حاجی خواجہ عزیز الحسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے کہنے پر عمل کرتا تو دلہن آتی مگر یہ ذلت اور نقصان برداشت نہ کرنا پڑتا اور جو روپیہ کثیر میں نے صرف کر دیا وہ بچتا اور اس سے لڑکوں کی تعلیم میں سہولت مجھے ہوتی جس کی مجھے دقت اس وقت محسوس ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اس عریضہ کو پورا یا اس کا خلاصہ وعظ النقد اللبیب فی عقد الحبیب کا جزو کرا دیا جاوے تاکہ جو صاحب پڑھیں وہ میرے اس واقعی تجربہ پر بھروسہ کر کے آئندہ ایسی رسومات دعوت وغیرہ اجتماع اہل برادری وغیرہ سے احتراز کریں اور نقصان کثیر ذلت و خواری سے بچیں۔ ایسا ہی تلخ تجربہ میرے بھانجے اعجاز علی صاحب سلمہٗ ڈپٹی کلکٹر کو ہوا۔ امید ہے کہ جناب بخیر و عافیت ہونگے اور میرے لئے دعائے خیر کرتے رہیں گے کہ اللہ تعالیٰ توفیق اعمال صالحہ عطا فرماویں اور خاتمہ بخیر کرے۔ میں ابھی تک رخصت پر ہوں ۱۲؍ ستمبر ۲۳ء تک میری رخصت ہے بچیوں کو دعائیں۔ دعاگو خادم عزیز الرحمٰن عفی عنہٗ۔

تصدیق جناب سید اعجاز علی صاحب بی اے ایم بی ای ایم آر اے ایس ڈپٹی کلکٹر بدایوں والد نوشہ کاظم علی سلمہٗ تحریر بالا را

مجھے اپنے ماموں صاحب خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب کی تحریر سے بالکل اتفاق ہے میں نے بھی اسی زمانہ میں یعنی گذشتہ بڑے دن کی تعطیل میں اپنے بڑے لڑکے کاظم علی سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی کی تھی میرے چھوٹے ماموں حاجی خواجہ عزیز الحسن صاحب کے مشورہ کے مطابق میرا ارادہ تھا کہ بدایوں ہی میں (یعنی جائے ملازمت پر) عقد ہو جاوے اور کسی قسم کا خاص اہتمام اجتماع وغیرہ نہ کیا جاوے۔ مگر میری والدہ صاحبہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئیں اور مجبوراً مجھے اپنے وطن قصبہ نذیبئی میں ہی جا کر شادی کرنی پڑی حالانکہ میرا سارا کنبہ میرے پاس بدایوں میں تھا۔ صرف اس تقریب کے ادا کرنے کے لئے وطن مع کل کنبہ و سامان کے محض ہفتہ عشرہ کے لئے جانا پڑا، گو بوجہ تشریف آوری حضرت مولانا صاحب مدظلہم خلاف شرع کوئی رسوم نہیں کی گئیں اور بہت اہتمام سے مستورات کی ہر امر میں روک ٹوک کرنی پڑی تاہم بیحد تکالیف اور کثیر مصارف برداشت کرنے پڑے۔ زیادتی اسباب کی وجہ سے ایک اسٹیشن پر میں خود ریل سے رہ گیا اور دسمبر کی شدید

سردی میں شب بھر بغیر بستر کے گذارنی پڑی اور ہمراہیوں کے پریشانی میں رہجانے سے علیحدہ ہوئی۔ یہاں تک ایک مخلص عزیز چلتی ہوئی ریل سے کود پڑنے کیلئے آمادہ ہوگئے ان کو بڑی مشکل سے روکا گیا۔ غرض سفر میں بوجہ کثرت ہمراہیان و کثرت اسباب ہر موقع پر ایک مصیبت کا سامنا تھا باوجود سخت کوشش کے انتظامات تقریب میں حسب معمول بڑی گڑبڑ رہی اور اعزا اور احباب سب کو بیحد تکلیف ہوئی اور کسی کے اطمینان کیساتھ ملاقات بھی نہوسکی اجتماع مستورات میں تجربہ سے ثابت ہوا کہ بہت بے پردگی ہوتی ہے۔ اس تقریب میں نہ صرف میرا ہی کثیر روپیہ صرف ہوا بلکہ جملہ اعزہ و اہل برادری کو بھی اپنے متعلقین کو پر تکلف کپڑے بنانے میں بیحد خرچ کرنا پڑا بعض تو یقیناً مقروض ہوگئے بیوقت کھانے اور سونے کی وجہ سے خود نوشہ کو شادی کے دوسرے ہی دن تپ اور دست ہوگئے اور ایسی حالت خراب ہوگئی کہ لینے کے دینے پڑگئے جسکی وجہ سے فوراً مجھے وطن چھوڑ کر بدایوں بغرض علاج آنا پڑا گو کوئی لاکھ انکار کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ دھوم کی شادی زیادہ تر تفاخر یا بدنامی سے بچنے کے لئے کیجاتی ہے مگر میں نے تو کبھی یہ نہیں سنا کہ شادی کے بعد کسی کی تعریف ہوئی ہو بلکہ ہمیشہ اسکے خلاف ہی سنا واقعی کسی نے بالکل سچ کہا ہے۔ نہ کردن یک عیب و کردن صد عیب (نہ کرنا ایک عیب اور کرنا سو عیب ہیں) کیا ہی اچھا ہو اگر مسلمانوں میں یہ رواج ہوجاوے کہ بجائے ہزار ہا روپیہ ایسے موقعوں پر فضول صرف کرنیکے خود دولہا دلہن کیلئے کافی سرمایہ دیدیا جایا کرے تاکہ وہ انکے کام بھی آوے۔ ایسا بیجا صرف نہ صرف شریعت کے بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے اس دفعہ کے ذاتی تجربہ کے بعد میں نے تو مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ آئندہ بچوں کی شادی نہایت سادگی کے ساتھ بالکل شرع شریف کے مطابق کرونگا اور ہرگز خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق نہ بنونگا۔ پڑھے لکھے لوگ جتنے اس موقعہ پر موجود تھے سب پر یہی اثر تھا اور سب نے بالاتفاق یہ طے کرلیا تھا کہ آئندہ ہرگز اس قسم کی تقریبات اس طریقہ سے نہ کیجاویں اس اثر کی وجہ سے زیادہ تر حضرت مولانا صاحب دام فیضہ کی تشریف آوری و برکت تھی۔ حضرت اقدس مولانا صاحب دام فیوضہ کے وعظ سے مسلمانوں کو بیحد فائدہ ہوگا اگر وہ اس کی پابندی کریں۔

اعجاز علی، بی اے ایم بی ای ایم آر اے ایس ڈپٹی کلکٹر بدایوں ۱۵ر جولائی ۱۹۲۳ء

تصدیق جناب سید صاحب علی صاحب انسپکٹر آب کاری سندیلہ ضلع ہردوئی تحریر را۔

مجھے اپنے ماموں خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب قبلہ و بڑے بھائی سید اعجاز علی صاحب قبلہ کی رائے سے پورا اتفاق ہے واقعی تقریبات کے مواقع پر ایسا اجتماع کرنا جس کے باعث اوقات میں فرق آئے اور جس کا انتظام بھی قابو سے باہر ہو محض تکلفات و تصنعات پر مبنی ہے اور بجز تکلیف و نقصان کے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا چونکہ میں بھی اپنے برادر زادہ سید کاظم علی سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی کی تقریب کے موقع پر موجود تھا اور میرے سپرد بھی کھانے کا انتظام کیا گیا تھا

اس لئے مجھے بھی ذاتی تجربہ ہے کہ ایسے کثیر مجمع کی تقریب کے موقع پر نہ تو کھانا وقت پر ملتا ہے نہ سونا وقت پر ہوتا ہے اور نہ نماز وقت پر ہوتی ہے اور جماعت کیساتھ نماز ملنا تو بہت ہی مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے چنانچہ مجھے خود اسکا تلخ تجربہ ہوا ہے یعنی ۲۹ر دسمبر ۲۲ء یوم جمعہ کو جبکہ حضرت مولانا صاحب قبلہ دام فیوضہم کا وعظ بعد نماز جمعہ ہو رہا تھا اور مجھے عین اسی وقت وعظ چھوڑ کر اپنے فرض منصبی یعنی کھانے کے انتظام کی وجہ سے وہاں سے ہٹنا پڑا جو نہایت شاق گذرا لیکن محض بدنامی کے ڈر سے ایسا کرنے پر مجبور ہوا اور پھر ایسا گرفتار ہوا کہ دوبارہ مسجد نہ جا سکا اور نہ وعظ سن سکا جس کا آجتک قلق ہے لہذا میری رائے ناقص میں ایسا اجتماع کرنا اور اس میں شرکت کرنا نہ صرف خلاف شریعت ہے بلکہ خلاف عقل بھی ہے اور اسی واسطے میں نے عہد کر لیا ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ نہ تو میں آئندہ ایسے مجمعوں میں حتی المقدور شرکت کرونگا اور نہ خود اپنے بچوں کی تقریبات میں ایسے اجتماع کرونگا بلکہ نہایت سادہ طور پر عقد شرعی کردونگا اللہ تعالیٰ ایسے عمل کی مجھے و نیز جملہ برادران اسلام کو توفیق دے۔ احقر رضا علی صاحب انسپکٹر آبکاری معینہ سندیلہ ضلع ہردوئی۔ المرقوم ۲۰ر جولائی ۲۳ء مطابق ۶ر ذالحجہ ۱۳۴۱ھ

تصدیق جناب سید مبارک حسین صاحب انسپکٹر آبکاری حلقہ اول ایٹہ تحریر بالا۔ ۲۵ر جولائی ۱۹۲۳ء

مخدومی و مکرمی جناب مولانا صاحب قبلہ السلام علیکم۔ آپ کا گرامی نامہ پہونچا جس میں دیگر گرامی نامہ جات عالیجناب بھائی صاحب سید اعجاز علی صاحب قبلہ و جناب قبلہ ماموں خواجہ عزیز الرحمن صاحب قبلہ ملفوف تھے میں نے تینوں خطوط کو بغور پڑھا پڑھکر پچھلی شادیوں میں جو تکالیف برداشت کی تھیں تازہ ہوگئیں مختصراً اپنے دلی خیالات کا اظہار کرتا ہوں و بزرگان مندرجہ بالا کے خیالات سے بالکل متفق ہوں مجھے اپنی لڑکی کی شادی کی فکر ایک عرصہ سے تھی اور مجھ پر فرض تھی جب میں سوچتا تھا کہ شادی کیوقت بہت سی تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں۔ بے شمار اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں اور طرح طرح کی بیشمار مذموم رسومات ادا کی جاتی ہیں میں پریشان ہوتا تھا اور اپنی زندگی میں اس قدر سادہ فرض کو ایک بڑی مہم سمجھتا تھا غرضکہ اسی طرح شش و پنج میں چند سال گذرے خدا خدا کر کے میرے لئے وہ پہلا مشکل اور مبارک وقت آیا کہ تعطیل یوم کلاں دسمبر ۲۲ء میں میری لڑکی کی شادی ہونا قرار پاگئی۔ مشکل وقت بوجہ وجوہ مندرجہ بالا اور مبارک وقت اس لئے کہ میری اکلوتی بیٹی کا جو مجھے بیحد عزیز ہے عقد ہوا جس وقت تعین تاریخ کی اطلاع مجھے ملی میرے دو خیال پیدا ہوئے ایک تو یہ کہ شکر ہے کہ میں اب اپنے فرض سے سبکدوش ہونگا دوسرا یہ کہ خدائے پاک میری آبرو رکھلے۔ آبروریزی کا اندیشہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھا کہ بھائی صاحب قبلہ جدید رشتہ سے میرے سمدھی ایک ڈپٹی کلکٹر تھے چنانچہ یہ اندیشہ صحیح نکلا کیونکہ اگرچہ بھائی صاحب قبلہ روشن خیال ہیں لیکن دیگر پرانے خیال کے اعزا اور بزرگوں نے اس امر کا اظہار کیا کہ تمھارا مقابلہ ایک بہت بڑے آدمی سے ہوا ہے وہ صاحب جاہ، ذی حشمت صاحب وقار اور ایک اعلیٰ حاکم ہیں (خدا نہ

پاک ان کی روز افزوں ترقی فرمائے) ان سب باتوں کا خیال رکھتے ہوئے مجھے شادی کی تیاریاں کرنی چاہئیں میں بیحد مایوس ہوا اور پریشان تھا خدایا میری آبرو رکھنا قصہ مختصر یہ کہ ان خیالات سے میں مجبور ہوگیا اور اپنی مقدرت سے زیادہ تیاریوں میں دو ہفتے پیشتر سے مشغول ہوگیا اس دوران میں مجھے متعدد سفر بلکہ کرنا پڑے شب و روز پریشان رہا۔ تاریخ معینہ پر عالیجناب مولانا اشرف علی صاحب قبلہ مدظلہ نے میری لڑکی کا عقد پڑھایا عقد کے دوسرے دن میرا عزیز بھتیجا اور جدید رشتہ سے میرا قابل فخر داماد عزیزی سید کاظم علی سلمہ سخت بیمار ہوگیا جس کا حوالہ عالیجناب بھائی صاحب قبلہ مدظلہ نے اپنے گرامی نامہ میں فرمایا ہے۔ صاحب ممدوح اپنے ہونہار سعادتمند تعلیمیافتہ بیٹے کو اس طرح سخت علیل دیکھ کر پریشان تھے اور بیحد اضطراب تھا میں اپنے عزیز داماد کو دیکھ کر بدحواس تھا۔ ایک نوشہ کا یکایک بستر علالت پر دیکھنا ایک ایسا دردناک واقعہ ہے جو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ خدائے پاک اسکو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ بھائی صاحب قبلہ کو موسم سرما کے شدید ترین وقت میں شب کو ریل چھوٹ جانے سے اسٹیشن پر بوجہ نہ ہونے حفاظتی سامان پوشش کے جو تکلیف ہوئی قابل بیان نہیں مجھے فخر ہے کہ میری عزیز لڑکی خوش نصیب ہے کہ اس کو ایک لائق شوہر ملا خدائے پاک میرے ان دونوں بچوں کو زندگی دے مجھے یہ فخر اس وقت بھی حاصل ہو سکتا تھا کہ میری لڑکی کا عقد قطعی شرعی ہوتا اور دیگر مذموم مراسم سے مبرا ہوتا اور بلا وجہ زیر باری سے بچ جاتا۔ مجھے اس خرچ کا قطعی قلق نہیں ہے بلکہ خوشی ہے جو میں نے لڑکی پر جہیز وغیرہ میں کیا۔ البتہ مجھے ملال ہے دعوت اور دیگر بہت سی ایسی مدوں کا جن کا تفصیل وار لکھنا محال ہے اور ان پر مجھے خرچ کرنا پڑا اور مجھے اس سے تکلیف ہوئی مجھے دیگر مقامات میں متعدد مرتبہ مسلمانوں کی شادیوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ہاں مقابلۃً بہت سی لغو رسوم معدوم ہیں ایک موقع پر ایک لاکھ کا مہر باندھا گیا تھا اور یہ صاحب محرر چنگی تھے غرضکہ میں پہلے ہی خلاف تھا اور یہ شادی میرے لئے کافی سبق آموز ہوئی۔ آپ کی کوشش سے اور مولانا صاحب کی برکت سے پچھلی شادیوں میں بہت سی اصلاحیں ہوئیں ہیں اب آئندہ اپنی اولاد کا عقد شرعی کرونگا اور میں نے طے کر لیا ہے کہ میں آئندہ ایسی تقریبات میں ہرگز شرکت نہ کرونگا جہاں فضول خرچیاں ہوں اور جاہلانہ رسوم ادا کی جاویں۔ میں آپ کا اور عالیجناب مولانا صاحب قبلہ کا بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے یہ کار نیک اپنے ذمہ لیا ہے اس پر اگر کاربند ہوئے تو جملہ مسلمانان نہ صرف گناہوں ہی سے بچیں گے بلکہ بربادی اور زیر باری سے نجات پاویں گے خدائے پاک مسلمانوں پر رحم فرماوے اور آپ دونوں صاحبان کی کوشش بار آور ہو۔

آپ کا مبارک حسین انسپکٹر آبکاری حلقہ اول ایٹہ

مختصر کیفیت وعظ ہذا وقوعاً وغرضاً واثراً

یہ وعظ (النفد اللبیب) بتاریخ ۷ جمادی الاول ۱۳۴۳ھ روز منگل بعد ظہر ہوا یہ تمام سفر کوٹا کا گویا موضوع اصلی تھا اسکی طرف تمام مہمانان اور میزبانان اور زائرین سب کے کان لگے ہوئے تھے۔ یہ وعظ پولیس لائن کے میدان میں ہوا جہاں مہمانان کا قیام تھا یہ جگہ شہر کوٹاہ سے دو میل کے قریب فاصلہ پر ہے اہل شہر کو بھی اطلاع ہوگئی تھی چونکہ حضرت والا کا ورود اس جگہ پہلی ہی مرتبہ تھا اور شہر کے لوگ حضرت سے بالکل ناآشنا تھے اسلئے مجمع اہل شہر کا کچھ زیادہ نہوا اور ان میں سے بعض کے تیوروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ چنداں اشتیاق سے نہیں آئے اس مجمع کے خیالات معلوم کرنیکو یا محض دیکھا دیکھی چلے آئے ہیں بلکہ بعضوں کے چہروں سے رنگ مخالفت بھی ظاہر تھا آئے تو اس طرح تھے مگر وعظ کے ختم پر سب کی بلا مبالغہ یہ حالت ہوئی کہ

ع۔ ہم کو تو کہتے تھے اب تم ہی کلیجہ تھام لو۔ اور بقول حضرت مجذوب سلمہٗ

کب وہ دہیں گرا نہیں جس کو ذرا تکا نہیں — تیری نظر کا تیر بھی جس پہ پڑا اچٹا نہیں

ہنسنے کا تیرے ہمنشیں مانتا میں برا نہیں — ہوش ربا کے سامنے ہائے ابھی پڑا نہیں

یہ حالت تھی کہ کسی کی سیری نہ ہوتی تھی وعظ کے شروع ہونیکے وقت اُن کے چہروں پر اجنبیت کے آثار تھے اور ختم پر انھوں نے جو شہر میں وعظ ہونیکے لئے اصرار کیا اس سے عقیدت اور خلوص اور تڑپ کے آثار نمایاں تھے حضرت والا کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور خوشامد کرتے تھے مگر حضرت والا بعض شرائط نہ پورے ہونے کی وجہ سے عذر فرماتے تھے وعظ کا ضبط کرنا احقر محمد مصطفیٰ اور خواجہ عزیز الحسن صاحب کے سپرد ہوا تھا لیکن یہ معلوم ہوا کہ ایک مرزا صاحب انور بیگ نامی منجانب ریاست کوٹا مختصر نویسی کا باقاعدہ امتحان پاس کر کے آئے ہیں اور فی منٹ ۵۰ لفظ لکھ سکتے ہیں وہ بھی لکھنے بیٹھ گئے اور انھوں نے بہت شوق سے لکھا ہم لوگوں کو جس قدر اس کی خوشی تھی بیان سے باہر ہے جس اہتمام سے یہ وعظ لکھا گیا آجتک کوئی وعظ نہیں لکھا گیا اور الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ جیسا وعظ ہوا ویسی ہی اسکی تحریر بھی ہوئی امید تو یہ کیگئی تھی کہ یہ وعظ بالکل لفظاً بلفظ ہوگا تقریر و تحریر میں ایک لفظ کا بھی فرق نہوگا اور اسی کی کوشش کی گئی لیکن اس میں کامیاب ہونے میں کسی قدر موانع پیش آگئے وہ یہ کہ بعض الفاظ کا شارٹ اردو میں ہے ہی نہیں مثلاً متبع کا لفظ کہ مختصر نویس صاحب سے اپنا لکھا ہوا پڑھا ہی نہیں گیا دوسرے یہ کہ مختصر نویس صاحب کے مواجہ میں کل تبییض نہو سکی کیونکہ بہت جلد وہاں سے کوچ ہوگیا اور خود وہ بلا امداد ہم دونوں کے مسودوں کو صاف نہ کر سکے کیونکہ بہت سے عربی لفظ ایسے تھے جو انکی سمجھ میں نہ آئے تاہم یہ ضرور ہوا ایک ثلث بظن غالب لفظاً بلفظ صاف ہوا کیونکہ حضرت کا ایما ہوا کہ علیحدہ ایک خیمہ میں ہم تینوں بیٹھیں اور فوراً صاف کرنا شروع کر دیں اور کسی کام کیلئے سوائے ضروریات اور نماز کے وہاں سے نہ نکلیں چنانچہ ایسا ہی ہوا مختصر نویس صاحب کا اندازہ یہ تھا کہ اس طرح اہتمام سے لکھنے سے کل تک پورے وعظ کی تبییض ہو جاویگی لیکن یہ خیال ہی خیال نکلا اور تیسرے دن تک بھی صرف ایک تہائی کی تبییض ہو پائی کیونکہ ایک ایک لفظ کو اس وقت تحریر کیا جاتا تھا جبکہ

تینوں تحریروں کو غور سے ملالیا جاتا تھا۔ تیسرے دن کوٹا سے ندیٔ علاقہ بھرتپور کو کوچ ہوگیا نہ ہم لوگ کوٹا میں رہ سکتے تھے اور نہ مختصر نویس ہمارے ساتھ ندیٔ جاسکتے تھے۔ ندیٔ میں اسی کو غنیمت سمجھا گیا کہ احقر اور خواجہ عزیز الحسن صاحب دونوں ملکر تبییض کریں تین دن تک وہاں بھی اسیطرح ہوا کہ سوا وعظ کی تبییض کے کچھ کام نہ تھا لیکن باوجود اس اہتمام کے ان دونوں میں بھی ایک تہائی سے زیادہ صاف نہ ہوسکا اب ندیٔ سے بھی کوچ ہونے والا تھا اور احقر میں اور خواجہ صاحب میں بھی افتراق ہوا تو حضرت والا کی رائے یہ ہوئی کہ دونوں مسودے احقر کے ساتھ جاویں اور احقر دونوں مسودوں کی مدد سے صاف کرے بعد ازاں اس صاف شدہ کو معہ دونوں مسودوں کے خواجہ صاحب کے پاس بھیجدے وہ اس پر نظر ثانی فرمالیں اس کے بعد میں حسب معمول سب کو دیکھ لونگا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حاصل یہ کہ وعظ ایک ثلث کے قریب تینوں کاتبوں کے مواجہ میں لکھا گیا اور ایک تہائی کے قریب دو کاتبوں نے مل کر لکھا اور ایک ثلث احقر نے دونوں مسودوں کی مدد سے لکھا ظاہر ہے کہ جو بات تبییض میں تینوں کاتبوں کے ملکر لکھنے سے پیدا ہوئی تھی وہ دو کے ملکر لکھنے سے نہیں ہوئی اور جو بات دو کے ملکر لکھنے سے ہوئی تھی وہ فقط احقر کے لکھنے سے پیدا نہیں ہوئی لیکن تاہم بھی ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس میری تحریر میں کل الفاظ حسب منشا محفوظ نہ ہوں اکثر الفاظ ضرور محفوظ ہوگئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعض ہی الفاظ میں فرق رہ گیا ہوگا کیونکہ دونوں مسودوں کو سامنے رکھکر ایک ایک لفظ پر غور کرکے لکھا گیا اور جو کچھ اس میں کمی رہی وہ خواجہ صاحب کی نظر ثانی سے پوری ہوگئی اور حضرت واعظ صاحب مدظلہ کے نظر اصلاحی سے سب پر رجسٹری ہوگئی غرض میزبانان کوٹا کی نیک نیتی اور خلوص کی برکت ہے کہ یہ وعظ دیگر تمام مواعظ سے اس بات میں ممتاز ہے کہ ایک تہائی سے کچھ زیادہ روایت باللفظ ہے شاید کچھ ہی الفاظ بدلے گئے ہونگے اور باقیماندہ میں سے نصف جو شرکت احقر اور خواجہ صاحب کے لکھا گیا تھا اس کی نسبت بھی کہا جاسکتا ہے کہ قریب روایت باللفظ کے ہے کیونکہ خواجہ صاحب کو اس کا زیادہ اہتمام رہتا ہے کہ حتی الامکان الفاظ نہ بدلیں لیکن بلا مختصر نویسی کے اس میں حسب منشا کامیابی محال ہے تاہم دونوں مسودوں کو صاف کرنے سے بہت کم تغیر رہ گیا ہوگا اور کوئی مضمون چھوٹا یا بڑا ہرگز ترک نہیں ہوا۔ رہا باقیماندہ ایک ثلث جو صرف احقر نے دونوں مسودوں کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اسمیں بھی حتی الامکان یہی کوشش کیگئی کہ الفاظ محفوظ رہیں تاہم اجتماعی اور انفرادی تحریر میں فرق ہونا ضرور ہے لیکن اس فرق کو خواجہ صاحب کی نظر ثانی نے نکالدیا کیونکہ خواجہ صاحب نے بہت زیادہ غور اور اہتمام سے دونوں مسودوں کو سامنے رکھ کر بندہ کی تحریر کو درست کیا ہے اور اسی وجہ سے اس میں زیادہ عرصہ لگا غرض یہ ثلث آخیر بھی ثلث دوم کے حکم میں سمجھنا چاہیے۔ یہ اہتمام اس سے پہلے کسی وعظ کی تبییض میں نہیں ہوا اس وعظ کا اثر کا بیان سنئے کہ مضمون وعظ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے کسی فعل میں خود مختار نہیں ہے اور یہ خیال غلط ہے کہ شریعت نے رسوم کے متعلق آزادی دی ہے یا یہ کہ ان باتوں سے شریعت کو کیا تعلق یہ مضمون اس خوبی اور متانت اور تہذیب سے بیان ہوا کہ قلب بے ساختہ شہادت دیتا تھا کہ اس سے بہتر اس مضمون پر کوئی تقریر نہیں کرسکتا حتی کہ انسپکٹر جنرل صاحب جو مذہباً ہندو تھے کہنے لگے کہ ہم نے تو خلاصہ اس کا یہ سمجھا ہے کہ مولانا صاحب نے ریفارم اسکیم کو مذہب کے پیرایہ میں ثابت کیا ہے اور یہ سب سے بہتر اور مؤثر طریقہ ہے اور ان

لوگوں کے دلوں پر بھی حضرت واعظ صاحب مدظلہ کی تقریر کا سکہ جم گیا۔ جو شہر کوٹا سے اجنبیانہ آئے تھے اور مجمع کے وہ اشخاص جو رسوم کے ممانعت میں طرح طرح کے اشکال کیا کرتے تھے مقر تھے کہ اب کوئی اشکال نہیں رہا حتیٰ کہ خواجہ عزیز الرحمٰن صاحب بار باران کو چھیڑتے کہ اب بولو اگر کوئی اشکال باقی ہو تو حضرت کے پاس چلو اور وہ خاموش رہجاتے اس وعظ نے موافق و مخالف سب کو ایک خیال بنالیا مجمع کی جو کیفیت بیان کے وقت تھی وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی جو لوگ صرف تماشائی بن کر آئے تھے بعد وعظ کے سب نے بالاتفاق اصرار کیا کہ شہر میں بھی وعظ ضرور ہونا چاہئے اور جب ان کو معلوم ہوا کہ شہر میں وعظ نہیں ہوگا تو اُن کے چہروں پر ایسی حسرت و یاس برستی تھی جیسے ان کے کوئی قیمتی چیز فوت ہوگئی ہے۔ قاضی صاحب اور تمام شہر والوں نے بار بار عرض کیا کہ شہر میں بھی وعظ ضرور ہونا چاہیے فرمایا میں نے کچھ شرائط پیش کی تھیں لیکن ان کے متعلق مجھے اطمینان نہیں ہوا اس واسطے میں معذور ہوں۔ زندگی باقی ہے تو پھر کبھی سہی۔ پھر بھی اصرار کیا گیا تو فرمایا یوں کیجئے کہ آئندہ کسی موقع پر حکام کے ذریعہ سے اختلاف وغیرہ کے انسداد کا انتظام کرکے بلالیجئے میں حاضر ہوں اور یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ مجھ سے حق گوئی ترک نہیں ہوسکتی میری عادت چھیڑ چھاڑ کی تو ہے نہیں جیسا کہ آپ نے اس وعظ کو سن کر اندازہ کرلیا ہوگا اپنے وعظ میں میں نے اختلافی مسائل تک سے تعرض نہیں کیا لیکن اگر کوئی بات زبان پر آجائے تو رد کتا بھی نہیں میں اس شرط کو بھی ملحوظ رکھئے اور بلالیجئے بشرط موقع و فرصت انکار نہ کروں گا اس وقت ان لوگوں کی حسرت و یاس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔

یہ وعظ اس قابل ہے کہ جب کہیں شادی بیاہ میں رسوم کے متعلق بیان کی ضرورت ہو اس کو سنادیا جاوے۔ حضرات میزبانان میں سے کئی صاحبوں نے عہد کیا کہ ہم آئندہ جب کوئی تقریب کریں گے تو بالکل موافق شرع شریف اور حضرت کے فرمودہ کے مطابق کریں گے چنانچہ کئی صاحبوں کی تحریریں وعظ کے آخر میں درج ہیں۔

تمہید ختم ہوئی۔ ناظرین اس وعظ کو بار بار مطالعہ کریں اور دعا کریں کہ حق تعالیٰ حضرت واعظ صاحب کو بایں فیوض و برکات دائم و قائم رکھیں اور حضرات میزبانان کو ؓ کو اور کاتبین کو وعظ کو اور جس جس کو اس سے تعلق ہو اپنی محبت اور توفیق خیر اور سعادت دارین نصیب فرمادیں۔ آمین

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ

مسمّٰی بہ

دَوَاءُ الضِّیق

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان عفی عنہ

مکتبۂ تھانوی ــــــ دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کراچی

دواء الضیق

أین	متٰی	کم	کیف	لِمَ	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر	سبب وعظ	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کیلئے زیادہ مفید تھا۔	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تخمیناً	متفرقات
کانپور میں برمکان حاجی محمد سعید صاحب	۱۲ محرم ۱۳۳۲ھ یکشنبہ	۳ گھنٹہ ۴۵ منٹ	بیٹھ کر	ایک بیوہ لڑکی کی فرمائش پر جسپر کئی طرح کے صدمات تھے۔			مولوی عبدالحلیم صاحب لکھنوی	مجموعہ ذکور و اناث ۲۰۰	

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝ قال اللہ تعالٰی وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگدل ہوتے ہیں سو اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے رب کی تسبیح اور تحمید کرتے رہیئے اور نماز پڑھنے والوں میں سے رہیئے اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیئے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے)

یہ ایک مختصر سی آیت ہے سورہ حجر کی اخیر کی اس میں حق تعالےٰ نے ایک حالت ناگوار کا علاج بتلایا ہے کہ جس کی ضرورت کم وبیش سب کو ہی واقع ہوتی ہے اسی واسطے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ جی ہمیشہ یہ چاہا کرتا ہے کہ ضروری مضمون جس کا وقوع بکثرت ہو بیان کیا

جایا کرے چنانچہ ان حالات میں سے ایک خاص حالت ہے جو سب حالتوں سے کسی قدر زیادہ پیش آتی ہے اس کا چونکہ اس آیت میں علاج بتلایا گیا ہے اس لئے اس آیت کو اختیار کیا گیا تاکہ لوگ اپنے اس مرض کی دوا معلوم کر کے اس کا ازالہ کرلیں اور اپنی حالتوں کو درست بنالیں اور وہ حالت ضیق یعنی تنگی کی حالت ہے اور اس کا پیش آنا سب پر ظاہر ہے جس کا سبب خلاف طبیعت امور کا پیش آنا ہے یعنی جو خواہش یا جو مذاق جس کا ہے ہر واقعہ اس کے موافق نہیں ہوتا کثرت سے واقعات خلاف طبیعت پیش آتے ہیں اور ہر شخص کو ایسے امور پیش آتے ہیں کیونکہ انسان بہت سے تقاضوں میں گھرا ہوا ہے کہ ان سے باہر نہیں ہوسکتا چنانچہ انسان کا طبعی تقاضا ہے کہ میں ہمیشہ خوش رہوں ہمیشہ تندرست رہوں مگر اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوتی غم میں بھی مبتلا ہوتا ہے مرض بھی لاحق ہوتا ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ سب مجھ سے موافقت کریں مگر بہت سے مخالفت بھی کرتے ہیں وہ یہ چاہتا ہے کہ کثرت سے مال ہو مگر بعض اوقات بقدر حاجت بھی نہیں ہوتا اور جن کے پاس ہوتا بھی ہے تو ہوس آگے ہوتی ہے کہ اور ہو بہرحال گو خالص حالت یا خاص سبب سب میں مشترک نہ ہو مگر یہ امر سب میں مشترک ہے کہ خلاف مزاج امور پیش آتے ہیں مثلاً انسان کب یہ چاہتا ہے کہ عزیز کم ہو جاویں مگر کم ہو جاتے ہیں۔ ایسے امور کی حق تعالیٰ نے ایک مختصر فہرست ارشاد فرمائی فرماتے ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ الآیۃ۔ ترجمہ یہ ہے کہ ہم ضرور امتحان کریں گے خوف سے مثلاً حاکم مخالف کا اندیشہ دشمن کا دباؤ وغیرہ وغیرہ اور بھوک سے فقر و فاقہ سے جو نادار ہیں ان کو تو بھوک لگا ہی کرتی ہے فاقہ کی نوبت آتی ہی ہے مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو بھوک کا اثر نہ ہو جو بڑے بڑے مالدار صاحب ریاست ہیں ان کو بھی یہ نعمت میسر ہو جاتی ہے مثلاً سفر میں ہوں اور کھانا ختم ہو جائے اور ملے نہیں اور کسی خشک مزاج کو یہ شبہ نہ ہو کہ آج کل تو سفر میں کھانے کی تکلیف ہو ہی نہیں سکتی

ہر مقام پر مکان سے زیادہ اسباب راحت موجود ہیں کیونکہ یہاں وہ حالت سفر کی مراد ہے کہ جس میں کھانا میسر نہ آئے عام اس سے کہ ریل کا سفر ہو یا جنگل اور حضرت ریل تو کیا خدائے کارساز کی وہ قدرت ہے کہ امراء نے گھر بیٹھے بھوک سے بے تاب ہو کر جان بحق تسلیم کی ہے کسی متمول کی حکایت ہے، ایک شخص نے اخبار سے نقل کی تھی کہ اس کے تہ خانہ میں جو کہ اندر ہی اندر دور و دراز تک چلا گیا تھا سونے کے ستون پڑے تھے ہر ہفتہ کو وہ ان کے معائنہ کو جاتا تھا ایک مرتبہ حسب معمول گیا اور گھوڑا قریب ہی باندھ کر اندر گیا کسی وجہ سے گھوڑا بدکا اور تڑا پھڑا کر بھاگ گیا جب خزانچی آیا اور گھوڑے کو نہ پایا تو یہ سمجھ کر کہ امیر صاحب واپس تشریف لے گئے ہوں گے حالانکہ وہ وہاں سے بہت آگے تھا واپس ہونا چاہا تو قفل بند دروازہ باہر کا بڑی دور جہاں آواز بھی نہ جا سکتی تھی قفل ڈال دیا اس وقت وہ حسرت کی نظروں سے ان سونے کے ستونوں کو دیکھتا تھا کہ کچھ کام نہیں آتے کئی روز بھوکے رہ کر ختم ہو گئے. نیز ہمیشہ ہر کوئی ریل ہی میں تھوڑا ہی سفر کرتا ہے تو مثلاً سفر میں کھانا ختم ہو جائے اور نہ ملے. گلستاں کی حکایت مشہور ہے کہ ایک شخص ایک جنگل میں چلا جاتا تھا کسی ایسے مقام پر اس کا توشہ ختم ہو گیا کہ جہاں سے آبادی بہت دور تھی بے چارہ ادھر ادھر پھرا اگر کہیں کوئی چیز کھانے کی نہ ملی آخر میں آ کر پڑ رہا اور زمین پر جو روپے اس کے پاس تھے رکھ کر یہ مضمون انگلی سے لکھا ؎

در بیاباں غریب سوختہ را
شلغم پختہ بہ ز نقرہ خام

(جنگل میں مسافر فاقہ مند کو ابلے ہوئے شلغم کچی چاندی سے بہتر ہیں)

تو روپیہ پیسہ تو کھانے کے کام آتا ہی نہیں اس کی عجیب خاصیت ہے کہ جب تک جدا نہ ہو کبھی کام نہ آوے دوستی کا تو مقتضیٰ یہ تھا کہ اجتماع ہو مگر یہ ساتھ رہ کر کبھی کام نہیں آتا اس کے ساتھ جب تک دشمنوں کا سا معاملہ نہ کرو کبھی کام نہیں آتا یعنی جب اسے پاس سے جدا کر دو. بہر حال ایسی چیز دوستی کے قابل

نہیں کہ وہ آپ کی دشمن اور آپ اس کے مشتاق دوست وہ ہے جس کی شان یہ ہے
ع ما با و محتاج بود یم او بما مشتاق بود ٭ (ہم اس کے محتاج ہیں اور وہ ہمارا مشتاق)
بہر حال روپیہ چاہے کتنا ہی ہو مگر جب وقت پر کھانا بھی میسر نہ ہو تو بھوک تو سب کو ہی چکھنا پڑے گی وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ اور مال کے نقصان سے مثلاً تجارت کی تھی اس میں نقصان ہوا برف تھی گھل گئی یا چور لے گئے بہر حال نقص عام ہے وَالْاَنْفُسِ مثلاً بیمار ہوگیا یا مرگیا وَالثَّمَرَاتِ پھلوں کا گھٹنا یا تو یہ کہ باغ میں پھل ہی نہیں آیا یا آیا مگر کسی وجہ سے ہلاک ہوگیا یا اولاد نہ ہوئی یا ہوئی اور مرگئی۔ بہر حال یہ مختصر فہرست ارشاد فرمائی ہے ان واقعات کی جو ناگوار ہیں گو ناگواری کا پیش آنا بھی رحمت ہے حق تعالیٰ کی کہ اگر ناگواریاں نہ پیش آتیں تو اجر صبر نہ میسر ہوتا کیونکہ اگر ناگواری نہ پیش آتی تو صبر کی ماہیۃ جو حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰی مَا تَکْرَھُہٗ (نفس کو ان باتوں پر روکنا جو اس کو ناگوار ہوں) ہے کہاں سے متحقق ہوتی اور جب متحقق نہ ہوتی تو ہم بہت بڑے ثواب سے محروم رہتے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اولیاء کو بوجہ مشاہدہ اس رحمت کے ناگوار طبعی ہوتا ہے ناگوار عقلی نہیں ہوتا ہاں صدمہ ہوتا ہے مگر یہ منافی رضا کے نہیں چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسول جاری ہوگئے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ روتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔ ایک اور حکایت یاد آئی۔

ایک بزرگ کے بیٹے کا انتقال ہوا تو وہ ہنس پڑے اور ایک ایسے بزرگ فرض کئے جاویں کہ وہ اس حالت میں رونے لگیں دونوں کی بڑی فضیلت ہے مگر یہ کہا جائے گا کہ رونے والے میں کمال اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھا تو بزرگوں کی حالت میں اس قسم کا تفاوت ہوتا ہے کسی شخص نے اپنے پیر سے کہا کہ بزرگوں کی حالت

کیسے مختلف ہوتی ہے۔ پیر نے کہا کہ فلاں مسجد میں تین بزرگ بیٹھے ہیں وہاں جاکر ان کے ایک ایک طمانچہ مار کر دیکھ لو، چنانچہ سائل مسجد میں گئے ہر ایک کے ایک ایک طمانچہ مارا ایک نے تو اُٹھ کر اتنے ہی زور سے اس کے طمانچہ مار لیا اور چپکے جا بیٹھے، ایک نے خیال بھی نہ کیا اور ایک نے الٹا اس کے ہاتھ کو دبانا شروع کیا کہ تیرے چوٹ لگی ہوگی۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے صاحبزادے کے انتقال پر آنسو جاری ہوگئے تھے اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رضا حاصل نہ تھی اور یہ حدیث صحیح ہے راوی اس کے سب ثقہ ہیں تو اس میں کسی طرح کا کلام نہیں ہوسکتا ہے اور بظاہر نظر ناواقف کو یہ حالت گھٹی ہوئی معلوم ہوسکتی ہے مگر وجہ صرف یہ ہے کہ فن سے واقفیت نہیں۔ پس اس فن کے جاننے کی ضرورت ہے نہ جاننے کی وجہ سے جو سُنا اور جو چاہا سمجھ لیا اور اسی سے غلطی ہوتی ہے مگر اس فن کے حاصل کرنے کی طرف اصلا توجہ نہیں۔ طلبہ سے تعجب ہے کہ صرف و نحو میں تمام تمام عمریں صرف کر دیتے ہیں مگر اس فن کیلئے تھوڑے دن بھی صرف کرنا ضائع سمجھتے ہیں حالانکہ درسیات سے بھی یہی مقصود ہے۔ فرماتے ہیں ؎

درکنز و ھدایہ نتواں یافت خدا را
سیپارۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

(کنز الدقائق اور ہدایہ میں خداتعالیٰ کو نہیں پاسکتا سیپارۂ دل کا مطالعہ کر کہ اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے) اور

؎ چند چند از حکمت یونانیاں — حکمت ایمانیاں راہم بخواں
صرف شد عمرت بہ بحث نحو و صرف — از کتاب عشق خواں ہم یک دو حرف

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے کچھ حکمت ایمانی یعنی معرفت کی پڑھو تمہاری عمر نحو و صرف کی بحث میں گذر گئی ایک دو حرف عشق کی کتاب کا بھی پڑھو)

تو اخلاق کے حقائق ہی نہیں معلوم خیر اگر تفصیل نہیں معلوم ہے تو اتنا تو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں اور ہر حالت آپ کی افضل تھی تو جس کی حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہوگی وہ ضرور افضل ہوگا کیونکہ اس نے دامن اقتدا کو مضبوط پکڑ لیا مگر مساوات نہ سمجھئے گا تو وہ حالت مشابہ ہوگی نہ کہ مساوی پس اہل کمال کے فیوض واحوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض سے صرف مشابہت ومناسبت رکھتے ہیں اور مساوی کہنا جہل اور گمراہی ہے سو جن کو مشابہت کامل ہے ان کا ادراک کامل ہے وہ ہر واقعہ سے پورے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ جب حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے انتقال کا وقت ہوا تو آپ کے آنسو ٹپک پڑے۔ یہ اثر تھا شفقت پدری کا کیونکہ یہاں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ اولاد مرگئی اور ایک یہ کہ اس امر کو خدا نے واقع کیا تو یہاں دو حق ہوئے۔ ایک اولاد کا اور ایک خدا تعالیٰ کا پس کمال یہ ہے کہ دونوں کے حقوق ادا کئے بیٹے کی محبت کی وجہ سے تو آنسو ٹپک پڑے اور متاثر ہوئے مگر نہ اس قدر کہ جزع وفزع کی نوبت پہونچی جس سے خدا کا حق فوت ہوتا تو حق کی رضا کو بھی ساتھ لئے رہے اور بیٹے کی محبت کا حق بھی ادا کیا تو دونوں کو جمع کر دکھایا جیسا خدا تعالیٰ نے ایک مخلوق ملائکہ کی پیدا کی ہے جن کی خلقت میں دو چیزوں کو جمع کیا ہے یعنی ان کا نصف بدن برف کا ہے اور نصف آگ کا اور ان کی یہ تسبیح ہے سُبْحَانَ الَّذِیْ جَمَعَ بَیْنَ الثَّلْجِ وَالنَّارِ (پاک ہے وہ ذات جس نے برف اور آگ کو جمع کردیا) تو یہ شان یہاں بھی موجود ہے کہ غم کی آگ رضا کو ٹھنڈک نہ وہ غالب نہ یہ نہ یہ زائل نہ وہ تو پورے حقوق ادا کرنا بڑا کمال ہے۔ غیر کاملین پورے حقوق ادا نہیں کرسکتے۔ دوسرے صبر کی فضیلت بھی تو جب ہی حاصل ہوسکتی ہے کہ جب دل کو لگ جاوے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جتنے جذبات پیدا کئے ہیں سب میں حکمت رکھی ہے مثلاً غضب میں یہ حکمت ہے کہ عفو کی فضیلت ہمیں حاصل ہو فرماتے ہیں۔ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (غصے کے پینے والے اور لوگوں کی

خطاء سے درگذر کرنے والے) تو عفو بھی بہت بڑی فضیلت ہے اگر غضب نہ ہوتا تو اس سے محروم رہتے۔ پس نہ یہ فضیلت کہ بالکل ہی نہ دے اور نہ یہ فضیلت ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں میں خفا ہو جائیں تحمل و عفو جانتے ہی نہ ہوں فضیلت تو یہ ہے کہ اِذَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (جبکہ غصہ کرتے ہیں اور وہ معاف کرتے ہیں) مگر یہ واضح رہے کہ عفو اور تحمل کے مواقع ہیں ہر محل و موقع میں نہ غضب مناسب ہے اور نہ عفو ہی بلکہ جو محل عفو کا ہے وہاں عفو کرنا چاہیئے اور جو موقع غضب کا ہے وہاں غضب نافع ہے زمانہ کے صوفیہ اس میں تمیز نہیں کرتے ہیں ایک ملکہ کو نہ بالکل فنا ہی کر دیں اور نہ اس کو امام مطلق ہی بنا دیں اگر کسی کے پاس سنکھیا ہو تدبیر سے وہ بھی کارآمد ہے ساری خرابی یہ ہے کہ فن ناقصوں کے ہاتھ آگیا جیسا کہ ایک بڑھیا کے مکان میں شاہی باز آگرا تھا اس نے دیکھا کہ اس کی چونچ ٹیڑھی ہے یہ کھاتا کیسے ہوگا اُس کے پنجے مڑے ہیں یہ چلتا کیسے ہوگا غرض اس بڑھیا کو اس باز کی حالت پر بہت رحم آیا اور قینچی لے کر باز کے پنجے اور چونچ بازو وغیرہ کاٹ ڈالے اور اور اس کو مضغۂ گوشت بنا دیا۔ اس زمانہ کے رسمی پیر و مرید بھی اس بڑھیا سے کم نہیں کہ تمام عالم کو تہس نہس اور برباد کرتے پھرتے ہیں۔ بڑا ولی اللہ وہ مرید شمار ہوتا ہے کہ جس کو اپنے بیوی بچوں کی خبر اور پرواہ نہ ہو مگر فی الحقیقت یہ شخص بڑا مخالف ہے خدا کا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ کریں کہ خطبہ چھوڑ کر حسن رضی اللہ عنہ کو گود میں اٹھا لیں اور یہ منہ بھی نہیں دیکھتے بلکہ دیکھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یا تو مسئلہ سے بے خبری ہے یا اس کو حالت ناقص خیال کرتے ہیں ایک جہل ہے ایک کفر۔ بہر حال غضب بھی ضروری ہے اپنے موقع پر اور بخل بھی ضروری ہے مثلاً ایک شخص اس لئے رقم مانگے کہ بھنگ پیوے گا، ناچ کراوے گا۔ یہاں بخل کی ضرورت ہے۔ پس بخل بھی جب بے موقع ہوگا تب تو مذموم ہوگا ورنہ محمود۔ خوب سمجھ لیجئے۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است
کہ از و حمام تقویٰ روشن است

(شہوت دنیا مثل ایندھن کے ہے کہ اس حمام تقویٰ کی گرم بازاری ہے)

یہ جو خواہشیں ہیں ایندھن ہیں کہ ان سے تقویٰ کا حمام روشن ہے اگر سوختہ نہ ہو تو حمام گرم نہیں ہوسکتا اسی طرح شہوت کا اگر تقاضا نہ ہو تو تقویٰ کیا مولانا نے اس شہوت کو بھی کمال بتلایا ہے کہ جس کی قوت شہویہ جس قدر بڑھی ہو وہ رکے بس وہ کامل ہے کہ

شہوت دنیا مثال گلخن است کہ از و حمام تقویٰ روشن است

(شہوت دنیا مثل ایندھن کے ہے کہ اس حمام تقویٰ کی گرم بازاری ہے)

اور اس سے وہ مسئلہ بھی حل ہوگیا کہ کوئی چیز بیکار نہیں لیجئے جس کو نقمت کہتے تھے وہ سبب رحمت کا ہوا اسی طرح صبر کی فضیلت ناگواری ہی کی وجہ سے میسر آتی ہے پس موت پر طبعی تو ناگواری ہونا حق اولاد کا ہے اور روحانی ناگواری نہ ہونا رضائے وحق حق ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں حق ادا کئے غالب کا غالب مغلوب کا مغلوب یہی عدل ہے تو اولیاء میں بھی کاملین وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف لئے ہوئے ہوں اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی کپڑے پھاڑے نہ جنگل میں بھاگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں امور خانہ داری کا بھی پورا پورا انتظام اور سلطنت کا بھی اور انتظام بھی وہ جس کی نظیر نہیں ہوسکتی امور خانہ داری کا وہ انتظام کہ آج ہر شخص اسی کا خوشہ چین ہے۔ غرضکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہر ایک امر کا انتظام تھا آپ نے بول و براز تک کے قانون بتلائے ہیں اور آج کل پیروں کا بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ فلاں شاہ نے ایک ضرب لگائی اور ہو کہا بس گر پڑے لو صاحب بس یہ پہونچے ہوئے بزرگ ہیں مگر حقیقت میں اگر اسی کا نام بزرگی ہے تو کوئی نبی بزرگ ہی نہیں ہوا کیونکہ انبیاء علیہم السلام مغلوب الحال نہیں ہوتے تھے ان کو وہ وجد نہیں آتا تھا کہ جس میں کپڑے پھاڑ ڈالیں۔ دنیاوی امور میں وہ بالکل عوام کے مشابہ ہوتے تھے بس یہ امور لوازم بزرگی سے نہیں ہاں اگر

تصنع سے نہ ہوں تو بزرگی کے منافی بھی نہیں چنانچہ بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک ابن الحال اور ایک ابوالحال تو اپنے حال پر غالب رہتے ہیں اور ابن الحال مغلوب ہوتے ہیں خلقت سے بھاگتے ہیں کپڑے پھاڑتے ہیں ہاں خلاف شریعت قصداً نہیں کرتے اور ان دونوں قسموں میں زیادہ کامل ابوالحال ہوتے ہیں مگر آجکل لوگ غالب الحال بزرگوں ہی بزرگ ہی نہیں سمجھتے جیسا کہ انبیاء کو ان کے زمانہ کے لوگ بزرگ نہیں سمجھتے تھے چنانچہ کفار عرب کہا کرتے تھے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا أَوْ يُلْقٰى إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّأْكُلُ مِنْهَا یعنی کیسے اللہ کے پیارے اور رسول ہیں کہ کھانا بھی کھاتے ہیں بازار میں چلتے پھرتے ہیں ان پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا کہ ان کی ضروریات منصبی میں مدد کرتا یا ان کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں دیا گیا یا باغ ان کو کیوں نہ دیدیا گیا جس سے کھاتے پیتے یہ تو ہم سے بھی زیادہ محتاج ہیں۔ آج کل بھی جو بزرگ ایسی شان رکھتے ہیں ان کو بزرگ نہیں سمجھتے بلکہ اب تو ایسے شخص کو زیادہ بزرگ سمجھتے ہیں جس کو عقل تک بھی نہ ہو حالانکہ دین میں عقل زیادہ کارآمد و نافع ہے کیونکہ اس کا فعل ہے انجام اندیشی مگر صرف عاجل نہیں بلکہ آجکل کی لوگ انجام کے معنے بھی نہیں سمجھتے انجام اندیشی یہ نہیں کہ ایک ہفتہ کا نرخ دیکھ کر کلکتہ سے مال منگالیں۔ انجام اندیشی یہ ہے کہ احقر نے ایک بار سہارنپور سے گنگوہ کے لئے اسٹیشن پر جا کر بابو سے کہا کہ اسے وزن کر کے محصول لے لو اس نے کہا لے جاؤ ہم گارڈ سے کہدیں گے میں نے کہا وہ گارڈ کہاں تک جاویگا کہا غازی آباد تک میں نے کہا اس کے آگے کیا ہوگا کہنے لگا وہ دوسرے گارڈ سے کہدیگا میں نے کہا وہ کہاں تک جاویگا اس نے کہا کانپور تک میں نے کہا اس کے آگے کیا ہوگا اس نے کہا بس کانپور تو جانا ہی ہے میں نے کہا نہیں بلکہ اس کے آگے پھر ایک جگہ جانا ہے (اللہ کے یہاں) وہاں کونسا گارڈ ہوگا تو وہ ہندو بابو سنائے میں آگیا اور اس پر بہت ہی اثر ہوا بس پھر کسی نے کچھ نہیں کہا بس وزن کرا کے دیدیا۔ اب ان شاء اللہ تعالیٰ وہاں سے بھی بیفکری ہے کہ ہم نے جو حکم تھا کر دیا غرض یہ ہے انجام اندیشی اور وہ انجام جس کو آپ سمجھے ہوئے ہیں وہ نہیں ہے لوگوں نے

انجام میں تعلیل کرلی ہے کہ م کو بدل لیا نون سے یعنی انجان غرض عقل کا کام ہے انجام اندیشی اور اس کی ضرورت خصوصیت کے ساتھ دین میں جسقدر ہے ظاہر ہے پس کم عقل زیادہ بزرگ ہوگا یا عاقل انبیاء ہی کو دیکھ لو کہ ان کو وہ عقل عطا ہوئی ہے کہ نہ کسی دنیادار کو نہ کسی دیندار کو ویسی عقل ملی پس جن کے احوال زیادہ مشابہ ہوں گے انبیاء علیہم السلام کے خصوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہی زیادہ بزرگ ہوں گے البتہ بعض بزرگ بھولے بھی ہوتے ہیں مگر بھولا ہونا لوازم بزرگی سے نہیں گو منافی بھی نہیں مگر نفع زیادہ بھولے سے نہیں ہوتا ہاں چاہے بھولا خود مقبول ہو کیونکہ پیا جس کو چاہے وہ ہی سہاگن ہوئے بعض اس مذاق کے بھی ہوئے ہیں کہ نفع سے بحث نہیں چنانچہ احمد جام فرماتے ہیں ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام دیوانہ ہو سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

مگر انبیاء علیہم السلام نے سلسلہ بڑھانے کی کوشش فرمائی بہرحال واقع میں خواہ یہ حالت بھی کامل ہو مگر انفع وہی ہوگا جو عاقل کامل ہوگا پس انبیاء علیہم السلام عاقل کامل تھے اور میں اسی کو ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام بھولے نہیں تھے سب تعلقات کے حقوق پورے ادا فرماتے تھے اولاد کا بھی حق تعالیٰ کا بھی یہی شان مؤمن کامل کی ہوتی ہے کہ اس کو ناگواری ہوتی ہے مگر وہ ناگوار سے مغلوب نہیں ہوتا ۔ خلاصہ مقام یہ تھا کہ ناگواری ہر شخص کو پیش آتی ہے اور بیچ میں مضمون بڑھ گیا مگر ہیں سب مفید باتیں مقصود یہ ہے کہ سب کو ناگواری پیش آتی ہے اور اس پر صبر کرنے سے ثواب عظیم ملتا ہے تو ناگواری بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے ۔ دیکھیے لوگ کہتے ہیں کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو) سے رحمت ثابت ہوتی ہے مجھ کو تو ہر آیت میں رحمت ہر حکم میں رحمت نظر آتی ہے اگر شریعت کے ہر ایک برتاؤ کو غور سے دیکھیں تو ہر ایک میں رحمت پائی جاوے گی اور یہ میری من گھڑت نہیں سلف کے اقوال اس کے مؤید ہیں ۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں سب سے بڑی آیت رحمت کی آیۃ مداینت ہے کہ آپس کا لین دین لکھ لیا کرو وجہ دلالت یہ کہ حق تعالیٰ کو جب ہمارا دنیا کا نقصان گوارا نہیں تو اخروی نقصان کو کب گوارا فرماویں گے لکھنا شروع فرمایا تاکہ چار پیسہ کی بھی بھول نہ ہو کہ نقصان

اٹھانا پڑے ایک لمبی آیۃ رکوع کا رکوع اسی قانون میں نازل فرمایا تو ہمارا چار پیسہ کا نقصان بھی گوارا نہیں یہ کتنی بڑی رحمت اور محبت ہے جیسے اس باپ کو کتنی محبت ہوگی کہ بیٹے کو ٹھیکرے جمع کرنے سے نہیں روکتا کہ روئے گا حالانکہ ٹھیکرے رونے کے قابل نہیں واللہ دنیاوی متاع کو ٹھیکروں سے بھی کمتر ہے بلکہ مچھر کے بازو کے برابر بھی اس کی قدر اللہ کے نزدیک نہیں اگر اتنی بھی قدر ہوتی تو کسی کافر سے بڑھ کر کوئی دوسرا مالدار نہ ہوتا اور نافرمان کو ایک گھونٹ پانی کا نہ ملتا کہ محبوب چیز مبغوض کو نہیں دی جاتی اس سے ثابت ہوا کہ مال دینا حق تعالیٰ کو فی نفسہٖ مبغوض ہے اگرچہ معین دین ہونے کے سبب عارضی محبت ہو جیسے محبوبیت سنکھیا کی کہ کسی دوا کا جزو ہے لہذا قابل خریداری ہے جب یہ بات ہے تو جب معین دین ہوگا محبوب ہوگا ورنہ مبغوض ہوگا یہی وجہ ہے کہ اپنے محبوبوں کو کم (یعنی حسب ضرورت) دیتے ہیں اور یہ عین رحمت ہے کہ غذا ضرورت کے موافق دے کہ عصمت بحال رہے اور انہماک فی الدنیا نہ ہو کیونکہ اگر ان کو زیادہ مال و متاع ملے تو آخر ان کے بھی پیچھے حرص کا جال بچھا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کو زیادہ دیتا ہی نہیں تاکہ انہماک فی الدنیا نہ ہو اور جس کا مرتبہ عنداللہ جس قدر بڑھا ہوا ہے اور جو زیادہ محبوب ہے اس کو اسی قدر دنیا سے کم حصہ ملتا ہے چنانچہ اسی سبب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے کم دنیا دی گئی اور کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ سلیمانؑ کو ساری دنیا کا مالک اور اتنا بڑا بادشاہ بنایا تھا کہ آج تک کسی کو ان کا نظیر نہیں بنایا کیونکہ وہ ان اموال سے متمول اور ان کے مالک نہ تھے بلکہ ان کے خازن محض تھے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ آپ کا معجزہ تھا کیونکہ معجزہ ہر نبی کو اس زمانہ کے موافق عطا ہوتا ہے یعنی جس زمانہ میں جس بات کا زور ہوتا ہے اسی قبیل کا معجزہ اسی قوم کے نبی کو دیا جاتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر کا بڑا زور تھا تو موسیٰؑ کو وہ معجزے عطا کئے گئے کہ جس سے اہل سحر متحیر و عاجز ہوگئے اور ناچار آپ کو رسول برحق ماننا پڑا۔

حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں طب کا بڑا زور تھا اس لئے حضرت عیسیٰؑ کو دم سے مردہ زندہ کر دینے کا معجزہ عنایت ہوا لاعلاج امراض والے کو دم کے دم میں اچھا کر دیتے۔

(بقیہ صفحہ ...)

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

ٹیلیفون کا نمبر بدل گیا۔ اب یہ نمبر ہوگیا ۲۰۷۵۲۰۷)

زمانہ بھر کا مسلم ہے کہ مادر زاد نابینا بینا کسی دوا سے بھی نہیں ہو سکتا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس کو بھی بحکم خداوندی بینا کر دیتے تھے۔ چونکہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں حکومت اور سلطنت کا زور تھا کہ ہر بادشاہ اپنی طاقت و خدا داد قوت پر مغرور تھا اپنے اس زور و قوت پر مغرور ہو بیٹھے تھے خدائی اور آسمانی احکام بالکل نسیًا منسیا ہو چکے تھے اس زمانہ میں جب سلیمانؑ کو نبی برحق بنا کر بھیجا گیا تو ان کو ایسا زبردست بادشاہ بنایا گیا کہ جس کو دیکھ کر وہ لوگ اپنی طاقت و زور سب بھول گئے اور سر تسلیم خم کرتے ہی بن پڑا باقی یہ بات کہ ہر نبی کو وہی معجزہ کیوں دیا جاتا ہے جس میں اس کی قوم کو غلو ہو اس میں حکمت یہ ہے کہ جس امر کا جس زمانہ میں غلبہ ہوتا ہے اس کی معرفت ان لوگوں کو زیادہ ہوتی ہے اور جس قدر معرفت زیادہ ہوتی ہے اس کی حد مقدوریت زیادہ معلوم ہوتی ہے جب معجزہ اس حد سے آگے ہو گا اس کے اعجاز کو بھی وہ لوگ خوب سمجھیں گے اور جو مصلحت ہے معجزہ کی وہ خوب ظاہر ہو گی پس سلیمان علیہ السلام کو ایسی قوت کی سلطنت دی گئی تاکہ بمقابلہ دوسرے سلاطین کے یہ بات ظاہر ہو جاوے کہ سلاطین کتنے ہی بڑھ جائیں ساری دنیا غرب سے شرق تک کے مالک ہو جائیں کتنے ہی ریلوے انجن موٹر کار وغیرہ نکالیں مگر جن اور طیور پر کہاں سے حاکم بنیں گے اُن کی زبانیں کیسے معلوم کریں گے ہوا کو کیونکر ایسا تابع بنائیں گے کہ صرف زبان ہلانے سے وہ کام کرنے لگے اور سلیمان علیہ السلام کو ان چیزوں پر حاکم بنایا سب کو ان کے قبضہ میں دیا پس اس سے معلوم ہو جاویگا کہ یہ معجزہ ہے حاصل یہ کہ سلطنت ان کو اس غرض سے دی گئی تھی جو مذکور ہوئی پس وہ خازن محض تھے اس ملک سے متمول نہ ہو گئے تھے چنانچہ لکھتے ہیں ؎ زاں سلیماں خویش راسکیں بخواند (اس وجہ سے سلیمانؑ اپنے کو مسکین کہتے تھے) قرآن بھی اس تقریر کا مؤید ہے چنانچہ ایک مقام پر فرمایا کہ داؤدؑ کو ہم نے سلطنت دی اور سلطنت بھی چھوٹی نہیں بلکہ ملک عظیم عطا فرمایا چنانچہ ارشاد ہے وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ (ہم نے ان کو ملک کو بڑا کیا) اور باوجود اس کے دوسری جگہ ان کے ہی قصہ میں فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو زرہ بنانے کا حکم دیا اگر کہیے کہ زرہ بنانا ایک صنعت تھی جس کو انھوں نے سیکھ لیا تھا باقی کھاتے پیتے سلطنت سے تھے تو یہ بھی نہ تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وَكَانَ كُلُّ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ کیا نبی دستکاری سے

ضروری اطلاع:۔ خط و کتابت کرتے وقت یا اپنے پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کیا کریں۔

اپنے حوائج پوری کرتے تھے صاحبو یہ ان کی سلطنت تھی کہ صاحب سلطنت ہو کر ان کی غذا جَو کی روٹی ہوتی تھی اور یہ شان سوائے کاملین اور انبیاءؑ کے دوسرے کی نہیں ہو سکتی کہ سلطنت بھی کریں اور جَو کی روٹی بھی کھائیں اس لئے ان کی سلطنت سے اپنے لئے ترقی کی ہوس کا سہارا مت ڈھونڈنا تو ان کی یہ سلطنت تھی اور اس سے ایک غلطی اور رفع ہوئی کہ اب جو لوگوں نے بزرگی کے معنے کا حاصل زہدِ خشک نکالا ہے کہ مر رہو بیوی بچے سب چھوڑو گھر سے منہ موڑو یہ کوئی بزرگی نہیں زرہ بنا کر اس سے گذارہ کرنے سے تو اس کی ممانعت نکلتی ہے ہاں ترقی دنیا جس نہیں نکلتا کیونکہ اعمل سابغات (تم پوری زرہیں بناؤ) کے ساتھ ہی وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (اور نیک عمل کرو) بھی ارشاد فرمایا ہے مگر آپ نے خوب عمل کیا اِعْمَلُوْا صَالِحًا (نیک عمل کرو) کو اڑا ہی دیا جس طرح کسی بسیار خوار نے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ اور پیو) پر عمل کیا تھا دعا بھی قرآن میں سے منتخب کی تو صرف رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے دستر خوان نازل فرما) غرض یہ کہ مطلب کی سب باتیں لے لیں بہر حال خدا نے دنیا کے کام سے ممانعت نہیں فرمائی ہاں اس میں اعتدال کا حکم ہے کہ منہمک اور مشغوف نہ ہو اسی استعمال معتدل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سائل کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَالَ (بلاشک اللہ جمیل ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں) سائل نے پوچھا تھا کہ اُحِبُّ اَنْ یَّکُوْنَ نَعْلِیْ حَسَنًا وَّثَوْبِیْ حَسَنًا اَیَکُوْنُ ھٰذَا مِنَ الْکِبْرِ (مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرا جوتا بھی اچھا ہو اور میرا کپڑا بھی اچھا ہو کیا تکبر میں سے ہے) حاصل جواب یہ کہ یہ مطلب نہیں کہ خدا تو دے عمدہ اور پاکیزہ کھانا کپڑا اور تم وہی سڑی ہوئی پوشاک اور بھُسا کھانا کھاؤ یہ بے نفسی نہیں بد تمیزی ہے ہاں حد اعتدال سے آگے قدم نہ رکھو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتدال دیکھئے کہ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ النَّظَافَۃَ (اللہ تعالیٰ پاکیزگی کو پسند فرماتے ہیں) اور ایک جگہ فرماتے ہیں اَلْبَذَاذَۃُ مِنَ الْاِیْمَانِ (سادگی ایمان سے ہے) یعنی سادگی رکھو نہ میلا پن اور نہ تکلف یعنی نہ یہ کرو کہ بغیر صابن میاں کا منہ ہی نہ دھلے بغیر آئینہ عمامہ ہی نہ باندھا جائے کہ کہیں ٹیڑھا نہ ہو جائے کہ یہ تکلف ہے جس سے بعض وقت اوروں کو بھی سخت تکلیف ہوتی ہے اور خود کو تو تکلیف

ہو نا ظاہر ہی ہے۔ ایک صاحب کے دوست ان سے ملنے کو گئے آواز دی جواب ملا بہت اچھا جواب دے کر انھوں نے آئینہ اور کنگھی منگا یا آدھ گھنٹے میں بن سنور کے نکلے یہ افراط ہے اور اسی طرح یہ نہ کرو کہ ایسے رہو کہ کپڑوں سے بدبو آدے میلے کچیلے ہو کہ اس سے بھی دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے چنانچہ فقہاء نے بدبو دار کپڑے پہن کر یا بدبو دار شئے مثل پیاز لہسن کھاکر مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے کہ ایسے لوگ جماعت میں نہ شریک ہوں کتنا بڑا حرمان ہے کہ فضیلت جماعت سے بھی محروم رہے صاحبو علماء نے حقیقت کو سمجھا ہے جسم کو نہانا بدن صاف کرنا کپڑے بدلنا ضروری قرار دیا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ استری ہی کے کپڑے ہوں صابن بھی ضرور ہو اگر دھوبی کے یہاں کے یہاں کے بھی نہ دُھلے ہوں تو اپنے ہاتھ سے دھو کر صاف کر لئے جادیں پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال کی تعلیم فرمائی ہے تو خدا نے انبیاءؑ کو مال کا خازن بنایا ہے مالک نہیں بنایا اور اسی کا یہ اثر ہے جو فرمایا گیا ہے کہ نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِیَاءِ لَانَرِثُ وَلَانُوْرِثُ یعنی ہم انبیاء کی جماعت نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں نہ ہماری وراثت کسی کو ملتی ہے کیونکہ وراثت تو جب ملے کہ ہم پہلے مالک ہوں ہمارے پاس تو جو ہے وہ وقف ہے اور فقراء و مساکین کا حق ہے۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول تھا کہ آپ کے خاتمہ کے ساتھ ہی مال بھی ختم ہو گیا اور اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ یہ ملک اموال دنیا کی ناقص ہے چنانچہ اس کا اثر مرض موت کے وقت ظاہر ہوتا ہے کہ ثلث سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا پس عدم ملکیت کا اثر اسی وقت سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے مگر حالت صحت تک ہمارے ضعف کے سبب ہماری تسلی کی اصل سے عدول کیا گیا چونکہ انبیاء میں یہ عارض نہیں اس لئے علی الاطلاق ان کے لئے اُس اصل کو تجویز کیا گیا اور نیز اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ انبیاءؑ کے ساتھ محبت فرض ہے اور محبت بغیر ایمان ہے نہیں تو اگر میراث ملا کرتی تو شاید لوگوں کو میراث اور مال کی محبت میں انبیاءؑ کی موت کی تمنا ہوتی جو خلاف محبت ہے اس لئے اس کی جڑ ہی کاٹ دی اسی طرح لَانُوْرِثُ (ہم کسی کے وارث نہیں ہوتے) میں بھی یہی حکمت ہے کہ شاید کوئی عزیز و قریب معاملات تقسیم میں ان سے اُلجھتا اس لئے یہ حکم قرار پایا کہ انبیاءؑ نہ وارث ہوں کسی کے نہ اُن کا کوئی وارث ہو اور جو کچھ چھوڑا جائے وہ صدقہ سے چنانچہ ارشاد ہے مَا تَرَکْنَا فَھُوَ صَدَقَۃٌ (جو ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے) غرض خدا تعالیٰ نے اس سے اپنے دوستوں کو بچایا ہے تو باوجودیکہ دنیا ایسی مبغوض ہے مگر پھر بھی جب ہمارا چار پیسہ کا نقصان

بھی گوارا نہیں کیا کہ لکھ لیا کرو تو کیا رحمت ہے اور لیجئے یہ کس قدر رحمت ہے کہ اگر کوئی مالک نصاب مقروض ہو تو حکم ہے کہ قرضہ پہلے ادا کرو بندوں کا حق بندوں کو دو ہم اپنا حق یعنی زکوٰۃ ساقط کرتے ہیں انھیں دو ہمیں نہیں چاہیئے اللہ اکبر اس قدر رحمت کہ بندوں کے سامنے اپنا حق معاف فرما دیا مگر ہر موقع کو اس پر قیاس نہ کیجئے کہ ہر جگہ حق تعالیٰ کو حذف کر دیا جاوے کیونکہ جس موقع پر حق عبد مقدم ہے تو اس حیثیت سے نہیں کہ وہ حق مستقل ہے بلکہ اس حیثیت سے وہاں حق اللہ اس طرح ادا ہوتا ہے کہ اس حکم کو مانو بس خواص اس حق عبد کو حق اللہ سمجھ کر بجا لائے اور اس کے ضمن میں مخلوق کا حق بھی ادا کیا بس ان کو تمام حقوق العباد میں اصل مطمح نظر حقوق اللہ ہی ہیں اور یہی شان ہوتی ہے عارفین کی کہ ان کی نظر میں مخلوق مرأۃ جمال ہوتا ہے اس کی مثال آئینہ کی سی ہے جو محبوب کے سامنے رکھا ہے کہ وہاں ایک دو عاشق بھی کھڑے ہیں اور ایک مشتری بھی ہے یہ سب اس آئینہ کو دیکھ رہے ہیں مگر نظر میں دونوں کی تفاوت ہے مشتری آئینہ کو من حیث ہو مقصود دیکھ رہا ہے اور عاشق مِنْ حَيْثُ اَنَّهٗ مَرْآةٌ لِلْمَقْصُوْدِ (اس اعتبار سے وہ مقصود کے لئے آئینہ ہے) دیکھ رہا ہے لوگ ان حضرات کی حالت سنکر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ادھر اللہ سے واصل اور ادھر مخلوق میں شاغل مگر مثال مذکور سے خوب سمجھ لو کہ ان کو مخلوق کی طرف نظر کرنا مانع نہیں ہوتا مشغولیت بحق سے اور اس کی دوسری ایسی مثال ہے کہ کسی جماعت نے بادام بہت سے جمع کئے اور وہ روغن کے عاشق ہیں تو وہ محلہ میں مشین ڈھونڈتے پھریں گے مگر مشین کے طالب نہیں ہیں اسی طرح عارفین روغن معرفت کے عاشق ہیں اور مخلوق مشین ہے پس وہ اس مصنوع سے صانع کی معرفت کا روغن نکالتے ہیں اس مصنوع میں صانع کے مشاہدہ کی مثال میں ایک حکایت یاد آئی ہے کہ ایران کے شاہزادہ نے ایک مصرع کہا کہ ۔ ؎

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود ۔ (چتکبرا موتی کسی نے نہ دیکھا ہوگا) دوسرا مصرع نہ موزوں ہو سکا، شعراء سے کہا مگر چونکہ مضمون مہمل تھا کسی شاعر سے بھی موزوں نہ ہوا دہلی بادشاہ کو لکھا کہ اس کا دوسرا مصرع موزوں کرا کے بھیج دیجئے۔ دہلی کے شعراء بھی نہ موزوں کر سکے مگر زیب النساء ایک دن سرمہ لگا رہی تھی اتفاقاً آنسو ٹپک پڑے تو دوسرا مصرع آنسو دیکھ کر موزوں کر دیا کہ ؎

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود — مگر اشک بتانِ سرمہ آلود

(بجز سرمہ آلود مجنوں کے اشک چتکبرا موتی کسی نے نہ دیکھا ہوگا)

اور بھیجدیا وہاں سے خط آیا کہ شاعر کو یہاں بھیجدو اس کے جواب میں زیب النساء نے لکھا ؎

درسخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل — ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

(میں کلام میں مخفی ہوں جس طرح بوئے گل برگ گل میں مخفی ہے جس کو میرے دیکھنے کی خواہش ہے وہ مجھ کو کلام میں دیکھ لے)

مخفی زیب النساء کا تخلص ہے تو کیا آپ یہ تجویز کرسکتے ہیں مخفی کو تو سخن میں دیکھو اور ظاہر دیکھ نہ سکو اور خدا کو ظاہر دیکھ لو کسی میں طاقت ہے بس سوا اس کے کچھ نہیں ؎

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا (جس کو میرے دیکھنے کی خواہش ہو کلام میں مجھ کو دیکھ لے) فرماتے ہیں ؎ چیست قرآں اے کلام حق شناس ٭ رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

(اے کلام حق کو پہچاننے والے قرآن کیا ہے لوگوں کے رب کی طرف رب کا رونما ہے)

پس قرآن کو دیکھ لو کہ یہ اسی کا دیکھنا ہے اسی طرح مخلوق دیکھ لو مگر دیکھنا اپنے نفس کا نہیں غرض وہ لوگ بواسطہ مخلوق کے خالق کی معرفت حاصل کرتے ہیں کہ مخلوق کے واسطے سے حق تک پہنچتے ہیں وتا یہ سمجھ کر سب کے حقوق ادا کرتے ہیں سو ان کے دیکھنے پر اپنے دیکھنے کو قیاس مت کرو آپ کی حالت اور ہے اور ان کی حالت اور ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر و شیر یکساں ہیں)

یہ رفع تھا شبہ متعلق تقدیم حق عبد علی حق اللہ کا اور اصل مضمون رحمت حق کا تھا جس سے حق عبد حق اللہ پر مقدم کردیا اور اس سے پہلے مضمون تھا رحمت حق کا کہ ہمارے حقوق کی آیت تناجیتم[لہ] میں کس طرح حفاظت فرمائی اور اس سے پہلے یہ تھا کہ ہر آیت میں رحمت کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس سے پہلے یہ تھا کہ ناگواری بھی رحمت ہے اور اس سے پہلے یہ تھا ناگواری سب کو

لہ یعنی آیت یا ایھا الذین امنوا اذا تناجیتم بین ایدی الخ ۱۲ منہ

پیش آتی ہے اور یہی عماد مضمون تھا خلاصہ یہ کہ ناگواریاں سب کو پیش آتی ہیں اور چونکہ اس آیت میں اس کا علاج مذکور ہے جو کہ ضروری تھا اس لئے اس وقت بیان کے لئے اس کو اختیار کیا کہ اس کی حقیقت بتلا دوں کیونکہ اب یہ عادت ہے کہ جو ضیق پیش آتا ہے تو لوگ بجائے اس کے کہ اس کا علاج کریں اسی کا شغل کر لیتے ہیں اور علاج کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور شائد بعضے اس کو علاج ہی سمجھتے ہوں حالانکہ ضروری اور مفید اس کا حقیقی علاج کرنا ہے نہ کہ اس کو وظیفہ بنانا مثلاً کوئی مدقوق ہے تو اس کو چاہیئے کہ حکیم کے پاس جا کر نسخہ لکھوائے نہ یہ کہ کہتا پھرے اَنَا مَدْقُوق (میں دق کا مریض ہوں) انا مدقوق اگر انا مدقوق کی تسبیح پر کفایت کرے گا تو بیس دن کے بعد درجہ ثالثہ میں پہونچ کر سمجھ میں آوے گا کہ نسخہ استعمال کرتا تو کچھ نفع بھی ہوتا اسی طرح ہم پر جو مصیبتیں آتی ہیں تو ان کے آزار کی تو فکر کرتے نہیں بس ان کا وظیفہ بنا لیتے ہیں اور فضول بکتے پھرتے ہیں۔ سو اس سے کیا فائدہ میں کہتا کرتا ہوں جتنے جملے ہیں دو قسم کے ہیں خبریہ، انشائیہ تو خبریہ تو اکثر فضول ہوتے ہیں اور انشائیہ اکثر مفید مثلاً یہ کہ میرا لڑکا بیمار ہے یہ خبریہ ہے۔ اگر اس کے ساتھ انشائیہ نہ ہو مثلاً یہ کہ نسخہ لکھ دیجئے تو یہ محض فضول ہوگا۔ پس جب منھ کھولا کرو تو پہلے سوچ لیا کرو کہ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں مثلاً اگر کہیں طاعون ہوا تو اب کہتے پھریں گے کہ طاعون ہو رہا ہے مگر اس کے ازالہ کی فکر نہ کریں گے۔ ایک بزرگ سے ایک شخص نے کہا کہ فلاں جگہ طاعون ہو رہا ہے فرمایا کہ یہ کیوں کہتے ہو اس سے مقصود کیا ہے وہ بھی تو کہو سو وہ مقصود جملہ انشائیہ ہوگا تو جملہ خبریہ اکثر غیر مقصود ہوتے ہیں یہ بھی ایک پہچان ہے لغو کلام کی اور لغو کلام سے بچنے کا حکم ظاہر ہے اور مثال لیجئے فرماتے ہیں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (کہو کہ خدا ایک ہے) اس میں توحید سکھلائی جس سے مقصود یہ ہے کہ فَاعْتَقِدُوْهُ (اس کا اعتقاد رکھو) بزرگوں کے پاس آجکل لوگ جاتے ہیں اسی طرح کی فضول باتوں میں اپنا اور اُن کا دونوں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ کہیں اخباروں کا ذکر ہے کہ زمیندار میں بڑی ہمدردی ہے میں کہتا ہوں کہ تمہیں کیا تو اپنا جو کام ہے وہ تو کرتے نہیں اِدھر اُدھر کی فضول اور لغو باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں حالانکہ اہم امور کی جانب توجہ ہونی چاہیئے کہ الاہم فالاہم مگر لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ خود اُن کے بدن پر تو سانپ اور بچھو لگے ہیں مگر دوسرے کے بدن کی

نکمی کو گاتے پھرتے ہیں پھر لوگ احمق نہیں تو کیا ہیں افسوس ہے میں اسی واسطے کہا کرتا ہوں کہ

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے محبت و عشق کی باتوں کے سوا کچھ نہ پوچھو)

فائدہ کیا ان لغو کاموں سے اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ کہ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ لایعنی باتوں کو چھوڑدو گو وہ معصیت نہ ہوں کیونکہ یہ مفضی الی المعصیت ہو جاتی ہیں مگر ان کو اس کا شبہ بھی نہیں غرض خوبی اسلام کی یہ ہے کہ لغو کلام سے بچو۔ ایک بزرگ دیوبند میں تھے جن کی نگاہ اور آواز بھی بلا ضرورت نہ اٹھتی اور نہ نکلتی تھی تو وہ ہر فضول سے بچتے خواہ وہ کلام ہو یا نظر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر کی حدیث میں ہر لغو بات سے ممانعت فرمادی ہے۔ عام ہے کہ نظر ہو یا کلام ہو سب کو ممنوع فرمایا ہے اور نظر بھی بڑی بُری بلا ہے بعض نظر کی نسبت بزرگوں نے فرمایا ہے اَلنَّظْرُ سَهْمٌ مِّنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ (نظر ایک تیر ہے شیطان کے تیروں میں سے) حقیقت میں نظر بالکل تیر ہے جو نظر ہی نہیں آتا کہ کہاں اور کیسے لگا اور دل شکار ہو جاتا ہے شاعر کہتا ہے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشان زدۂ　　　بحیرتم کہ عجب تیر بیگمان زدۂ

(میرے سینہ کے اندر زخم بے نشان تو نے کیا ہے حیرت میں ہوں کہ بے کمان کے عجیب تیر تو نے مارا ہے)

تو ایسا کرے کیوں کہ زدۂ کہنا پڑے بس نظر ہی ذرا نیچے رکھے اسی نظر کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ (وہ آنکھوں خائنہ کو جانتے ہیں) اور ان پر دزدیدہ نظر تو کیا مخفی ہوتی اس کی تو یہ شان ہے کہ آگے فرماتے ہیں وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ کہ وہ دلوں کی بھی باتیں جانتا ہے اور اس میں باری تعالیٰ کو غیرت بھی آتی ہے کہ ہمارے غیر کو نظر محبت سے کوئی کیوں دیکھے اِلَّا بِاِذْنِ (بجز اس کی اجازت کے) واقعی اس دل میں گنجائش غیر کی ہونا نہ چاہیئے جیسے معبودیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ایسا ہی مقصودیت میں بھی نہ ہونا چاہیئے اور توحید حقیقی یہی ہے تو وہ بزرگ اتنا بچتے کہ نگاہ فضول نہ اٹھاتے اور کلام تو بہت بڑی چیز ہے غرض اس کو بھی چھوڑنا چاہیئے اگر کوئی تیرخواہ اس کو منع کرے کہ ناول بینی تو خیر مگر اس میں اخبار بینی بھی داخل ہے اکثر مضامین ان کے خلاف شرع ہوتے ہیں۔ ایک شخص نے اسی قسم کا مضمون ایک اخبار سے نقل کیا تھا کہ اس میں کسی نے لکھا تھا کہ نماز کو

اسلام سے نکال ڈالا جائے تو بہتر ہے کیونکہ یہ مانع ترقی ہے اس لئے جو کوئی سنتا ہے کہ اسلام لاکر پانچ وقت نماز پڑھنا پڑے گا تو وہ متوحش ہو کر اسلام سے ہٹ جاتا ہے۔ علی ہذا ناول کہ صریح اور پھر مضر جھوٹ ہوتا ہے اور جھوٹ جیسے بولنا منع ہے ایسا ہی لکھنا اور سننا بھی تو منع ہے۔ میں نے ایک دفعہ چند سطریں اخبار بینی کے متعلق لکھدی تھیں اخباروں میں مجھ پہ بڑی لتاڑ پڑی اڈیٹروں نے ہر طرف سے بڑا غل مچانا اور چیخنا چلانا شروع کیا کہ اخبار بینی کو حرام کہتے ہیں حالانکہ میں نے اسی تحریر میں حلال وحرام اقسام کی تفصیل کر دی تھی میں نے کہا کہ اس سے میری ایک دلیل اور بڑھی کہ اخباروں میں ایسی تہمتیں ہیں ایک صاحب اخبار میں لکھتے ہیں کہ جب سے یہ طاعون ملاعون ہندوستان میں پھیلا ہے یہ ملاعون کو نسا لغت ہے اس کی بالکل یہ مثال ہے جیسے کسی دہقانی گنوار نے کہا تھا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ اس نے کہا تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولھو اس نے کہا واہ وزن تو ملا ہی نہیں تیلی نے کہا کہ بلا سے نہ ملے بوجھ میں تو مرے گا یہ تو اس جاٹ سے بھی گیا کہ یہ مہمل لغت لکھدیا پھر طاعون کو ملعون کہنا کیا گناہ نہیں یہ کیفیت ہے اخباروں کی۔ مگر آجکل تو عالم وہی ہے جو اخباروں میں مضمون لکھے تو اس طرح کے مضامین اخباروں میں شائع ہوتے ہیں کہ طاعون کو ملعون کہدیا حالانکہ حدیث میں اس کو رحمت فرمایا ہے اور اس میں جو مرے اس کو شہید فرمایا ہے تو خدا کی رحمت کو ملعون کہنا کتنی بڑی گستاخی ہے اگر کوئی کہے کہ حضرت رحمت کیسے ہے تو دو طرح پر معلوم ہوتا ہے ایک تو یہ ہے کہ شہادت ہے یہ تو آخرت میں مشاہد ہوگی اور دنیا میں یہ مشاہدہ ہے کہ طاعون میں مرنے والے اور دوسرے مرض میں مرنے والے کو دیکھ لو تو تمھیں معلوم ہو جائیگا کہ زیادہ آثار خاتمہ بالخیر کے کس پر ہوتے ہیں طاعون میں مرنا اکثر ایسا دیکھا گیا ہے جیسا اولیاء کی وفات ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک اٹھارہ سال کا بچہ مولانا فتح محمد صاحب کی خدمت میں پڑھتا تھا دفعۃً بخار چڑھا اور تیز ہو گیا لوگوں نے اسی خیال سے کہ شکستہ دل نہ ہو اس سے کہا کہ تم کچھ خیال نہ کرنا اچھے ہو جاؤ گے۔ اس نے پیشانی میں بل ڈال کے کہا کیوں مت کہو اب تو خدا سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک لڑکا اسعد اللہ اس کا ہم سبق تھا اس کا ایک دن پیشتر دوسری بستی میں انتقال ہو چکا تھا لوگوں سے پوچھا وہ کیسا ہے سب نے کہدیا کہ اچھا ہے۔ اس نے عین وفات

کے وقت کہا تم بڑے چھوٹے ہو اس کا تو انتقال ہو گیا وہ میرے پاس بیٹھا ہوا ہے
ایک یہ کرامت اس کی دنیا ہی میں ظاہر ہوئی کہ عالم آخرت منکشف ہو گیا اور کشف بھی
صحیح تو اس کی وفات اولیاء اللہ کی سی وفات ہونے میں کیا شبہ ہے اسی طرح جتنے طاعونیوں
کو دیکھا سب کا خاتمہ اچھا ہوا۔ اس کو یہ ملعون لکھیں تو بتلایئے کہ جب اخباروں کی یہ حالت
ہو تو کیوں اس سے نہ روکا جائے مگر جو اس سے روکے اس کی کم بختی اس کی ممانعت میں قرآن
کی آیت موجود ہے وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ
يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔ (اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے یا جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے
ہیں اور ان کے اوپر حوالہ رکھتے تو اس کو وہ حضرات جو ان میں اس کی تحقیق کیا کرتے ہیں)
منافقین کی حالت بیان ہو رہی ہے کہ منافقین کی عجیب حالت ہے کہ اگر کوئی خبر ان کو پہنچتی
ہے اس کو بہت جلد اِدھر اُدھر شائع کر دیتے ہیں چاہے وہ خبریں پھیلانے کے قابل نہ ہوں
بتلایئے اخباروں کی یہی حالت ہے یا کہ نہیں پس جب اس کی ممانعت قرآن مجید سے بھی ثابت
ہو تو ہم کیوں نہ روکیں مگر یہ ان کے لئے ہے جو قرآن کے ماننے والے ہیں اور جو اس کو نہیں
مانتے تو اول میں اس سے خدا کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت منوا دوں گا
جب وہ اس کو تسلیم کر لے گا اس وقت قرآن مجید بھی اس کو ضرور ماننا پڑے گا پھر قرآن مجید
سے اس پر احتجاج ہو گا اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک جماعت باغی ہو جاوے
تو اول اس سے بادشاہ کا بادشاہ ہونا تسلیم کرایا جاوے گا پھر اگر اس کے بعد وہ کسی
حکم میں چون و چرا کرے گا تو اس سے اتنا کہنا کافی ہو گا کہ جب تم نے بادشاہ کی بادشاہی
تسلیم کر لی تو اب سنو کہ بادشاہ کا ہر حکم واجب الاطاعت ہوتا ہے اور یہ حکم بادشاہ کا
ہے بس اس کو بھی مانو اسی طرح جو قرآن کا منکر ہو گا اس سے اول توحید اور رسالت
کا ہم اقرار کرا لیں گے اس کے بعد بھی اگر وہ انکار کرے کہ قرآن کلام خدا تعالیٰ نہیں تو
اس کو ہم دلیل اعجاز سے ثابت کر دیں گے پھر احتجاج کریں گے غرض یوں ہی
قصے ہو رہے ہیں یہ ہے ہماری حالت یہ تو عام خبریں تھیں اور اگر کسی نے اپنی ہی
حالت پر نظر کی تو وہ بھی بے قاعدہ ہے کہ کہتے پھرتے ہیں کہ اَنَا مَدُّ فَوْقَ (میں دق کا

مریض ہوں) مگر علاج نہیں کرتے خلاصہ یہ ہے کہ اگر ناگواری پیش آئے تو بجائے اُس کو گاتے پھرنے کے اس کا علاج کرو اور علاج بھی ارزاں کچھ گراں نہیں ہے۔ اللہ میاں کا نسخہ حکیم محمود خاں کے نسخہ سے بھی گرا نہیں ہے طبیب کامل وہ کہلاتا ہے جو گھاس میں علاج کردے چنانچہ خدائے تعالٰے کے معالجہ میں ہلدی پھٹکری بھی نہیں لگتی بلکہ بہت ہی آسان ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کا دل ان کے اقوال سے تنگ ہوتا ہے آگے علاج بتلاتے ہیں کہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی تسبیح کیجئے حمد رب کے ساتھ اللہ کا نام لیجئے نفل پڑھئے یا ذکر کیجئے سب کو عام ہے وَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ بالخصوص سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جئے اور یہ جو ہم نے بتلایا یہ تو دوا تھی چنانچہ فا تفریعیہ اس کا قرینہ ہے اب آگے فرماتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایک غذا بھی ہے کہ اگر پریشانی اور تنگدلی بھی نہ ہو تب بھی اس کو کرتے رہو یعنی وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ پس یہ غذا ہے کہ موت کے آنے تک عبادت کرتے رہو غرض اس آیت سے علاج و غذا دونوں باتیں معلوم ہوئیں۔ باری تعالٰے نے یہاں تین صیغے اختیار کئے ہیں اور سب کا حاصل قریب قریب ایک ہے یہ صرف اختلاف عنوان ہے اور حاصل سب کا ایک ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰى وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ　　　وَكُلٌّ إِلَىٰ ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيرُ

(ہمارے عنوانات بیان مختلف ہیں مگر تیرا حسن ایک ہی ہے ہر عنوان اس حسن کی طرف اشارہ کرتا ہے)

بس عبارتیں مختلف ہیں اور حاصل سب کا ایک ہے یعنی مشغولی بحق خلاصہ یہ کہ اگر آپ پر تنگی آوے اور آپ کا دل تنگ ہو تو مشغول بحق ہو جئے یہ اس کا علاج ہے اول تو خدا تعالٰے نے یہ علاج بتلایا ہے تو اب اس کے لِم کی تحقیق کی ضرورت نہیں دوسرے ہر چیز میں لِم ہونا ضرور بھی نہیں بہت سی چیزیں مؤثر بالکیفیۃ ہوتی ہیں مثلاً مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے تو کیوں اس کی خاصیت یہی ہے وہاں لِم کوئی نہیں پوچھتا اور اگر شریعت میں اس کو بتلایا جاتا تو کہتے ہیں علت بتلاؤ وہاں کیوں نہیں علت پوچھی جاتی ایک شخص نے مجھ سے پوچھا نماز پانچ وقت کی کیوں فرض ہوئی اس میں کیا مصلحت ہے

میں نے کہا کہ تمہارے ناک آگے کیوں ہے پیچھے کیوں نہیں اس میں کیا حکمت ہے انہوں نے کہا کہ اگر پیچھے ہوتی تو بدنما معلوم ہوتی میں نے کہا کہ جب سب کے پیچھے ہی ہوتی تو کیوں بدنما معلوم ہوتی امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ افسوس ہے کہ اگر محمد ابن زکریا کچھ کہدے تو مان لیا جاوے اور اگر محمد بن عبداللہ کچھ کہیں تو اس کی تصدیق نہ کی جائے غرض جب یہ ثابت کر دیا کہ حق تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے پھر ہمیں ضرورت نہیں کہ ہر ایک حکم کی علت بتلائیں بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس میں خاصہ یہی ہے جو خدا تعالےٰ کے ارشاد سے معلوم ہوا جس طرح طبیب کے کہنے سے ادویہ کا خاصہ معلوم ہو جاتا ہے بلکہ جو ادویہ موثر بالکیفیت کہلاتی ہیں اگر غور کیا جاوے تو وہ بھی موثر بالخاصیت ہی ہیں مثلاً برودت کا علاج اجزاء حارہ سے کرتے ہیں اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ علاج بالکیفیت ہے مگر غور کرتے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علت نہیں کیونکہ اول تو علاج بالمثل بھی ہوتا ہے تو وہاں علۃ کہاں گئی اور شفا وہاں بھی ہوتی ہے معلوم ہوا کہ حرارت علۃ نہیں۔ دوسرے یہ کہ فالج زدہ کے لئے جو ادویہ گرم تجویز ہوں ان کا مزاج جس درجہ میں ہوتا ہے دوسرے میں یا تیسرے میں سو بہت سی ادویہ جو اسی درجہ میں گرم ہیں وہ دوائیں اگر دی جائیں تو وہ کیوں نہیں مفید ہوتیں اس کی وجہ پوچھو تو اختلاف خاصیت بتلایا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ وہ ادویہ مفیدہ بھی موثر بالخاصہ ہوتی ہیں کیفیت کا نام بدنام کیا جاتا ہے اور اگر تاثیر کیفیت کو مان بھی لیا جاوے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس کو بھی دخل ہے مگر اس میں محصور تو نہیں بس اگر اسی طرح ہم شرائع میں دعویٰ کریں کہ اس کی خاصیت یہی ہے تو کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا اور اس پر اکتفا کیوں نہیں کیا جاتا کہ قرآن میں ہے اور اس سے یہ نہ سمجھنا کہ علماء کو لم اور علل کچھ معلوم نہیں ہمیں سب کچھ معلوم ہے مگر اہل زمانہ کی رعایت ہے کہ بتلایا نہیں جاتا اور صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ قرآن میں ہے کیونکہ لم بتلانے سے اتنا نفع نہیں جس قدر مضرت ہے کہ رائے کا دروازہ کھلتا ہے سو ہمارے پاس سب کچھ ہے مگر بوجہ مذکور بتلانا مصلحت نہیں

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں ہے کہ معلوم نہ ہو)

مگر خیر ہم تبرعاً وجہ بھی بتلاتے ہیں سو وجہ اس یہ ہے کہ مشغولی بحق سے واقعات بھولتے ہیں اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ واقعات اتنے مؤثر نہیں ہوتے جتنا کہ مشغولی ہوا قعات مثلاً دو شخص فرض کیجئے کہ ان دونوں کے بیٹے مر گئے اب ایک نے تو بیٹھ کر وظیفہ رٹنا شروع کیا کہ ہائے بیٹے ہائے بیٹے اور ایک نے اتنا خیال نہ کیا چند دنوں کے بعد دیکھے گئے تو ایک سرخ و سفید اور ایک کالا زرد حالانکہ واقعہ ایک تھا معلوم ہوا کہ واقعہ مؤثر مشغولی سے ہوتا ہے اور بدون مشغولی کے طبعاً تو حزن ہوتا ہے مگر پریشان کرنے والا نہیں ہوتا پس تو معلوم ہوا کہ زیادہ پریشانی مشغولی سے ہوتی ہے پس اس علاج میں اس مشغولی کو دور کیا ہے اس طرح سے کہ مشغول بحق ہو جاؤ کیونکہ النفس لَا تَتَوَجَّہُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدٍ (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) اور اس کو سائنس والوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے تو عقلاً اور نقلاً یہ بات ثابت ہے کہ جب ہم مشغول بحق ہوں گے تو اس جانب سے توجہ گھٹے گی پس حزن کم ہو جاویگا تو عقلی طور پر بھی ثابت ہو گیا کہ دوسری طرف مشغولی علاج ہے ضیق کا آگے یوں سمجھو کہ جس طرف مشغول کیا گیا ہے جتنا محبوبیت میں قوی ہوگا اسی قدر اثر قوی ہوگا۔ اب یہ بات تحقیق کے قابل رہی کہ حق تعالےٰ زیادہ محبوب ہیں یا مخلوق تو دیکھ لیجئے کہ کسی سے جو محبت ہوتی ہے اس کی وجہ یا کمال ہے یا جمال ہے یا نوال ہے تو معلوم ہوا کہ محض ذات سے محبت نہیں کسی صفت کی وجہ سے ہوتی ہے تو اب دیکھو یہ صفتیں بالذات کس کی ہیں جس میں یہ اوصاف بدرجۂ اکمل ہوں گے وہ زیادہ محبوب ہوگا اب یہ رہ گیا کہ یہ اوصاف کس میں زیادہ ہیں تو اس میں مسلمانوں کو تو شبہ نہیں کہ سب سے زیادہ اور کمال کے ساتھ یہ اوصاف خدا ہی میں پائے جاتے ہیں اگر ظاہراً دوسرے میں ہیں بھی تو خدا میں بالذات ہیں اور غیر خدا میں بالعرض چنانچہ مخلوق میں بالعرض ہونا ہم آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ ہر شئے زوال پذیر ہے جو کل ساری دنیا پر حاکم تھے وہ آج تمام عالم کے محتاج ہیں جو کل حسن میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے ایک زمانہ ان پر وہ بھی آتا ہے کہ ان سے بدصورت دوسرا نہیں ہوتا الحاصل مخلوق کا اتصاف ان اوصاف کے ساتھ بالعرض ہے جن کو ہم اپنی آنکھوں دیکھ رہے ہیں اور خدا میں تمام یہ اوصاف بالذات علی وجہ الکمال ہیں اور بالعرض جو وصف ہوتا ہے وہ محتاج بالذات کا ہوتا ہے پس جب خدا میں یہ اوصاف بالذات ہیں تو ان کی محبوبیت قوی ہوگی

پس اگر محبوب جمال کی وجہ سے بنایا جاتا ہے تو خدا سے بڑھ کر کون جمیل ہے اور اگر کمال ونوال کی وجہ سے ہے تو خدا سے بڑھ کر کون صاحب کمال اور ذی نوال ہے بہر حال خدا سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں مگر لوگوں کو خبر نہیں اس لئے دوسری طرف مائل ہو جاتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص دیوار پر دھوپ دیکھ کر عاشق ہو جائے تو واقع میں تو آفتاب کا عاشق ہے لیکن اس کو خبر نہیں کہ نور آفتاب کا ہے اگر خبر ہو جاوے تو دیوار کی طرف التفات بھی نہ کرے اسی کو فرماتے ہیں ؎

عشق بامردہ نباشد پائدار عشق را باحی و باقیوم دار

(مردے کے ساتھ عشق کو پائیداری نہیں ہے اس لئے اس حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے)

اور مخلوق کے ساتھ جو عشق ہوتا ہے انجام اس کا یہ ہوتا ہے ؎

عشق ہائے کز پئے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

عاشقی بامردگاں پایندہ نیست زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

غرق عشقے شو کہ غرق ست اندریں عشقہائے اولین و آخریں

(جو عشق محض رنگ و روپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں بلکہ محض ننگ ہوتا ہے یعنی اس کا انجام حسرت و ندامت ہے مُردوں کے عشق کو بقا نہیں چونکہ مردہ پھر ہمارے پاس آنیوالا نہیں ہے عشق حقیقی میں غرق ہو جاؤ اس میں غرق ہونا اولین و آخرین کا عشق ہے)

آگے فرماتے ہیں کہ کسی کو یہ شبہ نہو کہ وہاں تک ہماری رسائی کہاں تو فرماتے ہیں کہ ؎

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست برکریماں کارہا دشوار نیست

(یوں نہ خیال کرنا کہ بھلا ہماری رسائی اس دربار تک کہاں کیونکہ وہ کریم ہیں اور کریموں پر کوئی کام دشوار نہیں)

یعنی تم کو ہراس و ناامیدی نہ ہونی چاہیئے بہت آسان ہے ؎

یعلم اللہ دو قدم راہست دیگر بیش نیست یک قدم بر نفس خود نہ دیگرے بر کوئے دوست (۹۲)

(اللہ تعالیٰ جانتے ہیں راہ سلوک دو قدم سے زیادہ نہیں ایک قدم اپنے نفس پر رکھو اور ایک دوسرا قدم

اور حاصل جواب کا یہ ہے کہ ہمارے کئے سے گو کچھ نہ ہوگا مگر وہ تو کریم ہیں وہ خود تم کو کھینچ لیں گے اور وصول دونوں طرح ممکن ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(قسمت نے اگر یاوری کی تو اس کا دامن پکڑلوں گا اگر میں نے اپنی طرف کھینچ لیا تو اچھا ہے اور اگر اس نے کھینچ لیا تو بہت ہی اچھا ہے)

البتہ طلب ادھر سے ہونا ضروری ہے پھر کام وہی بنا دیں گے اس کی ایسی مثال ہے کہ بچہ چل نہیں سکتا اور باپ کی طرف دوڑتا ہے آخر دو ایک قدم چلکر گر پڑتا ہے اور پھر دوڑ کر اس کو اس کا باپ گود میں اٹھالیتا ہے تو یہ جو مسافت قطع ہوئی لڑکے کے چلنے سے نہیں مگر اس نے کوشش تو کی گو گر پڑا تو یہ مسافت درمیانی جس کی حالت یہ ہے ؎

نگر دد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا جس طرح درخت انگور کو جتنا قطع کرو اور بڑھتا ہے) یہ ان ہی کے قطع کرانے سے قطع ہوگی اس لئے کہتے ہیں۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست برکریماں کارہا دشوار نیست

(یہ مت کہو کہ ہماری رسائی اس دربار تک کہاں ہوسکتی ہے کیونکہ کریموں پر کوئی کار دشوار نہیں ہے اگرچہ تم اپنی کوشش سے نہیں پہونچ سکتے مگر وہ کریم ہیں اپنے فضل کرم سے تم کو رسائی عنایت کردیں گے۔)

غرض محبوب حقیقی حضرت حق جل وعلا ہی ہیں مگر جن کو اطلاع نہیں وہ دیوار پر عاشق ہیں اور جب دھوپ گئی تو ہائے کیا ہوا جان نکل گئی۔

وہ چلا جان بھی چلی دونوں برابر کھسکے اس کو روکوں کہ اسے پاؤں پڑوں کس کس کے (جگر)

اور جن کی سمجھ میں آگیا کہ جمال حقیقی اور کچھ ہے یہ تو محض پرتو اور عکس ہے اور مستعار ہے کسی اصل سے وہ یہ پڑھیں گے ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

پرتو حسنت نگنجد در زمین و آسماں در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

ترجمہ (اپنے حسن کو حسینوں کے چہرہ میں ظاہر کیا ہے عاشقوں کی آنکھ میں اپنے کو تماشہ بنایا ہے)
ان لوگوں کو کسی چیز سے پریشانی نہیں ہوتی اور حزن طبعی اور بات ہے اسی مقام پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہونچے تو فرمایا اِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ (اللہ تعالیٰ ہی زندہ ہیں جو نہیں مریں گے) توحقیقت میں محبوب حقیقی حق جل وعلا کے سوا کوئی نہیں پس اس میں جو جتنا مشغول ہو گیا اتنا ہی زیادہ اس کی تنگی دور ہو گی۔ بس خدا کی مشغولی دافع ہے تمام بلیات وصدمات وغمہا کے لئے اور یہاں سے مسئلہ تصور شیخ کا بھی حل ہو گیا کہ تصور شیخ کی ہر ایک کو اجازت نہیں کیونکہ بعضے اس کو مثل مقصود بالذات کے قرار دے کر تصور کرتے ہیں حقیقت اس کی صرف اتنی ہے کہ ذاکر مبتدی کو جو کہ مذکور کا استحضار نہیں کر سکتا۔ جب وساوس ستانے لگیں تو شیخ کا تصور کر لے کہ اس طرف متوجہ ہو جانے سے دوسرے تصورات دفع ہو جاویں گے مگر یہ تصور جو ہو تو نہ اس طرح کہ یہاں موجود ہے بلکہ اس طرح کہ فلاں جگہ میں شیخ سے ملا تھا کیونکہ یہ تصور کرنا کہ یہاں موجود ہے ایک تو ایک گونہ بے ادبی ہے کہ گویا شیخ اس کے پاس آ کر حاضر ہو دوسرے جو اس سے مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہو گا کیونکہ یہ خلاف واقع ہے اور خلاف واقع پر دھیان نہیں جمتا اور بے دھیان جمے وساوس دفع نہ ہوں گے پھر اس میں عقیدہ حاضر و ناظر کا بھی ہو گا اور اس میں احتمال شرک کا ہے غرض اس طرح سے تصور کرے چونکہ شیخ بہ نسبت اوروں کے زیادہ محبوب ہوتا ہے اس لئے حضرات صوفیہ دفع وساوس کے لئے اس کو تجویز فرماتے ہیں پھر جب خطرات دفع ہو جاویں تو اس تصور کو ترک کر دینا چاہئے خلاصہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے تصور کر لے کیونکہ مشغولی بشیخ عارضی ہے اصل مقصود تو حق تعالیٰ کی مشغولی ہے۔ یہاں بعضے قلوب میں یہ وسوسہ پیدا ہوجاتا ہے کہ شیخ کی طرف جتنا ہمارا دل کھینچتا ہے خدا کی طرف نہیں کھینچتا تو اس میں مجکو گناہ ہوتا ہو گا تو سمجھ لو کہ یہ محبت طبعی ہے اور خدا کے ساتھ محبت عقلیہ زیادہ ہونی چاہیئے سو وہ حاصل ہے چنانچہ اس شخص سے اگر کوئی اس کا بڑا محبوب یہ کہے کہ اگر خدا سے تعلق رکھو تو ہم سے نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر ہم سے رکھنا چاہو تو خدا کو چھوڑ دو تو اس وقت یہ شخص یہی جواب دے گا کہ ہمیں تم سے تعلق رکھنا منظور نہیں۔

روز ہا گر رفت گو رو باک نیست　　تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنی چاہیئے اگر گئے بلا سے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اسکا رہنا کافی ہے)
پس وہ شبہ دفع ہوگیا خلاصہ یہ ہے کہ جب تنگی ہو تو فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی خدا کے ساتھ مشغول ہو اس
مشغولی بحق سے تنگی جاتی رہے گی اب یہاں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حق تعالیٰ کی یاد سے جمعیت دل ہوتی ہے اور
یہاں جمعیت سے وہ مراد نہیں ہے جو ایک دوسری آیت میں مذکور ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (اللہ
تعالیٰ کے ذکر ہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں) یہاں پر اس کی تفسیر سیاق وسباق سے اور معلوم ہوتی ہے کہ اطمینان سے
وہ اطمینان مراد نہیں جو ضیق کا مقابل ہے یہاں پر دوسرا اطمینان مراد ہے کہ جس کا ایمان نام ہے چنانچہ قرینہ سیاق
بالوعدہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ
يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ ان کے رب کی طرف سے کیوں نہیں
نازل کیا گیا آپ کہدیجئے کہ واقعی اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گمراہ کر دیتے ہیں اور جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کو
اپنی طرف ہدایت کر دیتے ہیں) آگے فرماتے ہیں بطور مَنْ اَنَابَ کے بدل کے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ
بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یعنی مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان
کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوجاتا ہے) جب یہ من
اناب کا بدل ہے تو اس کے ساتھ متحد ہے اور من اناب بوجہ تقابل ضلال کے بمعنے مہتدی ومؤمن ہے پس یہ
اطمینان متحد ہوا ایمان کے ساتھ اور سیاق بالتحیتہ یہ ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ
مَاٰبٍ (جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے خوشحالی اور نیک انجامی ہے) اور اصل معنی اطمینان
کے سکون کے ہیں اور سکون دو طرح کا ہوتا ہے ایک سکون عقلی دوسرا سکون طبعی پس یہاں اطمینان سکون
عقلی کے معنی میں ہے پس مقابل ضیق کا نہیں کیونکہ ضیق امر طبعی ہے پس یہ تو اطمینان کفر کے مقابل ہے پس طبعی
نہیں اور قرآن میں دونوں استعمال موجود ہیں چنانچہ فرماتے ہیں وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ یہاں سکون
عقلی ہے اور ایک جگہ طبعی ہے ابراہیمؑ کے قصے دعائے احیائے موتیٰ میں بعضے اس کی تفسیر نجاننے سے غلطی میں
پڑ جاتے ہیں۔ ایک کورٹ انسپکٹر یہ آیت دیکھ کر کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ارشاد فرمایا
(کیا تم یقین لائے انھوں نے عرض کیا یقین کیوں نہیں لاتا لیکن یہ درخواست اس غرض سے ہے کہ میرے قلب کو سکون ہوجائے)
کہنے لگے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کو احیاء میں اطمینان نہ تھا شک تھا تو ان کے اس شبہ کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ

عہ قلب اس کا ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

اس آیت میں اطمینان کو مقابل شک کے سمجھے یعنی اطمینان عقلی سمجھ گئے سو یہاں بمعنی اطمینان طبعی مستعمل ہے اور شک کی نفی تو اَوَلَمْ تُؤْمِنْ (کیا تم یقین نہیں لائے) کے جواب میں ان کے بلیٰ کہنے سے ہوگئی اور حاصل اس بے اطمینانی طبعی کا یہ ہے کہ ان کو یہ تو یقین تھا کہ احیا ہوگا مگر اس کی کیفیت میں جو کئی احتمال تھے اور کسی کیفیت کا مشاہدہ نہ ہوا تھا اس لئے اس کی تعیینی میں تردد تھا اس کو عدم اطمینان فرمایا کیونکہ یہ اطمینان مشاہدہ ہی سے ہوتا ہے کہ طبعاً سکون ہو جاوے کہ یہ کیفیت واقع ہوئی ہے یہ ان کو بھی جواب دیا بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے واقعی ترجمہ سے قرآن سمجھنا بہت مشکل ہے یہ اثر سدا ہوتا ہے محققین کے پاس رہنے سے ورنہ کتنا بڑا شبہ تھا ابراہیمؑ کو تو اطمینان نہ تھا تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ سے اور قَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيْمَانِ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ادنیٰ مومن کو اطمینان حاصل ہے تو اس کو اتنا بڑا درجہ ملا کہ جو ابراہیمؑ کو بھی حاصل نہ تھا تو اس تحقیق سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اطمینان کے دو درجہ ہیں پس اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (جو لوگ ایمان لائے) میں اطمینان قلبی مراد ہے وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (تاکہ میرے دل کو سکون ہو جائے) میں اطمینان طبعی اور ضیق کا علاج یہی اطمینان طبعی ہے جو مشغولی بحق سے پریشانی کے رفع کرنے میں موثر ہے گو اور بہت امور میں تردد کو رفع نہ کرے مثلاً احیا موتیٰ کی کیفیت میں اب ایک اور قوی شبہ باقی رہ گیا وہ یہ کہ فرماتے ہیں اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے آپکی خاطر آپ کا سینہ (علم و حلم سے) کشادہ نہیں کر دیا،) تو کیا شرح صدر کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگی معلوم ہوئی سو سمجھ لو کہ یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ (واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں آپ اس سے تنگدل ہوتے ہیں) سو ضیق کی دو قسمیں ہیں ایک تو یہ کہ جیسے عوام کو ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کبھی نہیں ہوا اور ایک یہ کہ نہایت ضعیف ہو سو یہ ہوا۔ مگر یہ شرح صدر کے منافی نہیں دیکھو آپ کو زکام ہوگیا اور وہ بھی معمولی تو آپ بھی مریض ہیں اور ایک مدقوق ہے وہ بھی مریض ہے مگر آپ کی بیماری عادۃً صحت کے منافی نہیں کیونکہ صحت غالب ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ضیق بھی نہایت خفیف ہوتا تھا جو شرح صدر کے منافی نہیں اب ایک بات اور عجیب قابل تحقیق باقی رہی وہ یہ کہ اطمینان جب حاصل ہوگا تو آیا ضیق زائل ہو جائیگا یا مغلوب ہو جاوے گا تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ ضیق زائل نہیں ہوتا بلکہ مغلوب ہو جاتا ہے جس طرح انسان کے اندر سب اخلاط موجود ہیں تو جب صفرا بڑھ جاتا ہے مسہل کی ضرورت پڑتی ہے مگر مسہل صفرا کو بالکل نہیں نکال دیتا اور اگر بالکل صفرا دیت نہ رہے تو پھر خیریت نہیں حق تعالیٰ نے جب طبیعت عطا فرمائی ہے تو اس کے خواص لازمہ بھی عطا فرمائے ہیں ورنہ انتفاء لازم سے انتفاء ملزوم

ہو جاتا غرض زائل نہیں ہوتا ہے ہاں مغلوب ہو جاتا ہے اور اس تحقیق سے ایک بڑا تردد سالکین کا دفع ہوا وہ یہ کہ وہ بعض اوقات بعد مجاہدہ کے بھی بعضے امور طبعیہ مذمومہ کا اثر اپنے اندر پاتے ہیں اور اس سے مجاہدہ کے بیکار ہونے کا گمان کر کے مایوس ہو جاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر اخلاق ذمیمہ مغلوب ہو جاویں کہ ان کے اقتضاء پر عمل کرنے کو باسانی ترک کر سکیں یہ کافی ہے زوال کی توقع نہ رکھیں ورنہ پھر ثواب اور فضیلت ہی کیا ہے یہ امور ذوقیہ تھے جو درمیان میں عرض کر دیئے گئے خلاصہ اور اصل مسئلہ یہی ہے کہ ضیق کا مشغولی بحق سے علاج کیا گیا ہے آپ خود بھی دیکھ لیجئے کہ مشغولی بحق سے پہلا واقعہ بھول جائیں گے یا نہیں اور میں یہ بتلا چکا ہوں کہ واقعتاً پریشان و محزون نہیں بناتا بلکہ مشغولی بواقعہ پریشان کرتی ہے اور مشغولی بحق سے وہ مشغولی توجہ نہیں رہتی اس لئے پریشانی نہ رہے گی مگر شاید کوئی کہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ مشغولی بحق کے بعد بھی واقعہ کی طرف توجہ رہتی ہے سو جواب یہ ہے کہ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ واقعہ بالکل ہی یاد نہ رہیگا بلکہ اس کی طرف جو توجہ ہے وہ ضعیف اور مغلوب ہو جاویگی اور اثر مطلوب کے لئے یہی کافی ہے اور کمال بھی انسان کا اسی میں ظاہر ہوگا کہ موجود ذہن میں وہ بھی ہے پھر توجہ بحق کو اس پر غالب کر دیا مثلاً دو پہلوان کشتی کرنے کے لئے نکلے آپ بیچ میں آگئے آپ نے ایک کو تو اُلٹے پاؤں بھگا دیا۔ دوسرا رہ گیا یہ تو کچھ کمال نہیں کمال قوت تو جب تھا کہ دونوں لپٹے رہیں اور آپ بیلدار رہیں کہ جب ذرا ایک نے دوسرے کو گرانا چاہا آپ نے اس کو مغلوب کر دیا اسی طرح یہاں دو پہلوان ہیں مشغولی بحق مشغولی بواقعہ ان میں سے ایک پہلوان بھاگ گیا تو پھر آپ کا کیا کمال ہوا کمال تو یہ ہے کہ دونوں مستعد ہیں مگر جہاں ذرا اس نے اپنا اثر کرنا چاہا آپ نے فوراً اس کو مغلوب کر لیا متقین مبصرین کی یہی شان ہوتی ہے کہ جہاں ذرا شیطان نے اپنا اثر کرنا چاہا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (پس اس وقت وہ مبصرین ہیں) کہ فوراً ان کی آنکھ کھل جاتی ہے اہل کمال کی یہی حالت ہوتی ہے اسی سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ کتنی ہی توجہ الی اللہ بڑھ جائے مگر پھر بھی میلان الی النساء اور محبت جاہ و مال ضرور رہتا ہے اور یہ تو انتہا تک ساتھ رہتا ہے تو توجہ الی اللہ سے توجہ الی الغیر کہاں زائل ہوئی تو یہ سمجھ کی غلطی ہے ہمارے ناقصین کی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پورے ولی وہ ہیں جو ہگا بھی نہیں کرتے نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے نہ ان کو کسی قسم کی خواہش ہوتی ہے تو یہ ولی کیا ہوئے جماد محض ہوئے نہیں کاملین میں سب کچھ ہوتا ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّمَا اَنَا

بَشَرٌ اَغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُوْنَ (میں بشر ہوں غصہ کرتا ہوں جیسا کہ لوگ غصہ کرتے ہیں) وہ کھاتے بھی ہیں پیتے بھی ہیں جورو بھی رکھتے ہیں لیکن یہ سب جذبات ان میں مغلوب ہوتے ہیں کہ ان کو رضا حق سے نہیں نکلنے دیتے مگر جو ناواقف ہیں ان کو دھوکا ہو جاتا ہے اور وہ اسی خبط میں رہتا ہے کہ ایسے بزرگ سے مرید ہو کہ جس کا تصرف بھی ہو اور اگر کسی کو شیخ صاحب تصرف مل گیا اور اسکی تعلیم سے قدرے محویت کی حالت ہوگئی تو بس وہ بزعم خود نبی ہی بھی بڑھ گیا اسی غلطی کے سبب لوگ جذب کو سلوک پر ترجیح دیتے ہیں استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جبتک ہم بے عقل و مدہوش رہے تو کمال ہی کیا ، صاحبو اللہ تعالیٰ کا نام تو ہوش بڑھانے کیواسطے لیا جاتا ہے نہ کھونے کے لئے ہاں اسکے دو طریقے ہیں کہ کبھی گھٹ کر بڑھتا ہے کبھی بغیر گھٹے اور یہ فرق مزاج کے اختلاف سے ہوتا ہے مثلاً ماء اللحم سے قوت بڑھتی ہے مگر ایک شخص کو تو ابتدا ہی سے دیدیا جاتا ہے جس میں مادہ فاسدہ نہ تھا اور ایک کو مسہل کے بعد دیا جاتا ہے جس میں مادہ فاسدہ ہو مگر مقصود سب کو قوت پہونچانا ہے اسی طرح جن کو ضرورت بیہوش کر کے ہوش میں لانے کی ہوتی ہے ان کو اول بیہوش کیا جاتا ہے پھر ہوش دیا جاتا ہے اور بعض کو اول سے ہی ہوش بڑھنا شروع ہو جاتا ہے ۔ بہر حال استغراق خود مقصود نہیں ۔ خواجہ عبید اللہ احرار فرماتے ہیں کہ استغراق میں قرب نہیں بڑھتا کیونکہ اسمیں عمل نہیں ہوتا جو مدار قرب ہے تو حقیقت میں جو ذی استعداد کامل ہیں ان پر نفسانی کیفیات طاری نہیں ہوتی ہاں روحانی کیفیات کہ جن کا اثر روح پر ہوتا ہے کاملین پر وہ کیفیات طاری ہوتی ہیں جن کا عوام کو پتہ بھی نہیں اور ان دونوں میں وہ فرق ہے جیسے گڑ اور فیرینی کی شیرینی میں کہ چار کسی کی بیگار میں گئے اس نے فیرینی کھلائی تو چاروں نے ناک مار کر کھالی مگر چودھری کہتا ہے یہ تھوک سے کیے ہے اس کو مٹھائی مدرک نہیں ہوئی کیونکہ اسنے کبھی فیرینی کی بو بھی نہ سونگھی ہوگی اس کے نزدیک تو مٹھائی گڑ ہے تو واقعی جو سالکین منتہی کیفیات ہیں وہ دیہاتی گڑ خوار ہیں میں تو کہتا ہوں کہ کام میں لگو کیفیات کی ہوس چھوڑو پھر دیکھئے کہ ایک دن وہ کیفیات نظر آئیں گی کہ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ اَحَدٍ (نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنی نہ کسی کے دل پر گذری) مگر تفصیلی تنبہ ان پر شیخ کے متنبہ کرنے سے ہوگا البتہ اجمالی تنبہ اس پر اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ ابتدائے ذکر کے وقت جو کیفیت تھی اس کو نہ بھولنا پھر دو برس کے بعد دیکھنا کہ اب کیا حالت ہے خود تفاوت معلوم ہوگا تم چاہتے ہو آج ہی سب کچھ ہو جائے ایک بچہ کو دیکھئے کہ جتنا آج اتنا ہی کل دو ایک دن میں کوئی قابل امتیاز تفاوت نہیں ہو جاتا مگر اسی بچہ کو دس برس کے بعد دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہاں اس کو نشو و نما ہوا ہے غرض کیفیات روحانیہ تو ضرور ہوتی ہیں مگر کیفیات نفسانیہ ضرور نہیں کسی کو ہوتی ہیں کسی کو نہیں

چنانچہ بعضوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب غلبۂ ذکر ہوتا ہے تو بھوک پیاس تک چھین لگتی نیند نہیں آتی یہ سمجھا کہ یہ ثمرہ ذکر کا ہوا کہ سب چیزوں کی شہوت جاتی رہی خوش ہوا اس کے بعد جب کیفیت جوش کی گھٹی اور ان امور طبعیہ نے عود کیا تو مغموم ہے تو یہ ناواقفی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ جوش و خروش قائم نہیں رہتا حدیث میں ہے کہ ہر جوش میں ضعف ہوتا ہے ان جوشوں کے فرو ہونے کے بعد پھر روحانی کیفیت بڑھتی ہے وہ البتہ دائم ہوتی ہے ؎

خود قوی تر می شود خمر کہن ٭ خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب میں خود تیزی بڑھتی جاتی ہے خاصکر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہو)

ان کیفیاتِ نفسانیہ کا غلبہ عروج تھا اور ان کیفیات روحانیہ کا غلبہ نزول ہے غرض ان کیفیات نفسانیہ کے سکون کے بعد بعض آثار طبعیہ کا عود موجب اشتباہ نہ ہونا چاہیئے کیونکہ مقصود ازالہ طبعیات کا نہیں ہے عدم غلبہ کا ہی ہے بالکل لوگ پاگل ہو جاتے ہیں اسی کو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ زائل نہیں ہوتے بلکہ یہ امور طبعیہ مغلوب ہو جاتے ہیں اور آیت میں جو علاج ہے اس کا یہی حاصل ہے کہ گو تنگی رہے مگر مشغولی بحق سے وہ موذی نہ ہے خود مشغولی بحق سے بھی اور اس استغفار سے بھی کہ یہ بھی من الحق ہے اس کو مثال سے سمجھئے آپ کے بدن میں ایک دشمن نے چٹکی لی تو جھلا گئے اور محبوب نے چٹکی لی تو آپ اپنے سے زیادہ خوش نصیب کسی کو نہ سمجھیں گے اور لیجئے ایک شخص نے آپ کو زور سے دبوچا تو تکلیف کس قدر ہو گی اور فرض کیجئے کہ آپ کا محبوب اس طرح دبوچے تو بھی اس کا اثر بدن پر تو ضرور ہو گا مگر دل پر مسرت کے آثار نمایاں ہونگے بس ایک وہ تنگی ہے اور ایک یہ تنگی ہے مگر دونوں میں فرق زمین و آسمان کا ہے اسی طرح مشغولی بحق کی حالت میں بھی گو واقعات سے تنگی ہوتی ہے مگر یہ ایسی تنگی ہے جس سے دل مسرور ہے مثلاً اسی حالت میں جبکہ محبوب نے آپ کو بھینچ رکھا ہو اور کوئی رقیب کھڑا ہوا ور وہ محبوب آپ سے کہے کہ اگر تکلیف ہوتی ہو تو مجھ کو چھوڑ کر اس کو لپٹ جاؤں تو آپ یہی جواب دیں گے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ٭ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

کبھی قیامت تک بھی اس پر راضی نہ ہو گے اسی طرح مشغولی بحق کی حالت میں بھی تنگی ہو مگر قلب و روح پر نہیں صرف طبیعت و جسم پر ہوتی ہے اور وہاں راستہ ہی نہیں ملتا کہ قلب تک پہونچے وہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِ التَّائِہِ ٭ وَھَوَی الْاَحِبَّۃِ مِنْہُ فِیْ سَوْدَائِہٖ

ترجمہ (ملامت گروں کی ملامت تو دل کے چاروں طرف رہتی ہے اور دوستوں کی محبت سویدائے قلب میں ہے)
یعنی محبت تو قلب کے اندر رہتی ہے اور ملامت باہر تو بس اس قسم کی تنگی رہ گئی ہے یہ حاصل ہے
علاج کا اور اس علاج کو حق تعالیٰ نے بہت جگہ بیان فرمایا ہے ایک جگہ فرمایا ہے وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ
بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (اور آپ اپنے
رب کی تجویز پر صبر سے بیٹھے رہیئے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں اور اٹھتے وقت اپنے رب کی
تسبیح و تحمید کیا کیجئے اور رات میں اس کی تسبیح کیا کیجئے اور ستاروں کے پیچھے بھی) اور ایک
جگہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (اپنے رب کی تسبیح کیا
کیجئے آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے بھی اور غروب ہونے کے بعد بھی) کیونکہ یہ علاج
بہت نافع تھا اس لئے متعدد جگہ بتلا دیا تاکہ غافل بھی اس سے غافل نہ رہے مگر افسوس اس کی
قدر نہ کی اور وہ احمق جن کو تصنیف کا سلیقہ نہیں اس تکرار پر اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید
میں تکرار ہے صاحبو مکررات قرآن میں عین شفقت ہے دیکھو ایک تو حاکم کا اعلان ہوتا ہے
کہ ایک مرتبہ اعلان کر دیا کہ کوئی گھر کے سامنے کوڑا نہ ڈالے اور ایک باپ کا کہنا ہوتا ہے کہ ایک
مرتبہ کہا نہ مانا پھر تنبیہ کرتا ہے پھر نہ ماننے پر کہتا ہے تو ان دونوں کے کہنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے
باپ کا بار بار کہنا شفقت سے ہے اور اعلان حاکم میں شفقت نہیں تو قرآن مجید میں مکررات بوجہ
شفقت خداوندی کے ہیں اور کیوں نہ ہو جبکہ اس کو ہم پر ہمارے والدین سے زیادہ شفقت ہے
مگر افسوس تم نے اس شفقت کی قدر کی اور پھر اپنی خبر نہیں صاحبو اگر نفی تکرار موجب نقص ہے
تو تم اپنے اعتراض کو پچاسوں مرتبہ کیوں دہرلتے ہو خیر یہ تو لطیفہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ تکرار محض
شفقت کی وجہ سے ہے تو اس علاج کو شفقت سے حق تعالیٰ نے کئی جگہ بتلایا ہے میرا مقصود مستورات
کے مجمع میں اس قسم کا بیان نہ تھا مگر اتفاق سے دقیق ہو گیا۔ خیر میں اب عورتوں کے متعلق کچھ بیان
کرتا ہوں کہ اگر کچھ تنگی ہوا کرے تو اس کا علاج خدا کی یاد سمجھ لو اور اس کو دستور العمل بنا لو کہ مثلاً جب چوری ہو جائے
طاعون آجائے جو بھی شکایت ہو اس کا علاج یہ مت کرو کہ گاتے پھرو بلکہ خدا کی یاد سے علاج کرو اور یہ نہ سمجھنا کہ خدا
کی یاد کرنا تیو الا ہی ہے جو ذاکر کہلاتا ہے نہیں بلکہ جس طرح ہو سکے ہر طاعت اس میں داخل ہے اور یہ بھی نہ کرو کہ زبان
سے صرف سبحان اللہ سبحان اللہ رٹتے رہو اور دل پر اس کا اثر نہ ہو ایسی تسبیح کا معتد بہ اثر نہیں ہوتا ہے

برزباں تسبیح در دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

(زبان پر تسبیح دل میں گاؤ خر یعنی دنیاوی خیالات ایسی تسبیح کب اثر رکھے)

بلکہ زبان سے قلب سے ہاتھ پاؤں سے سب سے ذکر کرو چنانچہ زبان کا تو ذکر یہ ہے کہ بکثرت تسبیح وتہلیل پڑھو اور قلب کا ذکر یہ ہے کہ اس کی نعمتیں یاد کرو اس سے یعنی تذکر نعم سے انفع اور کوئی طریقہ نہیں ہے موٹی بات ہے کہ نعمتیں مقدار میں مصیبتوں سے بڑھی ہوئی ہیں دیکھو اگر مرض بھیجا ہے تو اسکی دوا بھی پیدا فرمائی ہے ؎

درد از یار است و درماں نیز ہم دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(درد بھی دوست کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی طرف سے ہے اس پر میرا دل بھی فدا ہے اور جان بھی)

یعنی درد بھیجا تو درمان بھی بھیجا فرض کرو اگر مرض ہوتا اور علاج نہ ہوتا دوا نہ ہوتی طبیب نہ ہوتا تیمار دار نہ ہوتے تو کچھ دشواری ہوتی یا نہیں ہمیں اپنے خدا سے محبت ہے تو ایسی حالت میں بھی کچھ نہ ہوتا پھر بھی ہمیں ہراساں نہ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ؎

درد از یار است و درماں نیز ہم دل فدائے او شد و جان نیز ہم

(درد بھی دوست کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی طرف سے ہے اس پر میرا دل بھی فدا ہو اور جان بھی)

ہرچہ می گویند آں بہتر ز حسن یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

(اس کے حسن سے جو کچھ لوگ بیان کرتے ہیں وہ اس سے بہتر ہے ہمارا محبوب یہ رکھتا ہے اور وہ بھی)

اور پھر علاج کرنے والے بھی وہ کہ جو آپ کے مزاج شناسا تیمار دار ایسے نہ جو دل سے یہ چاہیں کہ میں بیمار ہو جاؤں اور یہ اچھا ہو جاوے تو ایسے معالج و خیر خواہ خدا نے پیدا کئے کہ اگر ہزار روپے بھی تنخواہ دی جاوے تو یہ ہمدردی ممکن نہیں کہ جو کہیں اس کے بجا لانے کو تیار ہر طرح حاضر کہ جس سے ہر وقت قوت دل بڑھتی رہے کہ یہ خود بھی علاج ہے۔ چنانچہ بالاتفاق اور طبیب کہتے ہیں کہ قوت قلب سے مرض دفع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ والد صاحب نے مجھے الہ آباد سے کانپور لکھا کہ میں سخت بیمار رہوں تم چلے آؤ میں گیا تو دفعۃً آنکھیں کھول دیں اور پندرہ منٹ میں مجکو اپنی ساتھ بازار لے گئے کہ امرود یہاں کے بڑے نفیس ہوتے ہیں اور فرمایا کہ تمھیں دیکھ کر اچھا ہو گیا۔ حدیث شریف میں تاکید ہے کہ جب بیمار کے پاس

جاؤ تو تَفَسَّحُوا لَهٗ فِی اَجَلِهٖ یعنی اس کو تسلی دو کہ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے یا ابھی تمہارا وقت نہیں آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مریض کی عیادت کو تشریف لے گئے تو فرمایا لَا بَاْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللہُ اس احمق نے کہا بَلْ حُمّٰی تَفُوْرُ عَلٰی شَیْخٍ کَبِیْرٍ کیوں نہیں بڈھے آدمی کو بخار چڑھا ہے میں ضرور اچھا نہ ہونگا آپ نے فرمایا اچھا ایسا ہی ہوگا بالآخر وہ مرگیا فال بد ایک قسم کی ناامیدی ہے رحمت حق سے سو کبھی اس کا اثر برا ظاہر ہوتا ہے ہمارے وطن میں ایک لڑکی ہے بچپن میں جب اس سے کوئی کہتا کہ تیرا بیاہ کب ہوگا تو کہتی کہ بس کیا ہوگا آخر اس کے بیاہ کی ایسی مشکل پڑی کہ اللہ اللہ کر کے بڑی مدت میں ہوا (اس وعظ کے آٹھ مہینے بعد) مزن فال بد کاورد حال بد: (فال بدمت لو کہ برا فال لاتی ہے) غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی کے لیے حکم فرمایا کہ طبیعت میں قوت بڑھے ایک اور بات مریض کی طبیعت کی رعایت سے فرمائی کہ مَنْ عَادَ مِنْکُمُ الْمَرِیْضَ فَلْیُخَفِّفِ الْجُلُوْسَ (یا اور کوئی لفظ ہوں) یعنی مریض کے پاس تھوڑا بیٹھو کیونکہ طبعی بات ہے کہ بے تکلفی ہر ایک سے نہیں ہوتی اگر کوئی آکر پاس بیٹھا تو اب مثلاً اس کی طرف پاؤں نہیں پھیلاتا پشت نہیں کرتا ادب کی وجہ سے اور اس سے اس پر بوجھ پڑتا ہے اور تکلیف ہوتی ہے فقہاء نے خوب لکھا ہے کہ بعض لوگ بعض دنوں میں عیادت کو منحوس سمجھتے ہیں تو اس دن میں ان کی عیادت نہ کرو کیونکہ ایک تو اس وقت اس کو اذیت ہوگی دوسرے اگر اس کو کوئی ضرر پہونچ گیا تو اور زیادہ عقیدہ خراب ہوگا اور یہ وقت اس کے جہل کے علاج کا وقت نہیں یہ مرض کے علاج کا وقت ہے پھر دوسرے وقت سمجھا دینا مگر عیادت کے جلسہ میں غرض عیادت میں خلل کیوں ڈالتے ہو تو ہمارے فقہاء نے عجیب وغریب حقائق سمجھے ہیں واقعی فقیہ بننا ہر ایک کا کام نہیں کثرت روایت سے فقیہ نہیں ہوتا فقہ اس کا نام ہے حافظؒ نے خوب کہا ہے ؎ [1]

نہ ہر کہ چہرہ برا فروخت دلبری داند ۔۔۔ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(جو شخص بھی چہرہ کو آراستہ کرے لازم نہیں کہ دلبری بھی جانتا ہو جیسے جو شخص آئینہ بناتا ہو لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو یعنی جس نے کاملین کی وضع اختیار کی ضرور نہیں کہ کامل بھی ہو)

ہزار نکتۂ باریکتر ز مو اینجاست ۔۔۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(یہاں بال سے بھی زیادہ باریک ہزاروں نکتے ہیں قلندری ہر وہ شخص نہیں جانتا جو سر منڈاتا ہو)

---

[1] یہ کمال احتیاط بالروایت ہے ۱۲

صاحبوا یہ انھیں حضرات کا کام تھا کہ بخاری اور ترمذی سے مسائل استنباط کریں۔

غرض نعمتوں کے یاد کرنے سے بھی تنگی خاص طور پر دور ہوتی ہے اور قلب کی یہ بھی یاد ہے کہ وطن اصل کو یاد کرو کہ وطن اصلی کی یاد سے بھی تنگی دور ہو گی اور ہمارا وطن اصلی آخرۃ ہے تو مصیبت کے وقت آخرۃ کی باتوں کو یاد کرنا چاہیئے وہاں کے ثواب و عذاب پر غور کرنا چاہیئے فرماتے ہیں وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ (اور آخرت میں سخت عذاب ہے) وَمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگانی محض دھوکہ کا اسباب ہے) اور ایک جگہ ہے وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَھْوٌ وَّلَعِبٌ وَّاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (دنیوی حیات محض لہو ولعب ہے اور اصلی زندگی عالم آخرت ہے اگر ان کو اس کا علم ہوتا) یعنی اصل حیوٰۃ دار آخرۃ کی ہے اور حیاۃ دنیا عارضی ہے افسوس اس کو حیاۃ نہ سمجھا بلکہ اس کا نام موت رکھا البتہ جو لوگ حقیقت سمجھ گئے وہ یہ کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویران بروم | راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر ایں غم بسر آید روزے | تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

(وہ دن مبارک ہے جس روز میں اس دنیائے فانی سے کوچ کروں راحت جان طلب کروں اور محبوب حقیقی کے لئے جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش وخرم اور شعر پڑھتا ہوا جاؤں)

؎ خوشا وقتے وخرم روزگارے | کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصل سے مستمتع ہو)

پس وہ موت سے خوش ہیں اس کی تمنا کر رہے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی ہے پھر یہ سوچو کہ یہاں کیا ہے یہاں عیش کا کون سا سامان ہے جو وہاں نہیں اور یہاں جو سامان ہے اس سب کا منغص کرنے والا خوف انقطاع ہے ع گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی ۔ بخلاف عیش آخرت کے کہ اگر معصیت نہ کی تب تو لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (نہ ان پر کچھ خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے) وہاں ہر سامان عیش موجود ہے فِیْھِمَا فَاکِھَۃٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ (ان دونوں باغوں میں میوے اور کھجوریں اور انار ہوں گے) اور فِیْھِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ لَمْ یَطْمِثْھُنَّ اِنْسٌ قَبْلَھُمْ

وَلَاجَانّ اور مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ (ان میں خوبصورت عورتیں ہوں گی وہ عورتیں گوری رنگت کی ہوں گی اور خیموں میں محفوظ ہوں گی ان لوگوں سے پہلے نہ کسی آدمی نے ان پر تصرف کیا ہوگا نہ جن نے وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے مشجر شاید کسی کو یہ شبہ ہوتا کہ اور تو سب چیزیں ہونگی مگر گہنا پہننا نہ ملے گا اور بعضوں کا تو یہاں بھی پہننے کو جی چاہتا ہے ایک مولوی صاحب بڑے گوٹے پٹھے کے کپڑے پہننے کی تمنا کیا کرتے تھے پنکھے میں گوٹہ ٹکوالیا کرتے تھے وجہ یہ تھی کہ نابینا سے بینا ہوئے تھے سو اللہ تعالیٰ نے زیور پہننے کی بھی خبر دیدی کہ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا کہ وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے) کہ خوب پہنو اب کیا چاہتے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہاں موتیوں کے مکان و باغ ہیں کہ جن میں نہریں جاری ہیں اور وہاں کی نعمتوں کا کیا بیان ہوسکتا ہے ان کی نسبت اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ (میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی چیزیں تیار کیں ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں نہ کسی آدمی کے دل پر گذریں) اور جو کچھ نام و نشان آئے ہیں وہ صرف مشابہت پر مبنی ہے ورنہ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک ؎ اور وہاں ایک عجیب لطف ہوگا کہ بہت سے میوؤں کی صورت یکساں ہوگی اور مزہ مختلف چنانچہ ارشاد ہے وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا کہ جنت کے میوہ جات صرف رنگ واسم میں متشابہ و مشترک مگر چکھنے کے بعد ممتاز اس میں ایک خاص لطف ہوتا ہے کہ سمجھے تھے کچھ نکلا کچھ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ دو شخص کسی امیر سے ملنے گئے ناشتہ کا وقت تھا اس نے باورچی سے کہا ناشتہ لاؤ ایک پر تکلف دستر خوان بچھا اور نہایت پتلی چپاتیاں آئیں قورمہ آیا ایک پیالہ میں اور ایک چھوٹی تشتری میں میٹھے چانول وہ اس مقدار قلیل کو دیکھ کر چل گئے اور جلدی جلدی جو کچھ سامنے تھا سب صفاچٹ کر گئے جب کھا چکے تو باورچی نے کہا یہ پیالہ اور تشتری بھی کھا لیجئے وہ یہ سمجھے کہ تمسخر کرتا ہے ناخوش ہوئے اس نے معافی چاہکر پھر کہا توڑا تو نمکین بالائی اور میٹھی بالائی تو صاحبو جب دنیا میں ایسے لطائف و غرائب ہیں تو وہاں کے لطائف کسی سے بیان ہوسکتے ہیں وہاں اسی قسم کے انار ہوں گے کہ جن کو توڑتے ہی اس میں سے حور نمودار ہوگی اور نکل آئے گی۔

جب میں کانپور میں تھا تو ایک شخص شاہ عبداللطیف صاحب کے پاس حاضر ہوا تھا مدرسہ میں آکر کہنے لگا کہ میں ایسا عمل جانتا ہوں کہ ابھی دیوار شق ہو جائے اور اس میں سے ایک عورت نکلے جو غزل اس سے آپ کہیں وہی گا دے گی ہم نے اس کو بہت عجیب سمجھا تھا وہاں رات دن ایسا ہوا کرے گا۔ غرض ساری چیزیں عیش وعشرت کی وہاں موجود ہیں خدا جزائے خیر دے اہل سنت کو کہ کتاب و سنت سے ثابت کر دیا کہ لگا ہوا باغ یہ نہیں کہ لگیگا اس سے جو تسلی ہو سکتی ہے وہ بھی رافع ضیق ہے اسی طرح کے حور و قصور اور میوے وہاں تیار ہوں گے بعض روایات میں تصریح ہے فرماتے ہیں اَلْجَنَّۃُ قِیْعَانٌ وَغِرَاسُھَا الْعَمَلُ الصَّالِحُ (جنت میدان میں اور پودے لگانا اس نیک اعمال کا ہے) اب ایک اور نعمت باقی رہ گئی کہ سب کچھ ہوگا اور اس کے ساتھ سب سے بڑھ کر خلود ہوگا کہ تم لیتے لیتے تھک جاؤ گے مگر ان کی نعمتیں ختم ہی نہ ہوں گی سو تمہارا وطن اصلی یہ ہے اور وہ دن بہت دور بھی نہیں کہ جب قیامت آوے گی تب ملے گا نہیں بلکہ مرتے ہی مل جاوے گا مگر شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ مرنے کا تصور تو منغص ہے تو اس کا تصور یوں کیا کرو کہ ایک کمرہ ہے ہم اس کی چھت کے نیچے ہے اور جنت اس کی چھت پر ہے اور وہ کمرہ آسمان ہے بس یہاں سے وہاں چلے جائیں گے مرنا کیسا رہا یہ خیال کہ وہ بڑی دور ہے وہاں تک رسائی کیسے ہوگی تو اس سے بے فکر رہو سرکاری اور قدرتی ریل گاڑی تم کو دم کے دم میں پہونچا دیگی اب ایک خیال اور ہوگا کہ دنیا میں تو ایسے ہیں جیسا کہ پاخانہ میں اور پھر اس میں آلودہ بھی ہو رہے ہیں تو یہاں سے نکل کر فوراً کیسے جنت میں پہونچ جائیں گے تو سنو کہ وہاں نہر الحیوۃ وحمام ہے جھٹ غسل دے کر حکم ہوگا کہ لے جاؤ باغ میں مگر خدا کے واسطے کہیں باغ والے کا انکار نہ کر دینا اور نہ باغ کی خبر دینے والے کا تو حق تعالیٰ کی یہ نعمتیں ہیں ان کے سوچنے کے بعد کوئی مصیبت نہیں رہتی اور یہ طریقے ہیں حب دنیا گھٹانے کے کہ اس سے دنیا کی بے وقعتی ذہن نشین ہوتی ہے اور آنکھیں کھل جاتی ہیں اور جن کی آنکھیں کھل گئیں وہ یہاں کے مال وجاہ کو بے وقعت سمجھ کر یہ کہتے ہیں ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی　　بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں　　شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ عشق الٰہی میں مٹ جائے زر و مال کے حشمت اور دبدبہ میں قارون سے بہت بڑھ جا محبوب حقیقی کی راہ میں جان کو سیکڑوں خطرات ہیں اس راہ میں قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ مجنون بن جا)

اور کہتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ کردم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزما لیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا)

اور فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاش اور اگر دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب اور اسکی محبت کے متوالے ہیں)

اور حضرت اہل محبت سے یہ بعید نہ سمجھو دیکھئے دنیا میں جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کی طلب میں کتنی ہی ذلت اٹھانی پڑے سب گوارا ہوتی ہے بلکہ جب دیکھتے ہیں کہ اسی کے تصرف سے ہے تو پھر احتمال بھی ناگواری کا نہیں ہوتا اسی کی نسبت کہتے ہیں ؎

از خدا دان خلاف دشمن و دوست

کہ دل ہر دو در تصرف اوست

(خدا کی طرف سے ہر دوست کی مہربانی اور دشمن کی دشمنی کہ دونوں کے دل پر اسی کا تصرف ہے)

بس یہ تو سب مشینیں ہیں جو کہ کسی کے چلاتے سے چلتی ہیں اور بدون اس کی اعانت کے بیکار محض ہیں لیکن جس نے اصل چلانے والے کو نہیں دیکھا وہ سمجھ رہا ہے کہ انھیں سے آٹا پستا ہے مگر اہل معرفت سمجھتے ہیں کہ ان کی رفتار عارضی ہے اصلی نہیں ہے یہ اپنی رفتار میں غیر کے محتاج ہیں ؎

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے　　یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے سما　　ہائے ہوئے در فگندہ در سما

ما چو چنگیم و تو زخمہ میزنی　　زاری از ما نے تو زاری میکنی

ہم بانسری کی طرح دو منہ رکھتے ہیں ایک منہ تو اس کے لبوں میں پوشیدہ ہے

اور ایک منہ نالا ہو کر آسمان میں ہائے ہو ڈلے ہوئے ہوا ے اللہ ہماری مثال چنگ کی سی ہے اور آپ گویا مضراب مار رہے ہیں یعنی ہمارے کے خالق آپ ہی تو ہیں گو ظاہر میں افعال ہم سے زرد ہو رہے ہیں مگر موثر حقیقی واقع میں آپ ہی ہیں تو اس بنا پر اگر ہم زاری کریں تو وہ ہماری طرف سے حقیقۃً نہیں ہے بلکہ گویا آپ اسی فعل کو کر رہے ہیں باعتبار موثر خالق ہونے کے)

اور فرماتے ہیں ؎

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم　　　حملہ شاں از باد باشد دمبدم
حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد　　　آنچہ ناپیدست ہرگز کم مباد

اور فرماتے ہیں ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں　　　یار بیروں فتنۂ او در جہاں

(یعنی ہماری ایسی مثال ہے جیسے پرچم کا شیر ہوتا ہے ہوا چلنے سے حملہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے یعنی ہمارا تصرف تصرف حق کی وجہ سے ہے ان کا حملہ نظر آتا ہے ہوا نظر نہیں آتی آگے بطور دعا کے فرماتے ہیں۔ جو چیز نظر نہیں آتی یعنی مؤثریت حق وہ ہمارے دل سے کبھی کم نہ ہو یار تو جہان سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا۔)

غرض سب کچھ اودھر ہی سے ہے مصیبت اودھر سے دکھ اُدھر سے مگر یاد رکھو کہ محبت پیدا کر لو بس سب مصیبتیں آسان ہیں۔ ؏ از محبت تلخہا شیریں شود ؛ (محبت میں تلخیاں بھی شیریں ہوتی ہیں) ورنہ پھر مصائب کفر کا پھاٹک ہے اور اس محبت پر میں خوشخبری دیتا ہوں کہ جن کو محبت ہے اپنے اللہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے بھی محبوب ہیں یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ (اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست　　　تا بجوشد آبت از بالا و پست
تشنگاں گر آب جویند از جہاں　　　آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پانی مت تلاش کرو پیاس پیدا کرو تاکہ بالا و پست سے پانی موج زن ہو پیاسے اگر پانی تلاش کرتے ہیں تو پانی بھی پیاسوں کو تلاش کرتے ہیں)

تو جب ہم اللہ کو اپنا محبوب بنالیں گے تو اللہ ہمیں اپنا محبوب بنالیگا تو محبت اُدھر سے بھی ہو گی مگر فرق یہ ہے محبوب کا عشق خفی ہوتا ہے اور عاشق کا عشق ظاہر کہ عاشق تمام عالم میں غل مچا دیتا ہے باقی یہ بات کہ یہ کیسے

معلوم ہوگا کہ اللہ کو بھی ہم سے محبت ہے تو اس کی علامت یہ ہے کہ قلب میں باری تعالیٰ ایک تعلق اپنے ساتھ پیدا کر دیتے ہیں جس سے ذکر و طاعت آسان ہو جاتا ہے بس یہی علامت ہے کہ ہم بھی مقبول و محبوب ہیں۔ حضرت حاجی صاحب نے قبول عبادت کی یہ علامت بتلائی ہے کہ جب پھر اسی کے کرنے کی توفیق ہو تو سمجھ لو کہ پہلی عبادت مقبول ہوگئی ورنہ دروازہ پر پھٹکنے ہی کیوں دیتے۔ مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کوئی عابد تھا ایک بار مایوس ہو کر کہ وہاں سے کچھ پتہ ہی نہیں ملتا سو رہا، فرشتہ آیا اور کہا ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　　دیں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(فرمایا وہ تیرا اللہ کہنا ہی ہمارا جواب ہے اور یہ تیرا سوز و نیاز اور درد ہمارا قاصد ہے)

تو یہ درد و شوق ہمارا قاصد ہے اور یہ علامت ہے کہ خدا کو محبت ہے یہ ہے علاج مصائب کا صاحبو۔ بڑے بڑے عقلاء یوں سمجھتے ہیں کہ رو لے سے نفع ہوگا مگر فی الحقیقت جو ہم بتلاتے ہیں اس سے نفع ہوگا اور تسلی اسی سے ہوگی یعنی مشغولی و توجہ بحق یہ ہے تسلی کا سرمایہ بات تو مختصر تھی مگر تمہیدوں میں لمبی ہوگئی مگر یہ طول سب جھالرا درچین تھے اگر یہ نہ ہو تو کپڑا تو ہو یعنی اصل مقصود وہ یہ کہ جب مصیبت آوے خواہ عام جیسے طاعون یا خاص جیسے کوئی مقدمہ پس اگر تم نے یہ طریقہ مشغولی و تعلق بحق اختیار کیا جو میں نے بیان کیا تو وہ مثال بہلول کی مخاطب بزرگ کی صادق آوے گی کہ بہلول نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے کہا کہ ایسے شخص کے مزاج کا کیا پوچھنا کہ تم مخلوق اُس کی خواہش کے موافق چلتی ہو کوئی کام اس کے ارادہ کے خلاف نہ ہوتا ہو بہلول نے شرح پوچھی فرمایا کہ میں نے اپنے ارادہ کو اس کے تابع کر دیا ہے جس کے حکم بدون ایک ذرہ نہیں ہل سکتا تو جب اپنی خواہش کو اس کے ارادہ کے تابع کر دیا تو جو واقعہ اس کے ارادہ کے موافق ہوگا میرے ارادہ کے بھی موافق ہوگا پھر غم کہاں۔ یہ توکل و رضا ہے کہ جو کچھ ہوگا یہی سمجھو گے کہ بہت مناسب بہت بہتر پس لامحالہ وہ حالت ہو جاوے گی جو ان بزرگ کی تھی اور واقعی اگر غور کرو تو بلاؤں میں بھی نعمتیں ہیں جب رضا و اطاعت اختیار کرو گے ان مصائب کے اسرار بھی منکشف ہو جاویں گے

جس سے اور تسلی ہو گی۔
اسی انکشاف کو مولانا فرماتے ہیں۔

بینی اندر خود علوم انبیا
بے کتاب وبے معید واد ستا
(اپنے اندر بے کتاب وبغیر مددگار اور استاد انبیا جیسے علوم دیکھو گے)

منجملہ اسرار بلا کے ایک وہ ہے جو تفسیر مظہری میں ایک حدیث سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالٰے فرماتے ہیں کہ بعضے میرے بندے ایسے ہیں کہ اگر ان کو تندرست و متمول رکھوں تو وہ کفر کرنے لگیں چنانچہ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ (البتہ زمین میں بغاوت کریں) اس حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں۔ وَ ذٰلِكَ بِاَنِّيْ اَعْلَمُ بِعِبَادِيْ (یہ اس لئے کہ میں اپنے بندوں کو خوب جانتا ہوں) بعض کی نسبت ارشاد ہے وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ (اگر میں اپنے بندوں کے لئے روزی میں کشادگی کروں) جیسا حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑا تھا، بظاہر کوئی مصلحت نہ تھی چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا مگر اس میں کتنی بڑی مصلحت نکلی۔ اسی طرح اللہ تعالٰے کا ہر فعل حکمت و مصلحت سے بھرا ہوتا ہے۔ فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ (حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا)

چنانچہ ایک مصلحت یہ ہے کہ اہلِ مصیبت کو وہ درجے ملیں گے کہ اغنیاء یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہمارا بدن قینچیوں سے کاٹا جاتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود بلا مانگو تم تو عافیت ہی مانگو اگر وہ مراتب اور عافیت دونوں دیدیں تو ان کے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیماری سے بچنے کی بھی دعا مانگتے تھے اور عافیت کی بھی تم بھی ہر مراد مانگو مگر ساتھ ہی یہ نیت کرو کہ اگر حاصل ہو گئی تو شکر کی توفیق عطا ہو اور اگر حاصل نہ ہو تو شکایت نہ ہو گی۔ پس ایسا شخص ہمیشہ ہر حال میں

تسلی کے ساتھ رہتا ہے۔ حضرت ایک شخص جھونپڑوں میں محلوں کے خواب دیکھتا ہے گو ظاہر میں وہ خستہ حال ہو مگر حقیقت میں وہ بادشاہ ہوتا ہے فرماتے ہیں ایسا شخص تمام لوگوں کی نظروں میں محبوب ہو جاتا ہے اور گو ظاہر میں اس کے پاس ساز و سامان نہیں ہوتا ہے مگر حقیقت میں ان کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں   کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

اور کہتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم   شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(گدایانِ عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ شاہان بے تخت و تاج ہیں)

پس حاصل علاج کا یہ ہوا کہ نافرمانیاں بالکل چھوڑ دو دعائیں مانگو ہر نتیجہ پر راضی رہو یہ ہے وہ نسخہ جس کو حق تعالٰی نے ذکر فرمایا ہے اس کے استعمال سے یہ گو ضروری نہیں کہ تنگی زائل ہو جاوے مگر مغلوب ضرور ہو جائے گی جس سے وہ کالعدم ہی ہو جاویگی دیکھو کوزہ کی مصری میں جو تنکا ہوتا ہے وہ بھی مصری کے بھاؤ بکتا ہے تو اگر کچھ ضیق رہا بھی تو اس میں بھی لطف ہوگا۔ چنانچہ عارف کو تکلیف میں بھی ایک لطف ملتا ہے اب چونکہ بعضے ایسے لوگ تھے کہ تنگی کے وقت تو عبادت کرتے ہیں لیکن جب تنگی دور ہو جاتی ہے تو چھوڑ دیتے ہیں اس لئے آگے فرماتے ہیں کہ ایسا نہ ہونا چاہیئے بلکہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تم کو موت آجائے) کہ موت آنے تک کرتے رہو۔ بعض جہلاء نے اس کے تعبیر میں کہا کہ یقین آنے تک عبادت کرو پھر چھوڑ دو لیکن خود عقل کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ جب یقین آجائے تو زیادہ کرنا چاہیئے۔ موٹی بات ہے کہ اگر کسی کے سامنے پلاؤ کی رکابی آئے اور اسے یقین نہ آئے کہ پلاؤ ہے اس وقت تک رک رک کر کم کھائے گا، لیکن جب یقین آجائے تو اور دل کھول کر زیادہ کھائے گا مگر یہاں عجیب بات ہے کہ جب یقین آجائے تو چھوڑ دو عجیب بات ہے۔ غرضیکہ یہ مہمل معنی عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے خلاف ہونا تو بہت ظاہر ہے کیونکہ محاورہ عربی میں یقین آنے کے معنی میں تیقن آتا ہے اتیان یقین نہیں آتا تو اگر یہ مراد ہوتی تو یوں فرماتے حتی تیقن غرض یہ معنی بالکل مہمل ہیں اور یہاں یقین کے

معنے موت ہیں تو معنی یہ ہوئے حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْمَوْتُ (یہاں تک کہ ہمکو موت آجائے) اور موت کو یقین اس لئے کہا کہ وہ یقینی ہے۔ سبحان اللہ اس آیت میں دوا و غذا دونوں کو جمع کر دیا جیساکہ میں نے مفصل بیان کیا۔ مگر اس علاج سے علی سبیل الکمال منتفع ہونے کے لئے۔ بزرگوں کی صحبت کی سخت ضرورت ہے۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

گر تو سنگ وخارۂ و مرمر شوی
چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی

(اگر تو پتھر سخت اور سنگ مرمر ہو جب کسی صاحبدل کی صحبت پہونچیگا گوہر ہو جائیگا)

اب حق تعالےٰ سے دعا کیجیے کہ مکمل نسخہ کو برتنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بالخیر تمت

ضروری معروضہ

الحمد للہ تعالیٰ ثم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۱۹۸۴ء کے رسالہ الابقاء پر آپکا زرِ سالانہ ختم ہو گیا۔

۱۔ ڈاک خانہ نے وی پی رجسٹری وغیرہ کا خرچہ دُگنا کر دیا ہے۔ الابقاء بذریعہ وی پی منگانے سے آپکے چار۴ روپے کا نقصان ہے۔ لہٰذا زرِ سالانہ منی آرڈر سے ارسال فرما کر اپنے چار۴ روپے بچالیں اور اپنے چار۴ روپے کا نقصان نہ کریں۔

۲۔ جدید سال ۱۹۸۵ء کے لئے پچیس ۲۵ روپے براہ کرم آج ہی ارسال فرمادیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

۳۔ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک یا دو۲ دو۲ خریدار کا بھی زرِ سالانہ ارسال فرمادیں تو اس خالص دینی، تبلیغی، اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو مل جاوے گا۔

امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ثم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یہ تینوں عرضیں قبول فرمادیں گے۔

جزاکم اللہ تعالیٰ والسلام

طالبِ دُعا محمد عبدالمنان غفرلہٗ مکتبہ تھانوی بندر روڈ ایم۔ اے جناح روڈ کراچی ۱